مری صراحی سے قطرہ قطرہ، نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ
(اقبالؔ)

تسبیحِ روز و شب

(صالحہ عابد حسین کی ڈائری)

مرتبہ
صغرا مہدی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

©جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ ہیں۔

تقسیم کار

صدر دفتر

➢ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 011-26987295

Email: maktabajamiadelhi@gmail.com

شاخیں

➢ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی۔110006 011-23260668

➢ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 022-23774857

➢ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 0571-2706142

➢ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 011-26987295

ISBN: 978-93-82997-06-1

اگست 2013ء تعداد:300 قیمت:-/300روپے

نور پرنٹنگ ایجنسی، سوئیوالان، دریا گنج، نئی دہلی۔۲

انتساب

حکیم سید حسن مہدی میرنؔ و انیس بانو

اور ان کے بچوں

رعنا نقوی، رضا مہدی، نزہت رضوی، اور نگہت مہدی

کے نام

جنھیں صالحہ عابد حسین بہت چاہتی تھیں اور

جو ان سے والہانہ محبت کرتے تھے۔

(صغرا مہدی)

پیش لفظ

صالحہ عابد حسین اردو کی ممتاز ادیب اور بنیادی فکشن رائٹر تھیں۔ ان کی فکشن نگاری کا تعلق پریم چند کی روایت سے ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی صالحہ عابد حسین کے پرنانا تھے۔ ہمدردیِ نسواں، علم وادب کی خدمت، مذہبی روشن خیالی اور سماجی بیداری کی خصوصیات انھوں نے ورثے میں پائی تھیں۔ جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو ہندستان میں عورتوں، خاص طور سے مسلمان عورتوں کی حالت بہت ابتر تھی اور سرسید جیسا مصلح قوم نے بھی عورتوں کی تعلیم اور آزادی کو مردوں سے مؤخر رکھا۔ جبکہ حالی نے اپنے قلم اور اپنے عمل سے عورتوں کی تعلیم کی بھرپور حمایت کی۔ صالحہ عابد حسین (جن کا اصلی نام مصداق فاطمہ تھا) نے مقامی اسکولوں میں تعلیم حاصل کی تھی۔ گھر میں علمی وادبی فضا تھی۔ ان کے بڑے بھائی (جو آگے چل کر ممتاز ادیب اور مشہور ماہرِ تعلیم ہوئے) خواجہ غلام السیدین نے ان کے لکھنے کے شوق کی پذیرائی کی۔ ان کو مطالعہ، خاص طور سے ادب کے مطالعہ پر اکسایا اور اس کے وسائل فراہم کیے۔ رفتہ رفتہ وقت کے ساتھ ہندستانی سماج میں بیداریٔ نسواں کا خیال پیدا ہونے لگا۔ اس کے اثر سے ایک طرف زنانے اسکول کھلنے لگے دوسری طرف عورتوں کے رسالے نکلنے لگے جن میں خواتین نے لکھنا شروع کیا۔ ان رسالوں میں لکھنے والوں کی فہرست

میں ہمشیرہ خواجہ غلام السیدین کا نام بھی نظر آنے لگا۔ کیونکہ اس وقت خواتین کو اپنے نام سے لکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ قدیم انگلستان میں خواتین ڈائریاں لکھتی تھیں۔ وقت کے ساتھ ان ڈائریوں کی اہمیت سمجھی جانے لگی اور وہ تاریخی دستاویز بن گئیں۔ ہندستان میں بھی خواتین نے لکھنا شروع کیا۔ صالحہ عابد حسین کی یہ ڈائری جس کو انھوں نے روزنامچے کا نام دیا ہے، اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ انھوں نے یہ روزنامچہ 1942 سے لکھنا شروع کیا تھا۔ ان کا یہ روزنامچہ بہت اچھی ڈائریوں میں جن کی تعداد بیس پچیس ہے، لکھا گیا۔ کبھی ایک ڈائری کے بچے ہوئے صفحات کو دوسرے سال کی تاریخ ڈال کر بھی روزنامچہ لکھ لیتی تھیں۔ ان کی لکھائی بہت صاف اور لکھنے کا انداز بہت دلچسپ اور رواں دواں ہے۔ یہ روزنامچہ تقریباً پچاس سال پر محیط ہے۔ ان کے شب و روز کا لیکھا جوکھا ہے۔ یہ بیان دلچسپ تو ہے مگر اسی کے ساتھ ہمیں بہت سے سماجی اور تاریخی حالات معلوم ہوتے ہیں۔

اس کا جوں کا توں شائع ہونا ممکن نہیں تھا۔ ایک تو ضخامت کی وجہ سے دوسرے بعض حصے ایسے تھے جن سے آبگینوں کو ٹھیس لگ جانے کا اندیشہ تھا۔ وہ نکالنے پڑے۔ پھر آخر زمانے میں بوجہ ضعیفی ان کی لکھائی پڑھنا مشکل تھا۔ کہیں کہیں ہمیں واقعات کی تکرار تھی۔ اس لیے بار بار ڈائریوں کو پڑھنے کے بعد ان کو ایڈٹ کیا گیا ہے۔ ویسے اس ڈائری میں چٹخارے دار واقعات، چونکا دینے والی باتیں اور رازہائے سربستہ نہیں کے برابر ہیں۔ کیونکہ یہ ان خاتون کی ڈائری ہے جن کے فی اصول بے لچک جنھیں اور زندگی کی اعلا قدریں دل سے عزیز تھیں۔ اس ڈائری میں غم و درد کی کیفیت بھی ہے، مزاح کی چاشنی بھی۔ بدلتے وقت اور طور طریقوں پر طنز بھی ہے۔ زمانے کی ناقدری کی شکایت کے ساتھ قدردانی کا اعتراف بھی ہے۔ سیاسی اتار چڑھاؤ ہے۔ سماجی اور ادبی منظرنامہ ہے۔ جہاں اس ڈائری کے ذریعے اکابرین اور لیڈران قوم سے ملاقات بھی ہوگی

وہیں عام لوگوں کے دکھ درد کے مسائل بھی ملیں گے پھر صالحہ عابد حسین کی باغ و بہار شخصیت کی دلکش جھلکیاں ہیں اوران کی شخصیت کا یہ پہلو بھی کہ سامنے آتا ہے کہ ۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

ان کی شادی ڈاکٹر سید عابد حسین سے ہوئی تھی جو ممتاز ادیب و دانشور اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اہم ستون تھے، جن کا شمار اپنے وقت کے قوم پرست لوگوں میں ہوتا تھا جو گاندھی وادی تھے۔ صالحہ عابد حسین نے ان کو اپنا شریک زندگی بنانا پسند کیا گو کہ وہ ان سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بہت کم تنخواہ پر کام کرتے تھے۔ بہت بڑے خاندان کی کفالت کا بوجھ تھا کہ اس زمانے میں خاندان کا تصور بہت وسیع تھا۔ ان سے شادی کر کے صالحہ عابد حسین نے اپنی سیرت تشکیل کی۔ اپنی دلچسپیوں خاص طور سے لکھنے کے شوق کو پورا کیا جو ان کے شریک زندگی بھی تھے اور رہبر بھی۔ انھوں نے عابد حسین کی زندگی کے مقاصد کو اپنی زندگی کے مقاصد بنالیا ان کے علمی، ادبی اور خاندانی زندگی میں برابر شریک رہیں۔ انھیں اس بات پر فخر تھا کہ ان کے شوہر کا احترام و عزت لوگ بحیثیت عالم، دانشور اور قوم پرست کے طور پر کرتے ہیں۔ انھوں نے ان کے سیاسی، مذہبی اور ادبی نظریات سے استفادہ کیا۔ ان دونوں کی زندگی کی جھلکیاں جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، کشمیر، ممبئی کے پس منظر میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ آزادی سے پہلے کے ہندستان اور آزادی کے بعد کے ہندستان کا احوال تفصیل سے معلوم ہوتا ہے۔

راقم الحروف نے یہ ڈائری دو سال کی محنت سے ایڈٹ کی ہے۔ بہت سا کام بستر بیماری پر کیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں اپنی، اپنے بھائی بہنوں، دوستوں کی اس خواہش کو پورا کرسکی کہ یہ اس سال جو صالحہ عابد حسین کی پیدایش کا سواں سال ہے، اس میں ان کی ڈائری "تسبیح روز وشب"

شائع ہو جائے۔ میں مکتبہ جامعہ کے منیجنگ ڈائرکٹر پروفیسر خالد محمود کی مشکور ہوں کہ انھوں نے اسے مکتبہ جامعہ سے شائع کیا اور محمد محفوظ عالم صاحب کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انھوں نے اس کی اشاعت میں بہت بھاگ دوڑ کی اور گھر بیٹھے اشاعت کے مرحلوں میں مجھے شریک رکھا۔

سب سے زیادہ شکر گزار تو میں برادرم محمد ذکیرالدین کی ہوں کہ جن کی محنت اور اردو زبان وادب کی غیر معمولی استداد کی وجہ سے یہ کتاب شائع ہونے کے لیے پریس جاسکی۔

ٹائٹل پیج میرے بھائی ڈاکٹر سید اقبال مہدی نے بنایا ہے۔

صغرا مہدی

۱۳ر مئی ۲۰۱۳ء
عابد ولا

جامعہ نگر، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

1942

۷؍جنوری ۱۹۴۲ء

لیجیے حضرت بسم اللہ ہی غلط۔ بہت دن سے ارادہ تھا کہ اپنا روزنامچہ لکھا کروں مگر ٹلتا رہا۔ سوچا کہ یکم جنوری ۱۹۴۲ء سے ضرور لکھوں گی مگر ۳۱ دسمبر کو بھائی جان[1] کے اصرار پر علی گڑھ چلی گئی اور بجائے ۴؍جنوری تک وہاں رہنے کے ۶؍جنوری تک رکنا پڑا۔ روز باجی[2] کے ہاں سے ساجد صاحب[3] کے ہاں بھابی جان[4] سے ملنے جانا اور پھر شام کو واپس آنا غرض کہ بڑی بڑی دکھ گئی۔ کیونکہ ماشاء اللہ علی گڑھ کی سڑکیں نورعلیٰ نور ہیں۔ جمعہ کی صبح کو بھائی جان، ذکیہ اور عابد صاحب کے ہمراہ واپس دہلی آئی۔ اسٹیشن سے تانگہ کیا اور سیدھے جامعہ نگر آئے۔ راستے بھر بی ذکیہ[5] کی گریہ وزاری سے یونہی طبیعت مکدّر تھی کہ گھر پہنچتے ہی یہ خوش خبری ملی کہ رات قفل ٹوٹ گیا اور چوری ہوگئی۔ سبحان اللہ! بہت اچھا، نئے سال کا تحفہ ملا۔ سارا گھر الٹ پلٹ پڑا تھا۔ چور بستر اور اٹیچی کیس کسی وجہ سے لے گئے مگر پھر بستر اور اٹیچی کیس کو تو پھینک گئے اور اس میں سے ساڑھے بائیس روپے جو ایک بٹوے میں رکھے تھے نکال لے گئے۔ روپوں سے زیادہ اس بات کا رنج اور فکر ہوئی کہ آج تک ہمارے ہاں چوری نہ ہوئی تھی اور جامعہ نگر میں جو کچھ بھی دقتیں اور پریشانیاں ہوں پر چوری کا کھٹکا تو نہیں ہے۔ آج یہ اطمینان بھی رخصت ہوا۔ سب کا خیال یہ ہے کہ جاننے

---

[1] خواجہ غلام السیدین [2] بڑی بہن مختار فاطمہ [3] ساجد علی خاں مسز سیدین کے بھائی [4] مسز سیدین
[5] سیدین صاحب کی لڑکی ذکیہ ظہیر جو جامعہ میں پڑھنے کے لیے بھیجی گئی ہیں۔

والوں ہی کا کام ہے اور یہاں جو پارٹیاں جواریوں کی ہیں جس میں ہمارا ملازم بھی شامل ہے ان میں سے کسی پارٹی کی یہ حرکت ہے۔ مستری کو بلا کر کہا کہ خوب آپ نے یہ مکان بنوایا جس میں چور اس قدر آسانی سے شیشہ توڑ کر داخل ہوگیا اب مہربانی کر کے اس کا کچھ انتظام کیجیے۔ وعدہ تو کیا ہے مگر اُن کے وعدے بہت کمزور ہوتے ہیں دیکھیے کب پورا ہو، ہو بھی یا نہیں۔ نقصان کے افسوس کے ساتھ اس بات کا بہت شکر بھی ادا کیا کہ خدا نے سارا گھر بچالیا، سب ہی کچھ گھر میں موجود تھا۔ بستر، کپڑے، برتن، جنس وغیرہ۔ اگر وہ یہ سب لے جاتے تو ہزاروں کا نقصان ہوتا۔ کل رات سے ایک بڈھے مزدور ٹھلّو کو نیچے کے کمرے میں سلانے کا انتظام کیا ہے۔ رات کو بڑی بے چین نیند آئی۔ خدا کرے یہ حالت زیادہ دن نہ رہے۔

خیال ہوا کہ اب تک نئے مکان کا مولود نہیں کیا اسی لیے یہ بدشگونی ہوئی۔ بیگم ذاکر نے یہ مشورہ دیا کہ قبل اس کے کہ محرم شروع ہو، چھوٹا سا میلاد کر ہی ڈالو۔ محرم تو شاید کل ہی سے شروع ہوجائے اس لیے گھر ہی گھر کے آدمی اور بیگم ذاکر[۱] ان کی لڑکیوں اور مسز صغیر[۲] کو بلا کر آج دوپہر ایک چھوٹا سا میلاد کر ڈالا چند نظمیں رسالت مآب کی شان میں اور آمنہ کے لال سے ولادت کا تھوڑا سا بیان اور حفیظ کا لکھا ہوا سلام میں نے پڑھا۔ صابرہ[۳] نے حالؔی کی دعا ''اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے'' پڑھی اور تبرک تقسیم کر دیا۔ کم سے کم دل سے وہم تو نکل گیا۔ اب ماشاءاللہ ربیع الاول کے مہینے میں بڑا میلاد کروں گی۔

محرم کا چاند دکھائی دے گیا۔ آج اس عظیم الشان یادگار واقعہ کو ۱۳۶۱ سال ہوگئے۔ اس سال پانی پت محرم کرنے کے لیے بعض مجبوریوں کی وجہ سے نہیں جاسکوں گی اور چھوٹی سی ایک مجلس گھر ہی پر کرنے کا ارادہ ہے۔ آج رات بھی عابد نے انیسؔ کا ایک مرثیہ پڑھا اور ہم نے سنا۔ کل سے تبرک کا انتظام کر کے جامعہ کی عورتوں کو بلا کر مجلس میں شریک کرنے کا ارادہ ہے۔ آہ، آج ہی کی یادگار رات میں میری عزیز اور قابل اور حسین، بے مثل صفات بہن، جوان بہن، شملے

[۱] بیگم ڈاکٹر ذاکر حسین [۲] فیروزہ بیگم پرویز ہاشمی کی والدہ [۳] صابرہ زیدی صالحہ عابد حسین کی بھانجی

میں اچانک کسی شدید درد کی وجہ سے ہمیشہ کو مجھ سے جدا ہو گئی تھیں۔ ہائے وہ قیامت خیز رات جب میں ان کے برابر بیٹھی ان کے حسین چہرے کی زردی، موت کی زردی کو دیکھ رہی تھی اور آنے والے خوفناک حادثے کے بوجھ سے کم عمری بے خبر تھی جب میں پکارتی ''چھوٹی باجی'' تو جواب کی طاقت نہ ہونے کے سبب وہ اپنی آنکھیں جن میں اس وقت بھی محبت اور شفقت لہریں مار رہی تھی، کھول کر مسرت سے مجھے دیکھتی اور پھر بند کر لیتیں۔ اذان کے وقت ان کا چراغ حیات گل ہو گیا اور میں اپنی پیاری بہن سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی۔ آہ تیرہ سال ہو گئے مگر وہ رات اب تک اسی طرح آنکھوں میں پھرتی ہے وہ منحوس رات!![1]

۸ر جنوری ۱۹۴۲ء

آج محرم کی پہلی تاریخ ہے۔ انیس کے مرثیوں کی کتابیں جامعہ کے کتب خانے سے منگوائیں تو پتہ چلا کہ کل ملیں گی۔ سارے دن منتظر رہی کہ ابر کم ہو تو لوگوں کے ہاں مجلس کا بلاوا بھیجوں مگر تمام دن ابر بھی رہا اور بوندا باندی بھی ہوتی رہی۔ شام کو ذاکر صاحب کے ہاں جا کر ان سے مجلس میں آنے کے لیے کہا مسز جمیل اور مسز صغیر بھی وہاں موجود تھیں۔ ان سے بھی کہا۔ رات کو ذاکر صاحب کے گھر والے اور مسز صغیر آ گئیں تو ایک چھوٹی سی مجلس کر لی نو بجے یہ لوگ چلے گئے۔ آج صبح بتولن پکانے والی کو الگ کر دیا۔ مکان بنانے کے سلسلے میں قرض بہت ہو گیا ہے اور جنگ کی مہنگ کے سبب روزمرہ کا خرچ بھی دگنا بلکہ ڈھائی گنا بڑھ گیا ہے اور بتولن کے ساتھ اس کے دو بچوں کا بھی خرچ اٹھانا پڑتا تھا۔ اس لیے اسے الگ کر دیا۔ اب صرف منو اور ایک لڑکا حمید رہیں گے۔ تبرک اور جنس کے لیے منو کو شہر بھیجا تھا۔ تبرک کے لیے جو چیزیں منگائیں وہ اس قدر گراں ملیں کہ حیرت میں رہ گئی۔ خدا جانے اس منحوس جنگ کا کیا انجام ہونا ہے؟

باجی، بھابی اور امن[2] کو خط لکھے امن کو لکھا کہ چوری کے سبب اس مرتبہ محرم میں نہیں آ سکتی

---

[1] سیدہ خاتون [2] احمد فاطمہ مسز اظہر عباس صالحہ عابد حسین کی چھوٹی بھاوج اور کزن

وہ ناراض تو بہت ہوں گی مگر کیا کیا جائے مجبوری ہے۔

صابرہ آج کل خوب پڑھ رہی ہے اور ذکیہ کی ضد بھی کم ہو چلی۔ دس کے قریب ہو گئے، آنکھوں میں نیند آنے لگی اب ختم کرتی ہوں۔

۱۳ محرم الحرام مطابق ۲۰ جنوری ۱۹۴۲ء

پہلے دنوں محرم کے سبب اس قدر مصروفیت رہی کہ روز نامچہ بھی نہ لکھ سکی۔ ایک تو فرصت نہیں ہوتی اور اس سے بھی بڑی وجہ عادت نہ ہونا ہے کہ یاد ہی نہیں رہتا۔ کوشش کروں گی کہ روز لکھا کروں۔

ہمارے ہاں دوسری محرم سے آٹھ محرم تک روز دن میں دو بجے مجلس امام حسین ہوتی رہی۔ ایک مجلس میں نور فاطمہ سندھی نے اپنا مضمون حضرت عون و محمد پر پڑھا باقی سب مجلسوں میں صابرہ ہی پڑھتی رہیں۔ ایک دن صابرہ انیس کا مرثیہ اور میں نثر پڑھتی۔ دوسرے دن میں مرثیہ اور صابرہ نثر۔ میں نے اپنا پچھلے سال کا لکھا ہوا مضمون ''امام حسین'' پڑھا جسے سب نے غور سے سنا متاثر ہوئیں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ خواتین جامعہ[1] اس پابندی سے مجلس میں شرکت کریں گی اس قدر غور، خاموشی اور عقیدت سے سنیں گی۔ مجلس میں سب سے زیادہ متاثر بیگم ذاکر ہوتی ہیں۔

۹ رکو عشرہ کرنے کے لیے میں صابرہ اور ذکیہ کو لے کر قرول باغ ظہیر فاطمہ[2] کے ہاں چلی گئی۔ اس دن دوپہر کی مجلس باجی نابو کے ہاں کی۔ پھر ظہیر کے ہاں مجلس ہوئی جس میں میں نے مرثیہ پڑھا۔ بہت رقت ہوئی رات کو سخت درد سر کی وجہ سے اصغر عباس صاحب کے ہاں مجلس میں نہیں جا سکی۔ بارہ ایک بجے تک باتیں ہوتی رہیں۔ رات کو کچھ دیر سوئے کبھی جاگتے رہے، صبح کو ایک چھوٹی سی مجلس کی، روز عاشورہ کے اعمال کیے پھر تسبیح اور مرثیے پڑھتے رہے۔ شام کو چھ بجے

---

[1] جامعہ میں مصنفہ نے روایتی مجلسوں کے بجائے بغیر ماتم کی نئے طرح کی مجلسیں کیں تاکہ کسی امتیاز کے بغیر سب شریک ہوں۔ [2] صالحہ عابد حسین کی دوست

فاقہ شکنی سے پہلے ایک مجلس ہوئی پھر سب نے با چشم نم فاقہ توڑا، رات کو اصغر عباس صاحب کے ہاں شام غریباں میں شرکت کی۔ اگلے دن دو پہر کو ظہیر کے ہاں مجلس میں پھر میں نے تحت اللفظ مرثیہ پڑھا، چھوٹا سا لیکن نہایت عمدہ مرثیہ، اس میں تاراجی خیام کا ذکر تھا۔

قرول باغ میں مجلسیں سب اچھی ہوئیں لیکن ماتم اور اس وضع کا ماتم کہ بے تحاشا سینہ کوبی مجھے اچھی نہیں لگتی۔ اس موضوع پر میری اور ظہیر کی بہت بحث ہوتی رہی، وہ کہتی کہ تم شیعہ ہو کر ماتم کے کیوں خلاف ہو؟ میرا کہنا یہ تھا کہ حسین کو اس طرح رونا چاہیے جیسے اپنے کسی عزیز کو۔ جب ہم اپنے پیاروں کو اس طرح نہیں روتے تو اس تصنع کو، ماتم حسین میں کیوں جائز رکھیں۔ وہ کہتی تھی اپنے عزیزوں کے غم میں بہت بے قرار ہو کر پیٹا جاتا ہے۔ میں جواب دیتی بے شک لیکن باقاعدہ حلقہ باندھ کر ارادتاً نہیں۔ غرض خوب خوب بحث ہوتی رہی۔

۱۴ رمحرم کو انجمن خواتین جامعہ ملیہ کی طرف سے یادگار حسین کے طور پر ایک جلسہ ہونا طے پایا ہے۔ قرول باغ جانے سے پہلے سب کو مضمون وغیرہ کے موضوع بتا گئی تھی کچھ کتابیں جو پاس تھیں وہ بھی دیں۔ کسی انجمن کا سیکریٹری ہونا بھی (خواہ وہ کیسی ہی چھوٹی انجمن ہو) ایک مصیبت ہے اور پھر وہ بھی عورتوں کی انجمن کا۔ ایک مشکل یہ درپیش ہے کہ ہماری صدر مسز مجیب[1] کئی مہینے کے لیے لکھنؤ چلی گئیں۔ بیگم ذاکر صدارت کے لیے راضی نہیں ہوتیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں۔ شائستہ اختر[2] صاحبہ کو فون کرایا کہ آپ اس جلسے کی صدارت کر دیجیے۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ دوبارہ خط لکھا اور بہت اصرار کیا لیکن کل ان کا جواب آ گیا جس میں انھوں نے اپنے نہ آ سکنے پر اظہار افسوس کر کے معذوری ظاہر کی ہے۔ بیگم سندھی کا اصرار ہے کہ صابرہ کو صدر بنایا جائے۔ صابرہ تیار نہیں ہوتیں، دیکھیے کون بنتا ہے؟

پرسوں شام بھابھی جان علی گڑھ سے آنے والی تھیں کہ رات کو بھائی بان کے ساتھ جموں جائیں گی۔ بھائی جان آٹھ محرم سے پانی پت گئے ہوئے تھے، گیارہ کو اپنے یہاں کی مردانے سوئم

---

[1] آصفہ مجیب [2] شائستہ اکرام اللہ

کی مجلس کر کے رات کو آنے والے تھے۔ عابد صاحب جامعہ نگر سے آکر اسٹیشن سے بھابھی کو مع ان کی بچیوں اور نانی کے مولوی عبدالحق صاحب کے مکان پر آئے ہم لوگ بھی ظلّن صاحب[1] کے ہمراہ وہاں پہنچ گئے۔ شام ہوتے ہی اسٹیشن گئے۔ اسٹیشن کے ریفرشمنٹ روم میں سب کو کھانا کھلایا۔ ساڑھے آٹھ پر بھائی جان بھی آگئے، کھانا کھا کر سب لوگ جا کر ریل میں بیٹھے۔ ان کی گاڑی تو دس بجے جاتی تھی مگر ہمیں جامعہ نگر کی وہ بس پکڑنا تھی جو ساڑھے نو پر جاتی ہے۔ بہت جلدی میں بھائی جان سے ملاقات ہوئی۔ چند باتیں پانی پت کی سنیں روتی ہوئی ذکیہ کو لے کر بھاگ دوڑ میں سب سے رخصت ہوئے اب جو فوارے پہنچتے ہیں تو بس غائب۔ معلوم ہوا کہ حسب عادت بس صاحبہ بگڑ گئی ہیں اور سات بجے سے لوگ انتظار میں بیٹھے ہیں کوئی بس نہیں آئی جب بس کی طرف سے ناامید ہوگئی تو ایک تانگہ لیا۔ ہم چاروں کے علاوہ ایک جامعہ کے بی اے کے طالب علم علیم اللہ بھی ساتھ تھے اور اس کے علاوہ اسباب بھی تھے، ایک بستر، چاولوں کا کنستر، ایک بھاری سا اٹیچی کیس اور پھلوں کی پوٹلی، علیم اللہ کی چھ سات سیر شکر۔ اب جو چلتے ہیں تو معلوم ہوا کہ تانگے کا گھوڑا بالکل اڑیل ہے۔ دلّی دروازے تک تو خیر خاصا آگیا لیکن اس کے آگے سے تو وہ بالکل ہی قدم قدم چلنے لگا، تانگے والے نے کہا اس کا سینہ بند ٹوٹ گیا ہے۔ بھوگل میں بدل لوں گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔ قصہ مختصر ساڑھے نو سے ساڑھے گیارہ بجے اس نے بھوگل تک پہنچایا اور پھر تو ایسا اڑا کہ چلنے کی قسم کھالی بلکہ ڈر یہ تھا کہ گرا نہ دے۔ آشرم تک آکر ہم لوگ مجبوراً اُتر گئے عجب مشکل تھی اتنا اسباب اور چھوٹی سی بچی ساتھ، کیسے ڈھائی تین میل پیدل رات کے بارہ بجے جائیں۔ لیکن آخر کرتے کیا؟ علیم اللہ صاحب نے بستر سر پر رکھا، عابد صاحب نے کنستر اور پھلوں کی ٹوکری لی، صابرہ نے اٹیچی کیس کلیجے سے لگایا اور میں نے شکر کا تھیلا سنبھالا اور چلے وہاں سے دایاں بایاں کرتے۔ چاندنی خوب چٹکی ہوئی تھی، اگر بوجھ نہ ہوتا تو چلنے میں کافی لطف آتا پھر بھی اپنی اس ہیئت اور نئے تجربے پر خوب ہنسی آرہی تھی۔ چند فرلانگ چلے تھے کہ پیچھے سے کئی بیل

[1] عابد صاحب کے کزن محمد احسن

گاڑیاں آگئیں اوران کے ہنکانے والوں نے ہم کو تعجب سے دیکھا اور بہت ہمدردانہ طریقے سے پوچھا: ارے صاحب تم پر کیا مصیبت پڑی جو یوں رات میں اسباب لیے جا رہے ہو؟'' اور پھر نہایت اصرار سے ہمیں اپنے ٹھیلوں پر بٹھالیا کہ جامعہ نگر کے موڑ تک تمھیں چھوڑ دیں گے۔ راستے بھر ٹھیلے والے ہماری ہمدردی کرتے اور تانگے والے کو گالیاں دیتے آئے۔ موڑ پر پہنچ کر ہم اترے، انھیں کچھ انعام دینا چاہا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ ان کی ہمدردی اور انسانیت کا ہم سب کے دل پر خاص اثر ہوا۔ یہ بات غلط نہیں کہ ہماری نئی تہذیب اور تعلیم خود غرضی اور نفس پروری کی تعلیم دے رہی ہے۔ ہمارا جاہل گنوار طبقہ، مذہبی تعلیم یافتہ طبقے سے بہت زیادہ ہمدردی اور خلوص کا جذبہ اور انسانیت کا جوہر رکھتا ہے۔ تھوڑے گھر میل سوا میل سے زائد کے فاصلے پر ہے۔ اب پھر سب نے اپنا بوجھ سنبھالا اور آدھی رات کے سناٹے میں بوجھ میں دبے کسی نہ کسی طرح گھر پہنچے تو ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ یہ سفر بھی یاد رہے گا، مزے دار تھا لیکن اگر صابرہ اور علیم اللہ ساتھ نہ ہوتے تو اکیلے میں ڈر معلوم ہوتا اور اسباب بھی اتنا نہ اٹھا سکتے، اس وقت واقعی مزا آجاتا۔ یہاں جامعہ نگر میں رہ کر آمد و رفت کی کیا کیا دقتیں نہ اٹھائیں اور ابھی دیکھیے اور کیا نہ اٹھانی پڑیں گی۔ اب تک عابد صاحب کے شانے اور میری پیٹھ میں درد ہے۔ صابرہ اور علیم اللہ صاحب پر خدا جانے کیا گزری؟ جوان آدمی ہیں اور اگر درد ورد ہوا بھی ہو تو اس کا اظہار نہیں کرتے۔

کل کا سارا دن بیٹھ کر جلسے کے لیے حضرت عباس پر تقریباً بیس پچیس منٹ کا مضمون لکھا اور رات میں اسے ٹھیک کیا، آج سرفراز میں سے کچھ نظمیں وغیرہ تلاش کیں۔ ایک مضمون اور نظم سعیدہ[1] خانم کو پڑھنے کے لیے دی۔ ایک نظم سعدیہ[2] اور ایک مسز سندھی کو۔ آج شام کو جامعہ کی بلڈنگ میں جا کر سب کے لکھے ہوئے مضمونوں پر ایک نظر ڈالنی ہے۔ صابرہ کو ڈانٹ ڈپٹ کر اور خوشامد سے مضمون لکھنے بٹھایا ہے۔

شام کو سنا کہ ترکی وفد کے لوگ جامعہ دیکھنے آرہے ہیں۔ تین بجے میں بھی گئی۔ وہاں کئی

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین کی بڑی بیٹی [2] جامعہ کے استاد سعد انصاری کی بیٹی

عورتیں جمع تھیں ساڑھے پانچ بج گئے۔ مگر ان لوگوں کا پتہ نہ تھا مجبوراً ہم لوگ واپس آ گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ آئیں گے ہی نہیں بعد میں معلوم ہوا کہ گورنمنٹ نے ان کو منع کر دیا ہے تو رحمان صاحب نے شام چائے ہمارے ہاں پی۔

صابرہ کا مضمون شکر ہے کہ ختم ہوگیا، ہم صاف کریں گے۔ آج سارا دن اسے اسی کام میں گزرا۔

☆☆☆

1943

۷ محرم الحرام مطابق ۲۴ جنوری۔ اتوار

پھر چار دن بعد روز نامچہ لکھ رہی ہوں۔ اس زمانے میں مصروفیت زیادہ رہی اس لیے تھک جاتی تھی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ پھر بیٹھ کر یہ بھی لکھوں۔

۴ محرم کو دن کے دو بجے یادِ حسین کا جلسہ کامیابی سے ہوگیا، شہر سے میری نندیں اور ظہیر اور ان کی نند اور ان کے بچے آئے تھے۔ جامعہ نگر کی بھی سب عورتیں جو ممبر تھیں وہ بھی جو نہیں تھیں وہ بھی آئیں اور کل ملا کر تیس پینتیس عورتوں کا مجمع ہوگیا۔ بچے تو تعداد میں عورتوں سے دُگنے تھے اور کافی شور شرارت کرتے رہے۔ ان بچوں سے بڑا ناک میں دم ہے، مائیں نہ تو انھیں چھوڑ کر آتی ہیں اور نہ قابو میں رکھنا جانتی ہیں، خواجہ عبدالعلی[1] کا بچہ خصوصیت سے بہت شیطان ہے۔

جلسے میں بہ مشکل صدارت کے لیے بیگم ذاکر کو راضی کیا۔ صابرہ کی مددگار کے طور پر پاس بیٹھ کر پروگرام پڑھتی رہی۔ مسز سندھی کا مضمون اچھا تھا۔ میرا بھی لوگوں نے پسند کیا اور صابرہ کا مضمون تو بہت ہی عمدہ تھا اگرچہ اتنی کم پڑھی لکھی عورتوں کے مجمع میں اس کا معیار زیادہ بلند رہا۔ علاوہ وہ نفس مضمون کے اس کا تقریر کرنے کا انداز بہت ہی اچھا اور جوشیلا تھا۔ سب نے بہت تعریف کی۔

نظمیں زیادہ اچھی نہیں پڑھی گئیں۔ سعیدہ اور نور فاطمہ[2] نے خاصی طرح پڑھی۔ ظہیر نے بہت اچھی طرح ترنم سے باقی سب نے بری طرح پڑھیں۔ بحیثیت مجموعی جلسہ بہت کامیاب

---

[1] جامعہ کے استاد [2] مسز سندھی

رہا۔ دو تین عورتوں کے سوا سب نے غور اور عقیدت سے سنا اور متاثر ہوئیں اور یہی سب سے بڑا مقصد تھا۔ سوا دو ڈھائی گھنٹے تک جلسہ ہوتا رہا، جلسہ کے بعد ظہیر وغیرہ کو گھر لا کر چائے وغیرہ پلائی، پھر نہر پر سیر کے لیے گئی اور چھ ساڑھے چھ بجے وہ لوگ روانہ ہو گئیں۔ اگلے دن ۲۲ رتھی۔ صابرہ کا کالج ۲۳ ر کو کھلنا تھا، وہ ۲۲ ر کی دوپہر کو روانہ ہو گئی تاکہ شام کو اپنی دوست سلمہ شان الحق کے ساتھ علی گڑھ چلی جائے۔ مُنّو کو اسے پہنچانے بھیجا۔ ذکیہ اس کے جانے سے بہت ملول ہے مجھے بھی اس کا جانا بہت شاق گزرا اس کی وجہ سے دل ذرا نہ گھبراتا تھا، سارا دن دلچسپ باتوں میں گزر جاتا تھا، کام کے ساتھ بھی باتیں کرتے رہتے تھے۔ اب پندرہ دن آنکھ جھپکاتے گزر گئے، اب اس کی بہت یاد آتی ہے۔

۲۳ ر کو جامعہ نگر میں نواب چھتاری آئے، دو ہفتے سے ان کے استقبال کی شاندار تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اخلاص صدیقی صاحب اسکاؤٹ ماسٹر نے اے آر پی کے کرتب وغیرہ دکھانے کا بھی انتظام کیا تھا۔ نواب چھتاری چونکہ حیدر آباد کے وزیر اعظم ہیں لہٰذا ان کی ذات سے کسی قسم کی دلچسپی اور عقیدت نہ ہونے کے باوجود بھی ان کا استقبال اور دعوت دھوم سے کرنی پڑی کیسے نہ کی جاتی؟ حیدر آباد نے ہمیشہ سب سے زیادہ جامعہ کی مدد کی ہے اور اب بھی بہت کچھ امید اسی سے وابستہ ہے۔ بچوں نے ایڈریس بھی دیا۔ نواب صاحب بالکل مٹی کا مادھو لگ رہے تھے، نہ کسی چندے سے دلچسپی کا اظہار، نہ کچھ اور، باقی تمام مہمان جن کی تعداد تیس چالیس کے قریب تھی سب لوگ شوق اور دلچسپی سے دیکھتے رہے۔ خود نواب صاحب کے صاحبزادے بھی اظہار دلچسپی کرتے رہے۔ نواب صاحب نے تو بچوں کے دلچسپ اور پر اثر ایڈریس کا بھی کچھ جواب نہیں دیا حالانکہ اس نے پہلے ایک مرتبہ حیدری کو بچوں نے ایڈریس دیا تھا تو وہ تو رونے لگے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب بھی آئے تھے رات کو دن کا کھانا ہمارے ہاں تھا۔ ان کے علاوہ ذاکر صاحب، مجیب صاحب اور محمود صاحب[1] کی دعوت بھی تھی۔ شام کو میرن[2] صاحب اور خُلّن

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین کے چھوٹے بھائی محمود حسین [2] حکیم حسن مہدی، عابد صاحب کے چچا زاد بھائی

بھی پہنچ گئے۔ صبح کے آٹھ بجے سے رات کے ساڑھے نو بجے تک مسلسل پکانے اور کام میں صرف ہوا۔ بیچ میں تو سارا وقت گھنٹوں نواب چھتاری کے استقبال دیکھنے کے لیے جامعہ میں کھڑے گزرا۔ خیر شکر ہے دعوت اچھی ہوگئی۔ کھانے سب پسند کیے گئے لیکن رات کو تھکان کے باعث برا حال ہوگیا بلکہ حرارت بھی ہوگئی۔ نیند بہت کم آئی۔ آج صبح بہت دیر تک بستر میں رہی، پھر وہی بیٹھ کر کچھ خط لکھے۔ ایک مضمون میر انیسؔ جو ادیب فاضل کی تیاری کے زمانے میں لکھا تھا، ادیب کے لیے نقل کیا۔ بڑے بڑے بارہ صفحے، ہاتھ دُکھنے لگا۔ شام کو ذاکر صاحب کے یہاں چلی گئی۔ وہ کسی کے چائے کے لیے پتے[1] تل رہی تھیں، میں بیٹھ گئی اور تل دیے۔ انھوں نے نمک پارے اور ایک عجیب سی چیز کھلائی۔ مجیب صاحب آگئے اور وہ مجھے اور سعیدہ کو اپنے باغ کے پھول دکھانے لے گئے۔ وہاں سے واپسی پر کھانا کھایا۔ شفیق صاحب[2] آگئے تھے ان کے لیے کیلے اور بالائی کا میٹھا بنایا۔ آج کا دن برا گزرا۔ سارے دن ابر چھایا رہا۔ سورج نے شکل نہیں دکھائی۔

۲۷ر جنوری مطابق ۲۰ محرم

میں آج کل یوسف صاحب[3] کی نئی تصنیف ''روحِ اقبال'' پڑھ رہی ہوں۔ پونے تین سو صفحے پڑھ چکی ہوں سو اور باقی ہیں۔ کتاب خوب ہے۔ اقبال کا کلام سمجھنے میں اس سے کافی مدد مل سکتی ہے۔ لیکن زبان مشکل۔ دراصل موضوع ہی مشکل ہے۔ اقبال کا فلسفہ سمجھ لیا ہے۔ تین دن سے سورج نے شکل نہیں دکھائی۔ ابر، سردی، کہر بہت بُرا موسم رہا۔ آج شام تیز ہوا چلی تو ذرا بادل ہٹا اور دھوپ کی شکل نظر آئی لیکن شام ہونے کی وجہ سے ذکیہ کو نہلا نہیں سکی۔

کشمیر میں ایک ناول لکھنا شروع کیا۔ ۱۴۰ صفحات لکھ چکی تھی کہ یہاں آنا ہوگیا۔ یہاں آکر گھر کا الٹ پلٹ کرنا، سامان ٹھیک ٹھاک کرنا، ریڈیو کی دو تقریریں، پانی پت اور علی گڑھ کا جانا انجمن کے جلسے غرض اس قدر مصروفیتیں رہیں کہ کاپی کھول کر بھی نہیں دیکھ سکی۔ پرسوں ذرا موقع ملا

---

[1] پالک کے پکوڑے [2] شفیق الرحمٰن قدوائی [3] ڈاکٹر یوسف حسین خاں

تو اسے پڑھنے بیٹھی۔ آگے لگا بہت سا پلاٹ سوچا ہوا تھا وہ سب ذہن سے نکل چکا ہے اور یاد نہیں آتا مہینے بھی تو چار ہو گئے۔ بہت سوچ بچار کے بعد کل اور آج چند صفحے لکھ سکی۔

آج شام دو میل کے قریب چل کر آئے عابد صاحب تو چار پانچ میل ٹہلے آج وہ تھک بھی بہت گئے ہیں۔ بزم اتحاد کے جلسے میں بھی نہیں جا سکے۔

۲۸ رجنوری مطابق ۲۱ رمحرم

رات بڑی خراب گزرتی ہے۔ کئی دن سے خدا جانے کیا ہوگیا ہے کھانا بھی ہضم نہیں ہوتا۔ اندرونی شکایتیں بہت بڑھتی جاتی ہیں۔ حکیم عبداللطیف کا آج دن بھر انتظار رہا۔ ان کا خط کئی دن ہوئے آیا تھا۔ جمعرات کو آؤں گا، مگر نہیں آئے۔ وہ آجاتے کچھ دوا وغیرہ تجویز کر جاتے۔ شاید کچھ آرام ہوتا۔ صبح کو نو سے پہلے پلنگ سے اٹھنا ناممکن ہوگیا ہے۔ ایسی بری جسم کی حالت ہوتی ہے، جوڑ جوڑ میں درد کہ بس میرا ہی دل جانتا ہے۔

آج اختر صاحب[1] کو تصویریں لگانے کے لیے بلایا تھا۔ بچارے دو تین گھنٹے تک یہ کام کرتے رہے۔ کچھ انجمن کے بارے میں ان سے باتیں (پردے سے) ہوتی رہیں۔ شام کو دو گھنٹے تک باغبانی کی۔ آنگن کے آس پاس بانس گاڑ کر، سُتلی باندھی، بیچ کی کیاریوں میں کچھ پودے لگائے، ٹماٹر کو سہارا دیا۔ شام کو دو میل ٹہل بھی آئی۔ آج ''روحِ اقبال'' ختم کرلی۔ تیسرا باب زیادہ مشکل تھا وہ پورا نہیں پڑھ۔ کہیں کہیں سے پڑھ لیا۔

شکر ہے کل بھائی جان[2] اور چھوٹے بھائی جان کے خط آگئے ورنہ جی بہت پریشان تھا۔ دونوں بھائی نزلے میں مبتلا ہیں۔ خدا کرے چھوٹے بھائی جان بمبئی سے آجائیں۔ ان کے بغیر دہلی کاٹے کھاتا ہے، پانچ مہینے ملے ہو گئے، دل تڑپ رہا ہے۔

بھائی جان کی ایک جگہ کوئٹہ میں ڈائرکٹر تعلیمات کی تجویزی ہے۔ سرکاری نوکری، تنخواہ

---

[1] اختر حسن فاروقی جامعہ کے استاد [2] خواجہ اظہر عباس

زیادہ، جگہ صحت افزا مگر اتنی دور! اور خطرہ بھی ہے۔ عابد صاحب نے بھائی جان کو لکھ کر ان کی رائے دریافت کی ہے۔ خدا کرے وہ انکار کردیں۔ مجھے تو امید بھی ہے کہ وہ اسے منظور نہیں کریں گے۔ اگر منظور کرلیا تو علی گڑھ اور تعلیمی سنگھ دونوں سے قطع تعلق کرنا پڑے گا۔

۳۰ جنوری ۱۹۴۳ء

کل خلاف عادت من بھر اناج بنایا۔ آج تک کبھی نہیں بنایا تھا۔ پر مجبوری تھی کیا کرتی۔ کوئی بنانے والا ہی نہیں ملا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے حد تھک گئی اور پانچ بجے سے جو لیٹی تو بدن میں سخت درد اور سر میں بھی شدت کا درد، ناک بند۔ رات بھر بے چین رہی۔ عابد صاحب دہلی یونیورسٹی گئے تھے۔ دس بجے رات کو واپس آئے۔

آج امّن[1]، چھوٹے بھائی جان اور بھابی جان کو خط لکھے، طبیعت بہت سست رہی۔ چکر آتے رہے۔ سعیدہ کو تین دن سے بخار آرہا ہے۔ خدا رحم کرے جوان لڑکی کو بار بار بخار آنا ٹھیک نہیں۔

☆☆☆

[1] بیگم اظہر عباس مصنفہ کی چھوٹی بھاوج

1944

جنوری

عجیب تماشا ہے ہر سال پکا ارادہ کرتی ہوں کہ با قاعدہ روزنامچہ لکھا کروں گی کبھی پورا نہیں ہوتا۔ پچھلے سال کسی قدر شوق اور مستعدی سے ۳۰ رجنوری تک روزنامچہ لکھتی رہی۔ آگے خیر صلاً۔ دراصل پابندی کی عادت نہ ہونا اس کی پہلی اور اصلی وجہ ہے۔ اس مرتبہ یہ سوچا ہے کہ روزانہ نہ سہی ہفتہ وار یا یہ بھی نہ ہو سکا تو کم سے کم ہر مہینے کے خاص خاص واقعات ضرور لکھا کروں گی۔ خدا کرے یہ ارادہ شرمندہ تکمیل ہو جائے۔

یہ سال محرم کی چار تاریخ سے پانی پت میں شروع ہوا۔ دس محرم تک پانی پت رہی۔ تیرہ کو واپس جامعہ نگر آ گئی تھی۔ ۱۲ رمحرم کو رامپور سے بھابی قدسیہ[1] بھائی جان کے پڑھنے کے اشتیاق میں پانی پت پہنچیں، مگر مجلس ایک دن پہلے ہی ہو چکی تھی۔ بیچاری مایوس ہو کر اسی دن واپس چلی گئیں۔ مجھے محرم میں، مجلسوں میں وہی پرانا طریقہ رائج دیکھ کر خصوصاً عورتوں کی قدامت پرستی اور توہم پسندی سے بہت کوفت ہوتی ہے۔ علم نکالنا، ماتم کرنا، پیٹ پیٹ کر گریہ و بکا اور پھر گنڈے، چوڑیاں، چھلّے، پنگوڑے اور نہ جانے کیا کیا چیزیں بچوں کو پہنانا، سقہ بنانا اور طرح طرح کی مٹھائیوں پر نیاز دے دے کر خود کھالینا۔ یہ سب خواہ انتہائی مذہبی عقیدت اور خلوص سے کیا جائے مگر زیادہ تر اس میں رسم پرستی اور خودنمائی جلوہ گر ہوتی ہے۔ کاش ہماری عورتیں اب محرم کی اہمیت

---

[1] مسز بشیر حسین زیدی

اور امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے اصل مقصد کو سمجھنے کی کوشش کریں اور مجلسوں کا طرز بدل دیں۔ اس میں بجائے شروع سے آخر تک رونے پیٹنے کے اس قسم کے مضامین اور نظمیں پڑھی جائیں اور تقریریں کی جائیں جن سے اخلاقی سبق حاصل ہو۔ واقعہ کربلا کے اصلی حالات اور شہدائے کربلا کی سیرت اور مقصد پر روشنی پڑے اور اس کی مثال سے خود ہم میں جذبۂ عمل کے پہلو اور حق کے لئے ایثار اور قربانی کرنے کی اسپرٹ پیدا ہو۔ میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ کم سے کم پانی پت میں روزانہ ایک مجلس محرم میں ایسی ہو جایا کرے جس میں بجائے محض رونے پیٹنے کے مندرجہ بالا باتیں بیان کی جائیں۔ اس مرتبہ میں نے ممن صابرہ، باجی وغیرہ سے اس کا ذکر کیا۔ تجویز سب نے پسند کی مگر اسے عمل میں لانا سب کو دشوار معلوم ہوتا ہے۔

تین سال سے جامعہ نگر میں ماہ محرم کے وسط میں انجمن خواتین کی طرف سے یادگار حسینی کا ایک جلسہ کیا کرتی ہوں۔ چنانچہ اس سال بھی ۲۰ جنوری کو یہ جلسہ ہوا اور امید سے زیادہ کامیاب رہا۔ پچاس سے زائد خواتین جمع ہو گئیں۔ میرا ایک مضمون امام حسین جو اسی مہینے ''آج کل'' میں چھپا تھا وہ میں نے جلسے میں پڑھا۔ سب خواتین بہت متاثر معلوم ہوتی تھیں۔ مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ رامپور میں مولوی ابن حسن صاحب جارچوی نے میرے مضامین ''امام حسین اور زینب خاتون'' جو ''آج کل'' اور ''سرفراز'' میں شائع ہوئے ہیں، تعریف کی۔ مولوی ابن حسن کی میرے دل میں بڑی عزت اور قدر رہے اور ان کی تعریف سے مجھے سچی خوشی ہوئی۔

اس مہینے چار نئی کتابیں پڑھیں۔ کمپنی کی حکومت، لہریں، جہاں آرا اور ناتن۔

''کمپنی کی حکومت'' تاریخ کی کتاب ہے جسے اشتراکی ادیب باری نے بہت تحقیق اور محنت سے لکھا ہے اور اس میں کمپنی حکومت کے صد سالہ دور کے واقعات، مظالم، چالاکیاں اور بے ایمانیاں غرض ان کی حرکتوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ضمناً اس زمانے کے سب فرمارواؤں کا ذکر بھی مختصراً آ گیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر پوری طرح اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری موجودہ تاریخیں جو حکومت کی پٹھوؤں کی لکھی ہوئی ہیں کس قدر غلط ہیں اور اس میں کس بے ایمانی سے سیاہ کو سفید

اور سفید کو سیاہ کر کے دکھایا ہے۔

''لہریں'' ڈاکٹر شفیق الرحمٰن کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ بے چارے کو رومانی افسانے لکھتے لکھتے نیم مزاحیہ مضامین لکھنے کا شوق پیدا ہوا مگر غریب اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ صرف دو ایک مضمون غنیمت ہیں باقی سب فضولیات ہے۔

''جہاں آرا'' فضل حق قریشی نے شہزادی جہاں آرا شاہجہاں کی چہیتی بیٹی کی زندگی کو ایک افسانہ بنا کر پیش کیا ہے۔ کتاب کئی سو صفحے کی ہے۔ جہاں آرا کی زندگی کے اصلی اور سچے حالات میں مفروضہ عشق و محبت کی چاشنی دے کر زیب داستاں کا حق ادا کیا ہے۔ ویسے کتاب دلچسپ ہے اور بقول مصنف کے اگر یہ سب واقعات پیش نہیں آئے تو آنے چاہئیں تھے۔

''ناتن'' جرمن مصنف لینگ کی مشہور تصنیف ہے جس کا ترجمہ محمد نعیم الرحمٰن صاحب نے کیا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے سلطان صلاح الدین کے زمانے کے حالات لکھے ہیں جس میں ایک اعلیٰ اخلاق کے یہودی ناتن (جو نہایت سخی اور دانشمند ہے) اور اس کی لے پالک بیٹی کا قصہ ہے۔ کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ یہودیت، عیسائیت اور اسلام سب مذاہب کی روح اور اصل مقصد کو دکھایا جائے اور یہ بتایا جائے کہ مذہب کے لوگوں میں اچھے آدمی ہوتے ہیں اور آپس میں تعصب رکھنا اور دوسرے کے مذہب کو برا سمجھنا صرف برا ہے بلکہ حماقت ہے کیونکہ اصل سب کی ایک ہے۔

۲۹ رکو جامعہ کی لائبریری سے رسالہ جامعہ کے پرانے فائل منگوائے ہیں تاکہ عابد صاحب کے مضامین افسانے اور نظمیں وغیرہ جمع کروں۔ ارادہ ہے کہ یہ سب رسالہ جمع ہو جائے تو پھر انھیں ترتیب دے کر ''مضامینِ عابد'' چھپوائے جائیں۔ خدا کرے یہ کام پورا ہو جائے۔ میرے اکثر کام نہایت نیک ارادے سے شروع ہوتے ہیں کہ ضرور تکمیل تک پہنچیں گے مگر کسی نہ کسی وجہ سے ناتمام رہ جاتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ یہ کام ان میں سے ہو۔

میرا ناول ''عذرا'' جو تقریباً پونے دو سال پہلے شروع کیا تھا اب تک ناتمام ہے۔ یہاں تو

لکھنے کا موقع بہت کم ملتا ہے۔ صرف کشمیر جا کر کچھ لکھا جاتا ہے۔ اب تک اس کے سولہ باب لکھے جا چکے ہیں اور آج کل میں سترھواں بھی پورا ہو جائے گا۔ باقی ابواب کا خاکہ بنا لیا ہے۔ اگر پابندی سے لکھتی رہی تو زیادہ سے زیادہ اپریل یا مئی میں ختم ہو جانا چاہیے۔ لیکن خدا جانے کیا رکاوٹیں آپڑیں اور پھر ارادہ نہ پورا ہو سکے۔

۱۹۴۳ء میں میں نے اپنی دو کتابیں مرتب کیں۔ ایک ریڈیو کی منتخب تقریروں کا مجموعہ ''بات چیت'' کا مقدمہ لکھنے کے لیے مجیب صاحب کے ہاں مہینے دو مہینے سے پڑا ہوا ہے۔ دیکھیے کب لکھ کر دیتے ہیں۔ افسانہ پر آل احمد سرور سے مقدمہ لکھانا چاہتی ہوں مگر ابھی تک انھیں دیا نہیں۔ ابھی دو بلکہ تین افسانوں کے نام بھی نہیں رکھے مجھ میں یہ بڑا عیب ہے کہ قصہ لکھ لیتی ہوں اور اس کا نام نہیں رکھ سکتی۔

ارادہ تھا کہ یہ دونوں کتابیں اپنی طرف سے چھپواؤں مگر معلوم ہوا کہ انفرادی طور پر کتاب چھپوانے کے لیے کاغذ نہیں ملتا۔ مکتبہ جامعہ یا کسی اور ادبی ادارے کو شائع کرنے کے لیے دینا پڑے گا۔ مکتبہ پر آج کل ایک مقدمہ چل رہا ہے۔ اس کا کل کاغذ ضبط ہو گیا ہے۔ اگر مقدمہ کا نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا تو ڈر ہے کہ کاغذ ضبط نہ ہو جائے۔ پھر تو کتابیں چھپوانے کا خیال شاید ترک ہی کرنا پڑے۔

کتنے دن ہو گئے کپڑے سینے کو جمع ہو جاتے ہیں اور سلائی کا موقع نہیں ملتا۔ ۲۸ر جنوری سے سلائی شروع کی ہے روز تین گھنٹے کرتی ہوں۔ اگر اسی طرح ہوتی رہے تو مہینے بھر میں سب سلائی ختم ہو جائے گی۔ گرمی آ گئی تو اس میں سینا بہت مشکل ہے۔

اس سال سارے دسمبر اور وسط جنوری تک بارش نہیں ہوئی۔ لیکن جنوری کے وسط میں خاصی بارش ہوگئی اور اب چند دن سے سردی خوب چمک گئی ہے۔ آج بسنت ہے مگر صبح کو سخت کہرا اور شدید سردی تھی لیکن دن کی دھوپ نے جسم میں گرمائی پیدا کر دی۔

۹رفروری

یہ ہفتہ کافی مصروفیت کا گزرا۔ آج کل سلائی کر رہی ہوں۔ مگر ایک کپڑے زیادہ کا اوسط نہیں پڑتا۔ ۱۴رفروری کو ریڈیو کی تقریر ہے عنوان ہے ''میل جول'' تعلیمی پروگرام میں ہوگی۔ پرسوں اسے مکمل کر کے بھیجا ہے۔ نہ نہ کر کے بھی پانچ چھ دن لکھنے اور صاف کرنے میں لگ ہی جاتے ہیں۔

سلویہ کے ہاں سے شام کو شہر آئے۔ چند متفرق چیزیں خریدیں پھر دہلی کلاتھ مل کی دکان سے عابد صاحب کے لیے کچھ کپڑا خریدا۔ چھے بجے کی بس سے واپس جانا چاہتے تھے مگر دکان سے نکلے تو وہیں چھے بج گئے تھے اور کم سے کم تین فرلانگ کا فاصلہ، بیچ بازار میں سے ہو کر جانا۔ بس اللہ توکل روانہ ہوئے۔ دونوں کے پاس مختلف قسم کی چیزیں تھیں اور اس پر دوڑنا، کچھ نہ پوچھیے مزا آ گیا۔ آگے عابد صاحب اپنے لیے راستہ بناتے دوڑ رہے تھے اور ساتھ ساتھ میں جس طرف سے موقع ملتا راستہ ڈھونڈ کر دوڑنے لگتی تھی۔ جس وقت عین فوارے کے سامنے پہنچے لیکن بس سے پچاس قدم دور تھے کہ بس روانہ ہونے لگی اور ساتھ ہی میرے دونوں سینڈل بھی دوڑنے کی وجہ سے (جو پرانے تھے) ٹوٹ گئے۔ وہ تو میرن صاحب ہمارے انتظار میں کھڑے تھے۔ انھوں نے لپک کر بس رکوائی۔ جامعہ کے بہت سے لوگ بس میں موجود تھے۔ ہمیں دیکھ کر زبردستی انھوں نے بس والے کو روکا۔ غرض ہم دونوں دوڑتے ہوئے بس پر چڑھ گئے اور بس چل پڑی لوگوں نے ہمیں بینچ خالی کر دی اور جس وقت میں بینچ پر بیٹھی ہوں تو سانس قابو میں نہیں تھا۔ میرن صاحب بیچارے کو تو بہت شرمندگی ہوئی کہ ان کی بھاوج ہاتھ میں سامان لیے بس کے سامنے (برقعہ اوڑھے) یوں دوڑتی آ رہی تھی۔ ممکن ہے جامعہ کے اور پرانے خیالات کے حضرات کو بھی برا معلوم ہوا ہو۔ مگر عابد صاحب کہنے لگے مجھے تو خوشی بلکہ فخر ہو رہا تھا کہ میری بیوی میرے ساتھ موقع پڑے تو دوڑ بھی سکتی ہے۔

ان کے اس جملے نے میرے دل پر کسی قدر اثر کیا۔ کوشش تو میری ہمیشہ سے یہ ہی رہی ہے کہ عابد صاحب کو بار نہ معلوم ہوں۔ میرے نزدیک اصلی رفیق حیات وہی میاں بیوی ہو سکتے ہیں جو ایک دوسرے کے ہر کام میں شریک ہوں یا موقع پڑنے پر شرکت کر سکیں۔ یوں بھی میرا خیال یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کو برقع تو ضرور اوڑھنا چاہیے (کیونکہ برقعہ اتارنے کے بعد حیا کا اور بھی پردہ پوش لباس کا بھی اتنا خیال رہنا محال ہے جتنے کا حکم اسلام میں ہے)۔ لیکن برقع اوڑھ کر وہ ہر قسم کے کام کریں۔ باہر آنا جانا، ریل کا سفر، خرید و فروخت، جلسوں وغیرہ میں شرکت غرض جتنے کام بھی وہ منہ کھولے بغیر کر سکتی ہیں، کریں۔ ہمت اور حوصلہ اور کام کے لیے برقعہ یا بغیر برقعہ کی شرط نہیں یہ تو کرنے والے پر منحصر ہے۔

خیر کم سے کم مجھے اس طرح برقعہ میں سب جگہ آنے جانے اور تھوڑا بہت کام کرتے دیکھنے کا اثر جامعہ کی دوسری عورتوں پر بھی پڑا ہے۔ ان کے مرد بھی اب اتنا برا نہیں سمجھتے تھے۔ آج ''اعمال نامہ'' ختم کردی۔ یہ سر رضا علی کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ بڑی سائز کی کتاب ہے اور سوا پانچ سو صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے اور لطف یہ کہ نامکمل ہے۔ ابھی ایک جلد اور چھپے گی۔ کتاب بہ حیثیت مجموعی بہت اچھی ہے۔ اول تو اردو بہت اچھی لکھتے ہیں۔ زبان اور بیان دونوں دلکش۔ یہ ضرور ہے کہ طول نویسی کا شوق بہت زیادہ ہے۔ اپنے حالات نسبتاً بہت کم ہیں اور دوسرے لوگوں کے بہت زیادہ ہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے متعلق، مسلم لیگ، کانگریس انگریزی حکومت، مختلف سیاسی تحریکیں اور سیاسی حالات، متعدد دوستوں، بزرگوں، عزیزوں، جاننے والوں اور مخالفوں کے معاملات کتاب میں دیے گئے ہیں۔ کئی تصویریں اور عکسی خط بھی ہیں۔

۱۷ر فروری

کل سے نزلہ کا زور اور حرارت ہے۔ گلے میں بھی سخت درد ہے۔ آج کل سارے جامعہ نگر میں کھسرا کا زور ہے۔ ڈر لگتا ہے کہیں میں بھی اس کا شکار نہ ہو جاؤں۔ آج صبح سے آرام لینے کی

کوشش کر رہی ہوں مگر گھر کے کام کی وجہ سے اور لیٹنے کی عادت نہ ہونے کے سبب بھی دن میں بیکار لیٹا نہیں جاتا۔ ہاں اگر کوئی دلچسپ کتاب ہو تو بے شک لیٹ کر اس کے مطالعہ میں غرق ہوسکتی ہوں۔

مولانا آزاد پر کتاب پڑھی۔ مولانا آزاد کو پڑھ کر ان کی اور قابلیت وغیرہ کا اچھا خاصا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ کتاب مسلسل اور مربوط ہوتی تو زیادہ واضح طریقے سے مولانا کی زندگی اور کارناموں پر روشنی پڑتی مگر بہر حال یہ بھی غنیمت ہے اور بہت کچھ ان کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں۔ مولانا کی شخصیت اور ادبی سیاسی شہرت سے تو عرصے سے واقف ہوں مگر یہ پڑھ کر از حد تعجب ہوا کہ دس بارہ سال کی عمر میں انھوں نے عربی، فارسی کی تعلیم کی تکمیل کر لی تھی اور چودہ سال کی عمر میں وہ ایک اعلیٰ معیار کے ادبی رسالے کے ایڈیٹر تھے۔

میں نے تو صرف مولانا کا ترجمان القرآن پڑھا ہے اور اس سے اس قدر متاثر ہوں کہ کہہ نہیں سکتی۔ قرآن شریف کے ترجمے تو اکثر پڑھے اور دیکھے ہیں مگر بہت ہی قابلیت اور سہولیت سے اس میں سب باتیں واضح طریقے اور دلنشیں انداز سے بیان کی گئی ہیں۔ میں بہت پابندی سے روز ترجمان القرآن کے آٹھ دس صفحے مع ترجمے اور تفسیر پڑھ رہی ہوں۔ آج کل سورہ یوسف زیر مطالعہ ہے اور تفسیر پڑھ رہی ہوں۔ دوسرے کتاب ''گیٹسن'' پڑھی، اس میں سوشلزم مشہور اور معروف گیٹسن کی زندگی اور سیرت کے کاموں پر مختصر روشنی ڈالی گئی۔

تین چار دن سے صحن کی کیاریوں میں دو گھنٹے روز کام کرتی ہوں۔ بے کار لگی ہوئی چیزیں اکھاڑیں، نئے بیج بوئے اور وغیرہ میں نرائی کی، باہر نیبوؤں کے گرد کانٹے لگوا رہی ہوں کہ وہ محلے کی منحوس بکریوں سے کسی طرح بچ جائے۔ کاش یہ جنگ نہ ہوتی اور میں اپنی زمین کے چاروں طرف دیوار بنوا سکتی اور ایک اچھا سا مالی رکھ کر باغ بنوانے کی کوشش کرتی۔ برسوں سے مجھے اس کی تمنا ہے۔ اب گھر اور زمین خدا کی عنایت ہے۔ موجود ہے تو روپیہ نہ ہونے اور جنگ کی گرانی اور اینٹوں کی نایابی نے اس خواہش کو پورا نہ ہونے دیا۔ اندر چند گز زمین میں زیادہ سے زیادہ

پھول اور ترکاریاں بوکر دل کو یہ دھوکا دے لیتی ہوں کہ میں باغبانی کر رہی ہوں۔ انسان خود کو بھی فریب دینے سے نہیں چوکتا۔

ریڈیو پر جو تقریر کرنے گئی تھی وہاں تقی زیدی کی بیوی سے ملی وہ ریڈیو میں فارسی پروگرام کی اناؤنسر ہیں۔ اچھی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔

مسز جمیل[1] نے اس مرتبہ میری تقریر کی بہت تعریف کی۔ میں نے کہا آج آپ نے پہلی مرتبہ تعریف کی ہے۔ انھیں یقین نہیں آیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ ہمیشہ اناؤنس کرتی تھیں اور اس مفت کام کی وجہ سے تقریر کی طرف دھیان نہیں دے سکیں۔ اس دن انھوں نے کہیں باہر پوری تقریر سنی تھی۔ حالانکہ تقریر خشک سی تھی تعلیمی پروگرام میں اور میل جول جیسے موضوع پر۔ خیر لوگوں کو خاصی پسند آئی۔

یکم مارچ

فروری میں دو کتابیں فلسفہ آلِ محمدؐ (حصہ دوم) اور مقدمہ فلسفہ آلِ محمدؐ اور پڑھیں دونوں مولانا ابنِ حسن جارچوی کی لکھی ہوئی ہیں۔ فلسفہ آل محمدؐ زیادہ پسند نہیں آئی مناظرے کا رنگ غالب ہے۔ زبان اور بیان بھی پختہ اور منجھا ہوا نہیں لیکن مقدمہ فلسفہ آلِ محمدؐ بہت اچھی کتاب ہے۔ اول تو طرز اور زبان دونوں میں پہلے سے اچھے ہو گئے ہیں۔ دوسرے مناظرے کا رنگ بہت ہی کم ہے۔ شروع میں اصولِ دین۔ توحید عدل، نبوت، امامت اور قیامت کو بہت سلجھے ہوئے طریقے سے سمجھایا ہے اور بتایا ہے کہ اسلام کی اصل روُح کیا ہے اور اس کو پوری طرح سمجھنے اور اس پر عمل کرنے والے اہلِ بیت اطہار اور بارہ امام علیہ السلام ہی ہیں۔ اس میں جناب علی مرتضیٰ کا ایک خطبہ یا فرمان (جو انھوں نے مالک بن اشتر کو مصر کا گورنر بنانے کے وقت دیا تھا) بھی ہے اور اس کا نہایت سلیس اور بامحاورہ ترجمہ بھی ہے۔ واقعی ایسا بے مثل ایسا عمدہ ایسا جامع

[1] اس وقت عورتوں کی پروگرام کی انچارج

خطبہ ہے کہ اگر صرف اس خطبے کے بتائے ہوئے اصولوں پر دنیا چلے تو دنیا سے ظلم وستم اور سرمایہ داری، شہنشاہیت اور بربریت کا خاتمہ ہو جائے اور جنگ کی یہ آگ ہمیشہ کے لیے بجھ جائے۔ کاش صرف مسلمان ہی اس عظیم الشان انسان کی سیرت کو سمجھنے، اس کا مطالعہ کرنے اور حضرت علی کی سیاست اور طریقۂ عمل پر چلنے کی کوشش کرتے۔

فروری میں مندرجہ ذیل نئی کتابیں پڑھیں:

(۱) اعمال نامہ، (۲) ابوالکلام آزاد، (۳) لینن، (۴) پیکار، (۵) نیا ادب، (۶) فلسفہ آلِ محمدؐ، (۷) مقدمہ فلسفہ آلِ محمدؐ۔

لکھنا بہت کم ہوا ہے صرف ریڈیو کی ایک تقریر شروع مہینے میں لکھی تھی۔ آخر مہینے میں جنابِ رسولِ خدا پر اپنا پچھلے سال کا لکھا ہوا مضمون ''بعثتِ رسول'' ٹھیک کر کے '' آج کل'' میں شائع ہونے کے لئے بھیجا ہے۔ ایک مضمون '' ان مِٹ نقش''، جنھیں آپ بیتی کا ایک ٹکڑا سمجھنا چاہیے کشمیر میں لکھا تھا، اسے ٹھیک کر کے اور افسانے کی صورت میں کر دیا ہے۔ ارادہ ہے کہ افسانوں کے مجموعہ میں اسے بھی شامل کرلوں۔

جامعہ میں زور و شور سے ۱۲؍ربیع الاول کی تیاریاں ہو رہی ہیں مگر ہم اس وقت بھوپال ہوں گے۔ افسوس ہے کہ شرکت نہیں ہو سکے گی۔ خود عورتوں کے ہاں میلاد النبی کی ابھی کوئی تیاری اور ذکر وفکر نہیں۔ مجھے تو شبہ ہے شاید ہی ہو سکے۔

رات گیارہ بج گئے۔ نیچے سب لوگ سو گئے۔ عابد صاحب اب تک دعوت سے واپس نہیں آئے۔ آج جامعہ میں مجلس منتظمہ کا کوئی اہم جلسہ اور پھر دعوت تھی اب جا کر سونا چاہیے۔

۱۵؍مارچ

آج پندرہ دن بعد روزنامچہ لکھنے بیٹھی ہوں۔ اس عرصہ میں عجیب عجیب واقعات پیش آئے اور بہت کام رہا جس کے سبب لکھنا نہ ہو سکا۔ ۱۴؍ تک تو مہمان رہے پھر جس دن وہ واپس گئے اسی

دن ہم لوگ بھوپال روانہ ہو گئے۔ اس دفعہ کا بھوپال کا سفر بھی یادگار رہے گا۔ اس کا حال ذرا تفصیل سے لکھوں گی۔ ہم لوگ ایک بجے یہاں سے روانہ ہوئے۔ پلیٹ فارم پر ڈھائی تین گھنٹے انتظار کرنے کے بعد گاڑی آئی تو اس میں انٹر کا درجہ ندارد۔ آدھ گھنٹے بعد انٹر آ کر لگا تو بڑی مشکل سے اس میں بیٹھنے کی جگہ ملی۔ پہلے بالکل دروازے کے پاس بیٹھے تھے۔ پھر دو ایک آدمی سے کہہ سُن کر بیچ کی سیٹ پر تھوڑی سی جگہ مل گئی لیکن دروازوں کے قریب اس قدر ہجوم تھا اور ہر اسٹیشن پر اتنے لوگ اترتے چڑھتے تھے کہ خدا کی پناہ۔ غسل خانہ جانا تو بالکل ناممکن تھا۔ تقریباً رات بھر جاگتے ہوئے صبح سات بجے بھوپال کے اسٹیشن پر گاڑی پہنچی۔ اسٹیشن پر ننھے چچا[۱] موجود نہیں تھے۔ معلوم ہوا کہ گاڑی لیٹ تھی، آ کر چلے گئے۔ حیات صاحب کی کار موجود تھی اس میں بیٹھ کر ننھے چچا کے ہاں پہنچے، وہ انتظار کر رہے تھے۔ عابد تو حیات صاحب سے ملنے چلے گئے۔ میں نے ننھے چچا کے ساتھ ناشتہ کیا۔ اتنے میں منصور آ گئے، ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ عابد صاحب واپس آئے تو طے پایا کہ چند منٹ کو شعیب صاحب کے ہاں جا کر وہ ان سے اور میں بیگم محمد علی سے مل لوں۔ پھر ساڑھے گیارہ بجے باڑی روانہ ہوں گے۔ شعیب صاحب کو فون کر کے کار منگوائی اور ان کے ہاں پہنچی۔ بیگم محمد علی اور بیگم شعیب سے ملاقات ہوئی۔ بیگم شعیب تو اپنے بچے کی سالگرہ کے اہتمام میں مصروف تھیں۔ بیگم صاحب محبت سے ملیں اور باتیں کرتی رہیں۔ بیس پچیس منٹ بعد واپس گھر آئے۔ جلدی جلدی کھانا کھایا اور ننھے چچا کو بھی اصرار کر کے باڑی[۲] جانے پر راضی کر لیا۔ پونے بارہ پر بس اسٹیشن پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ گاڑی جا چکی ہے اور دوسری جو ڈاک لے جاتی ہے جانے والی ہے۔ بڑی مشکل سے اس کے ٹکٹ مل سکے۔ جب گاڑی آئی تو فرنٹ سیٹ پر ہم تینوں اور ایک صاحب بیٹھے مگر سبحان اللہ کیا گاڑی تھی کول گیس سے تو چلتی ہے اور اس قدر چھوٹی بنائی گئی ہے کہ سیٹ مشکل سے ایک بالشت چوڑی ہوگی اور سامنے پاؤں رکھنے کی جگہ اس قدر تنگ ہے۔ خیر تو بارہ بجے روانہ ہوئے۔ باڑی بھوپال سے ساٹھ میل کے فاصلے پر ندی کے

---

[۱] سید حسین اصغر عابد صاحب کے چچا [۲] بھوپال کے قریب قصبہ ہے

کنارے ایک قصبہ ہے جو تحمیل بھی ہے۔ بس چکر کھا کر ستر میل کر لیتی ہے۔ خیال تھا کہ ساڑھے چار پانچ تک باڑی پہنچ جائیں گے۔ بیس پچیس میل گاڑی خاصی تیز رفتاری سے آئی ایک مقام پر اتار تھا۔ گاڑی تیزی سے جا رہی تھی کہ بڑے زور سے آواز ہوئی اور لوگوں نے شور مچایا کہ روکو روکو پہیہ نکل گیا۔ بڑی مشکل اور احتیاط سے ڈرائیور نے گاڑی روکی۔ خدا نے رحم کیا۔ بال بال بچ گئے ورنہ گاڑی کا الٹ جانے کا سخت خطرہ تھا۔ اب وہاں جنگل میں ہم لوگ اُتر کر بیٹھ گئے۔ دھوپ تیز تھی کیونکہ وہاں ابھی سے کافی گرمی پڑ رہی تھی۔ گھنٹہ بھر تک پہیہ کو لگایا جاتا رہا اس کے بعد کہا گیا کہ اب آ کر بیٹھ جایئے۔ چنانچہ سب لوگ بیٹھ گئے لیکن اب معلوم ہوا کہ انجن اسٹارٹ نہیں ہوتا۔ مسلسل کوششیں ہوتی رہیں پر انجن اسٹارٹ نہیں ہوا۔ اتنے میں پیچھے کیا دیکھتے ہیں کہ جنگل میں لبِ سڑک آگ لگ گئی ہے۔ بھوپال کے جنگل اور ڈھاک کے بالکل خشک درخت اور سوکھی گھاس۔ آناً فاناً آگ نے زور پکڑ لیا۔ بڑا خطرہ کہ کہیں موٹر پر کوئی چنگاری وغیرہ اڑ کر پڑ جائے اور وہ خدانہ خواستہ آگ پکڑ لے۔ میں نے کہا کہ گاڑی آگے کر لو۔ چنانچہ دھکیل کر ایک فرلانگ گاڑی آگے کر لی گئی اور خاصی دیر بعد بہ مشکل انجن اسٹارٹ ہوا۔

وہاں سے آہستہ آہستہ گاڑی روانہ ہوئی بائیں طرف کے سب لوگ جھکے ہوئے پہیہ کو دیکھتے رہے۔ ایک مقام پر ندی کے کنارے ہم لوگ اتر گئے اور بس آگے تین میل ڈاک دینے روانہ ہوگئی۔ اسے پھر پلٹ کر پھر اسی راستے سے واپس آنا تھا۔ ہم نے ہاتھ منہ دھویا اور بات چیت کرتے رہے کوئی پچاس منٹ بعد بس واپس آئی معلوم ہوا پہیہ میں گڑ بڑ ہو گئی تھی اسے ٹھیک کیا جا رہا تھا اب شام ہو چلی تھی۔ بھوک سے بُرا حال ہو رہا تھا اور بھوپال کے جنگل جانور شیر تیندوے وغیرہ کا خطرہ الگ تھا کہ اگر بات اسی طرح بگڑتی رہی تو کیا ہوگا۔ خیر سات ساڑھے سات میل چل کر پہیہ پھر نکل گیا۔ پھر اترے اور پون گھنٹے کی کوشش کے بعد پہیہ درست ہوا۔ باڑی دس بارہ میل رہ گیا تھا۔ اللہ آمین کرتے کرتے گاڑی کسی طرح باڑی تک پہنچ جائے۔ گاڑی پھر روانہ

ہوئی۔ بھوک سے آنتیں قل ہواللہ پڑھ رہی تھی۔ تھکان سے جسم چور چور ہو رہا تھا۔ سر چکرا رہا تھا اور دل پریشان تھا۔ باڑی دو ڈھائی میل رہ گیا تھا۔ موٹر نے پھر دغا دی، اب سورج غروب ہونے والا تھا اور جانوروں کا خطرہ بڑھ رہا تھا۔ ہم لوگ پیدل ہی روانہ ہو گئے۔ میل ڈیڑھ میل چلنے کے بعد بھائی صاحب[1] مل گئے جو میانے بیل گاڑی وغیرہ لیے ہوئے چار بجے سے ہمارے منتظر کھڑے تھے میں میانے میں بیٹھ گئی اور ڈیڑھ میل میانہ میں چل کر ندی پر پہنچے۔ ناؤ میں میرا میانہ رکھ دیا گیا اور اس نے دوسرے پار اُتار دیا۔ راستے میں کہار پوچھنے لگے...... ''بیا تم کہاں سے آئی ہو؟'' ...... میں نے کہا: ''دلّی سے'' .... ''او اتنی دور سے ...... سرکار لڑائی تو وہیں ہو رہی ہے نا؟'' ...... ''وہاں نہیں وہاں سے بھی بہت دور ہے۔'' ...... ''کوئی دس پچیس روپے تو خرچ ہوئے ہوں'' ...... ''اس سے بھی زیادہ'' ...... ''سرکار وہاں غلہ کیا بھاؤ ہے؟'' ...... ''تین سیر کا'' ...... ''ہاں سرکار یہاں بھی مہنگا ہے ...... پانچ سیر کا ملتا ہے'' ...... میں باوجود تکان اور بھوک کے ان کی باتوں سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ جس وقت ہم مکان پر پہنچے تو آٹھ بج چکے تھے۔ بہن سیادت[2] مجھ سے لپٹ کر رونے لگیں۔ سب بچے آ کر جمع ہو گئے۔ میں نے سب کو گلے لگایا اور لیٹ گئی۔ اتنے میں ننھے چچا، بھائی صاحب اور عابد صاحب بھی آ گئے۔ ان کے سامنے کیسے لیٹتی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسی وقت چائے بن گئی اور دو پیالی پینے کے بعد تکان آدھا کم ہو گیا۔

اگلے دن بھائی صاحب کے اصرار پر دماڑے (گاؤں) گئے۔ بیل گاڑی اور گھوڑا گاڑی، ہر راستہ کچا اور ناہموار تھا، اس قدر دھکے لگے کہ ہڈی ہڈی ہل گئی۔ واپسی پر دھکوں کے خیال سے ڈھائی میل کے قریب پیدل چلے۔ شام ہو گئی تھی، بھوپال کے گھنے جنگل میں غروب آفتاب بہت اچھا معلوم ہو رہا تھا، دو مقام پر شیر اور تیندوے ملے جہاں اکثر وہ آ کر پانی پیتے اور گاڑیوں پر حملہ وغیرہ کرتے ہیں۔ تھوڑا سا خوف محسوس ہوا مگر پھر ہنس کر ٹال دیا۔ اگلے دن معلوم ہوا کہ دن کے دس بجے وہاں تیندوا مارا گیا۔ ہم نے اسے منگا کر دیکھا۔ خوبصورت مگر خوفناک جانور تھا۔ رات کو

---

[1] سید علی مہدی جو عابد صاحب کے کزن بھی تھے اور بہنوئی بھی [2] عابد صاحب کی بہن

حکیم صاحب کے یہاں دعوت تھی بہن کے اصرار سے گئی ان کی ماں اور بہن دونوں عجیب قسم کی بدتمیزسی عورتیں ہیں اور چھوٹا بھائی تو عجوبہ سمجھنا چاہیے۔ بہن کے چھوٹے بچے ظفر کی سالگرہ ہوئی، بہت سے مرد اور عورتوں نے چائے پی اور کچھ چیزیں کھائیں۔ بیگم[1] نے سالگرہ پر جو نظم کہی تھی وہ پڑھی۔ اچھی نظم تھی اس لڑکی میں شعر کہنے کی بڑی صلاحیت ہے۔

۲۳/مارچ

حمیدہ سلطان[2] سیکریٹری بزم خواتین دہلی دو سال سے بورڈنگ لائبریری میں عورتوں کا ایک بڑا ادبی اجتماع کرتی ہیں۔ پچھلے سال بھی جلسہ ہوا تھا۔ شائستہ اختر صدر تھیں۔ میں بھی گئی تھی اور ''خواتین وادب کے عنوان سے تقریر بھی کی تھی جو عورتوں کے سبب سے زیادہ پسند کی۔ اس سال انھوں نے مجھے صدارت کے لیے کہا۔ عابد صاحب کے مشورے سے میں نے قبول کرلیا مگر بہت پریشان تھی کیونکہ پہلا اتفاق تھا اس پر یہ کہ شائستہ اختر اور مسز اشرف یہ سنا گئیں کہ بیگم نائیڈو اور مسز پنڈت وغیرہ بھی آئیں گی۔ بہرحال اب تو منظور ہی کرلیا تھا۔ عابد صاحب سے ۲۵/کی رات کو دیر تک تقریر کے متعلق پوچھتی رہی اور ۲۶/۲۵ کا سارا دن تقریر کی تیاری میں صرف ہوا عنوان تھا ''ادب کی تعمیر نو''۔ ۲۷/کو تین بجے شام کو جلسہ تھا صبح سے بارش ہو رہی تھی۔ اس پر بھی نور فاطمہ اور فیروزہ بتن[3] کو لے کر ایک بس سے چلی گئیں۔ میں اور مسز مجیب اور ان کی بہن سوا دو بجے کار سے روانہ ہوئے، پونے تین پر پہنچے تو سوائے حمیدہ سلطان اور ان کی بہنوں کے اور کوئی نہ تھا۔ خیر پونے چار پر جلسہ شروع ہوا، بیگم نائیڈو اور شائستہ اختر کا آخر تک انتظار رہا مگر وہ نہیں آئیں تقریروں میں عفت صاحبہ کی تقریر اچھی تھی مگر بالکل رٹی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اختر قریشی کا مضمون بھی اچھا تھا، حمیدہ سلطان کا مضمون ''سروجنی نائیڈو کی شاعری'' یونہی سا تھا۔ شاعری کا تو کیا وہاں کی زندگی کا اور شاعری کی ابتدا کا کچھ ذکر تھا۔ نظمیں بہت سی پڑھی گئیں، کچھ مزاحیہ کچھ

---

۱ سیدہ فرحت ۲ دہلی کی مشہور ادیبہ ۳ عابد صاحب کی بھانجی

سنجیدہ دو ایک غزلیں بھی تھی مگر بیگم ڈاکٹر امیر حسن کی نظم ''عورت'' بہت اچھی تھی، نہایت عمدہ تخیل اور حسن ادا۔ سب نے پسند کی اور تعریف کی۔ آخر میں میں نے اپنا مضمون پڑھا۔

میرا مضمون توقع سے بھی زیادہ پسند کیا گیا۔ نہ صرف پرانے زمانے کی عورتوں بلکہ نئی تعلیم یافتہ لڑکیوں نے بھی بہت پسند کیا اور تقریباً سب نے تعریف کی۔ سب سے کمزور اور پوچ مضمون صدیقہ بیگم سہوہاری کا تھا۔ وہ خود نہیں آئی تھیں۔ مضمون لکھ کر بھیج دیا تھا، بیچاری مسز جمیل پکڑ گئیں، انھیں پڑھنا پڑا۔ لالہ رخ کے نام سے سجاد حیدر صاحب کی لڑکی عینی[1] افسانہ نگاری کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنی نئی فیشن کی آواز اور اداؤں میں ایک افسانہ سنایا مگر آواز کی باریکی اور اتار چڑھاؤ کے سبب لوگوں کے پلے کچھ نہیں پڑا سب سے قریب میں تھی میری بھی سمجھ میں آدھا جملہ آتا تھا اور آدھا نہیں۔

جلسے کے بعد چائے تھی، ہم سب پردہ دار خواتین کو ایک چھوٹے سے حصے میں چند کرسیاں ڈال کر ٹھونسا گیا تھا اور باہر کمرے میں بے پردہ، نئی فیشن کی دلدادہ خواتین اور شاعر حضرات مجاز، جاں نثار، جذبی اور میزبان فصیح الدین وغیرہ بیٹھے تھے اور مشاعرہ شروع ہو گیا۔ اندر عورتوں کے بیٹھنے کی جگہ نہیں، کچھ کھڑی کچھ ایک ایک کرسی پر کئی کئی بیٹھی ہوئی سننے اور جھانکنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھیں۔ مجھے یہ طریقہ نہایت بے ہودہ معلوم ہوتا ہے کہ مہمان بلا کر انھیں تکلیف دی جائے اور خود ماحول سے خوش گپیوں میں مشغول رہیں، یا تو پردہ دار عورتوں کو بلایا نہ جائے یا پھر مردوں کی تواضع کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھی جائے۔

جلسے میں کم از کم تین چار سو عورتوں کا مجمع تھا۔ عابد صاحب سے یہ سن کر بے حد تعجب ہوا کہ اس جلسے کے رپورٹ ''دون'' میں چھپی، اس میں لکھا ہے کہ حمیدہ سلطان کا مضمون ''بیگم نائیڈو کی شاعری'' اور اختر قریشی کا مضمون اور عفت صاحبہ کا مضمون بہت پسند کیا گیا اور عصمت بانو کی غزل۔ خیر اختر قریشی اور عفت کا مضمون تو بے شک پسند کیے گئے تھے لیکن حمیدہ سلطان کے

---

[1] قرۃ العین حیدر

مضمون کی تو شاید ایک دو عورتوں نے بھی تعریف نہیں کی تھی اور عصمت کی غزل کو تو نہایت بھونڈی اور خراب تھی۔ ڈاکٹر امیر حسن کی بیوی کی ''نظم'' کا بالکل ذکر نہیں کیا گیا جو واقعی عمدہ چیز تھی اور نہ میرے مضمون کا کوئی تذکرہ، جسے سبھی نے پسند کیا اور تعریف کی تھی۔ اچھے بُرے ہونے کا تو ذکر نہیں معیار مختلف ہوتے ہیں مگر ''پسند کیے جانے'' کے تو یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ جس میں مضمون اور نظم کی سب اہلِ جلسہ تعریف کریں وہی پسند کی گئی مگر غالباً یہ جلسہ کیا ہی اس لیے جاتا ہے کہ حمیدہ سلطان اپنی اور اپنے خاندان کی اور دوستوں کی شہرت اور تعریف چاہتی ہیں ورنہ ایسی ناانصافی تو نہیں کرنی چاہیے۔ مجھے اس کی ذرا بھی خواہش نہیں کہ میرے مضمون کی تعریف کیوں نہیں چھپی مگر اس کا افسوس ضرور ہے کہ اس کے مقابلے میں اس سے بہت پست درجے کے مضمون کو سراہا گیا اور اس کا ذکر تک نہیں اور اپنے مضمون سے زیادہ بیگم میر حسن کی نظم کا ذکر نہ ہونے سے تعجب ہوا۔ خیر اس سے ہماری ادیب خواتین کی ذہنیت آشکار ہو جاتی ہے کہ ان جلسوں اور مشاعروں کا اصل مقصد ان کے نزدیک کیا ہوتا ہے۔ ۲۹ کو ریڈیو پر تقریر تھی ''سسرال میں میرا پہلا دن'' یہ تقریر مسز جمیل اور عابد صاحب کے اصرار پر لکھی تھی۔ خود مجھے تو پسند نہیں تھی مگر سننے والوں نے خاصی پسند کی۔

۲/اپریل

مارچ کا سارا مہینہ ہنگامہ اور مصروفیت میں گزرا۔ ہفتوں دم مارنے کی فرصت نہیں ملی۔ بڑی بی[1] کے اصرار پر ان کے میلاد کا بھی انتظام کرنا پڑا اور کل یکم اپریل کو ان کا میلاد بھی ہو گیا۔ اس میں بھی بہت کام اور محنت کرنی پڑی مگر خیر بڑی بی خوش ہو گئیں اور اچھا مولود ہوا بائیس روپے خرچ کر کے بڑی بی نے شاندار مولود کرایا اور کسی کو بھی حصہ دینے سے باقی نہیں چھوڑا۔ آج ۲/اپریل کو مارچ کے مہینے کی ڈائری ختم کر رہی ہوں۔ اس سارے مہینے اطمینان سے اپنا کام

[1] گھر کی ملازمہ

کرنے لکھنے پڑھنے، سینے پرونے کہیں کو موقع نہیں ملا۔ اب چاہتی ہوں کہ اپریل کا مہینہ ذرا سکون اور عافیت سے گزرے اور کچھ کام کرسکوں۔ مگر بھائی جان اور بھابی بلا رہی ہیں۔ بھابی سے ملنے کو دل تڑپ رہا ہے۔ پھر وہ کشمیر سدھار جائیں گی تو چھ مہینے تک ملنا نہ ہوگا مگر خرچ کی دقت اور سفر کی تکلیف کی وجہ سے ہمت نہیں پڑ رہی۔ دیکھئے کیا طے ہوتا ہے۔ پرسوں عابد صاحب مکتبہ جامعہ گئے تھے، کچھ حساب کا روپیہ ملے تو خرچ چلے۔ میرن صاحب کو علاوہ ۳۵ روپے ماہوار دینے کے اب یکمشت سوا سو روپیہ اور دینا ہے وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں کہ غریب عابد کا کچھ بوجھ ہلکا ہو۔ آج کل خرچ کی جس قدر دقت ہے وہ بس کیا کہی جائے۔ مکتبہ جا کر پتہ چلا کہ پہلے وہاں سے چھ سات سو کی رقم پچھلے دو سال میں لی جا چکی ہے اور بجائے ہمارا روپیہ اس پر ہونے کے اس کا ہی کچھ ہم پر نکلتا ہے۔ عابد صاحب وہاں سے بہت پریشان اور افسردہ آئے۔ اگرچہ وہ اپنی پریشانی کو کبھی ظاہر نہیں کرتے مگر اس وقت ان پر بہت ہی اثر تھا اور فکر ہوگئی کہ اس سال کیسے کام چلے گا۔ ادھر داعی پور سے خط پر خط آ رہے ہیں کہ مکان کی حالت خراب ہے۔ ادھر معمولی ڈھائی سو روپیہ کا خرچ ماہانہ پڑتا ہے۔ کیا کیا جائے۔ میں اپنی امکانی کوشش خرچ کو کم کرنے کی کرتی ہوں مگر آخر کہاں تک؟

۲ رمئی

ایک چکر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں

یہ مصرعہ بالکل میرے حسب حال ہے اور لطف یہ ہے کہ پھر بھی لوگ میرے نہ آنے اور زیادہ نہ ملنے کی شکایت کرتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جو زیادہ ملتا جلتا ہے اسی کی شکایت کی جاتی ہے اور اسی سے توقع رہتی ہے۔ اپریل مہینہ سارا گزر گیا اور ڈائری نہ لکھی گئی۔ دو ہفتے تک تو سینے کا کام زوروں پر ہوا اپنے بہت کپڑے سیئے، عابد صاحب کے بقیہ کپڑے ختم کیے، غرض مارا ماری کرکے اس گرمی کے کپڑے سی ہی لیے گئے۔

دو دن کے لیے قرول باغ بھی گئی تھی۔ ذاکر صاحب کی بیوی کو بھی اصرار کر کے ساتھ لے لیا تھا، وہ ماموں صاحب کے ہاں ٹھہریں اور میں رات کو نیر حسین صاحب کے ہاں۔ صبح کو سلویہ کے لیے اس غریب نے اپنا دکھڑا رونے کو بلایا تھا وہی پرانی بات۔ اشرف اسے طلاق دینا چاہتا ہے مگر چالاکی سے اسے اس بات پر راضی کر رہا ہے کہ وہ مہر یک مشت نہ لے بلکہ ماہوار رقم لے لے۔ وہ غریب کہتی ہے کہ مجھے مہر وہر کچھ نہیں چاہیے اشرف صرف مجھے اپنے نکاح میں رہنے دے اور اپنے قدموں میں جگہ دے دیں۔ اس نے ایسے ایسے خط اشرف کو لکھے کہ پتھر کا دل بھی پانی ہو جائے مگر نہ جانے اس بے حس مردوئے کا دل فولاد کا ہے یا مٹی کا، وہی مرغ کی ایک ٹانگ کہ میری تمہاری نہیں بنے گی۔ طلاق ضرور دوں گا، قصور کچھ نہیں پر میرا دل انتہائی اصرار کے باوجود ایک مرتبہ بھی ملنے نہیں آیا۔ سلویہ رو رو کر مری جاتی ہے۔ اس ظالم کی محبت، دنیا کی لاج، طلاق کا خوف۔ میں نے کہا تمہیں خودداری بھی کرنی چاہیے، بھاڑ میں جائے ایسی محبت، تم خود اس کا خیال چھوڑ دو۔ مگر ہائے مشرقی عورت کی محبت۔ کہتے ہیں عورت یا تو انتہائی محبت کرتی ہے اور اگر اُسے بری طرح ٹھکرا دیا جائے تو اسے انتہائی نفرت ہو جاتی ہے۔ کاش سلویہ کو اشرف سے نفرت ہی ہو جائے۔

قرول باغ میں نذر سجاد حیدر سے ملنے گئی۔ سولہ برس بعد انھوں نے مجھے دیکھا تھا مگر فوراً پہچان لیا۔ بڑی دیر تک باتیں کرتی رہیں، بچاری پلنگ پر پڑی تھیں، ان کا بلڈ پریشر بڑھا رہتا ہے اور دل کے دورے پڑتے ہیں جب سے سجاد حیدر صاحب کا انتقال ہوا اور بھی حال خراب ہو گیا۔ کچھ وحشت زدہ سی گھبرائی سی رہتی ہیں۔ ان کی لڑکی عینی عجیب ہے، بناوٹ بے تکا، فیشن ذرا پسند نہیں آئی۔ ماں پھر بھی معقول ہیں۔ اپریل کی ۹ کو عابد صاحب وائیوا لینے علی گڑھ گئے اور ۱۳ر کو واپس آئے۔ بھائی جان کا کئی دن تک انتظار رہا مگر وہاں سے نہ خط نہ تار نہ خود آئے۔ بارے ۱۳ کو بلقیس[1] کا خط آیا جس سے پتا چلا کہ بھائی جان کو نصیب اعدا انفلوئنزا ہو گیا تھا۔ اس لیے نہیں

---

[1] سیدین صاحب کی بیٹی

آسکے۔ ۱۴ کی شام کو اچانک زیدی صاحب اور ان کی بیوی پہنچ گئے، بڑی دیر تک سب باتیں کرتے رہے۔ انہیں چائے وغیرہ پلائی۔ زیدی صاحب نے نظام[1] کا ایک ایسا مزے دار قصہ سنایا کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ اور ساتھ ہی سخت حیرت کہ ایسے جانگلو لوگ دنیا میں ہوتے ہیں۔

ہم لوگ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ڈاک آئی جس میں بھائی جان کا خط اور یہ اطلاع کہ ایک بچی اور ہوئی ہے۔ ذرا دیر کے لئے تو افسوس ضرور ہوا کہ اس مرتبہ تو لڑکا ہو جاتا مگر تھوڑی دیر بعد یہ اثر جاتا رہا۔ اسی دن بھابی اور بھائی جان کو خط لکھا۔ تیسرے دن بھائی جان کا تار آیا کہ ''تیمارداری کے لیے فوراً آؤ، پریشان نہ ہونا'' لیکن ہم لوگوں کا پریشانی سے بُرا حال ہو گیا۔ عابد صاحب نے جموں فون کیا۔ کنکشن ملنے میں ڈھائی تین گھنٹے لگے۔ عابد صاحب بچارے بخار سے اٹھے ہوئے اتنی دیر دفتر میں بیٹھے رہے اور میں گھر پر بدحواس رہی۔ آخر میں جب نہ رہا گیا تو صابرہ کو لے کر (وہ علی گڑھ سے ایم اے پریوئیس کا امتحان دے کر آئی تھی) دفتر چلی گئی وہاں اسی وقت فون ملا تھا۔ معلوم ہوا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں بھابی اب بہتر ہیں۔ خیر کچھ پریشانی کم ہوئی۔ چھوٹے بھائی جان کو کئی دن سے بلا رہے تھے مگر انھیں فرصت بھی نہیں ہوتی اور جی بھی اچھا نہ تھا۔ بھوپال سے واپسی پر ان سے ملاقات ہوئی تھی اس کے بعد نہ وہ آئے اور نہ ہم گئے۔ صابرہ بھی ہمارے ساتھ جموں چلنے پر راضی ہو گئی اور ۲۲ کو ہم لوگ اوکھلے سے روانہ ہوئے، ببّن کو ظہیر کے ہاں چھوڑا۔ بڑی بی اور حمید کو گھر پر۔ اسٹیشن پر چھوٹے بھائی جان سے ملاقات ہوئی، ان کا جی اچھا تھا مگر مکان نے پریشان کر رکھا ہے۔ ۱۴ روپے پر دو چھوٹے کمرے کرائے پر ملے ظہیر کا گھر چھوڑ دیا ہے۔

راستہ کسی نہ کسی طرح کٹ ہی گیا۔ رات میں ایک چھوٹی سی سیٹ مجھے اور صابرہ کو لیٹنے کے لیے مل گئی۔ مگر دن میں بہت رش رہا خصوصاً لاہور سے وزیر آباد تک۔ وزیر آباد میں بھائی جان نے کار بھیج دی، پانچ ساڑھے پانچ بجے جموں پہنچ گئے۔ یہاں سب کو بخیریت پایا ایک دن عابد

---

[1] نظام حیدر آباد

صاحب سے جھڑپ ہوگئی، میری طبیعت خراب تھی۔ وہ مجھے الزام دے رہے تھے کہ تم قبض کا خیال نہیں کرتیں۔ میں نے الٹا انھیں الزام دیا کہ آپ میری صحت کا خیال نہیں رکھتے۔ زخم[۱] کے نشان پر جو پھنسی ہے اسے اب تین چار سال ہو گئے۔ ناسور کی سی صورت اختیار کر لی ہے اور اب اس میں بہت تکلیف بھی رہنے لگی ہے۔ آپ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ تمھاری ذمہ داری ہے، تم نے کیوں علاج نہیں کرایا۔ غرض بڑی دیر تک نوک جھونک رہی، اور شکایتیں بھی بہت بڑھ گئی ہیں ان کا علاج نہ کرانے سے وہ کہتے تھے یہ تمھاری ذمہ داری ہے وہ بھی خفا ہو گئے اور میں بھی۔ قصور میرا ہی سہی پر انھوں نے کیوں شروع سے میری عادت خراب کی کہ ہمیشہ میری صحت کا خیال خود رکھا اور علاج دوا پر بے حد توجہ کی، اب میری عادت یہی پڑ گئی۔ وہ زبردستی علاج کراتے ہیں، توجہ کرتے ہیں تو کر لیتی ہوں ورنہ ٹال جاتی ہوں۔ اگرچہ ان کی بے توجہی سے دلی تکلیف ہوتی ہے۔ رات کو میں نے معافی مانگی تو انھوں نے بجائے معاف کرنے کے قدرے رکھائی سے یہ کہا کہ نہیں میں خود شرمندہ ہوں کہ تمھارا خیال نہیں کیا۔ مگر ان کا لہجہ ایسا تھا جس سے میں گھبرا گئی کہ یہ مجھ سے رنجیدہ ہیں اس دن رات بھر مجھے بے حد صدمہ اور دلی تکلیف رہی۔ میں گھنٹہ بھر کے لیے بھی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی بھی خصوصاً عابد مجھ سے ناراض رہیں۔ میرا مزاج تیز ضرور ہے مگر دل میں بات نہیں رہتی۔ بہت کم کبھی عابد صاحب سے شکایت کرتی ہوں۔ اس پر بھی اگر کبھی کی، تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ خدا جانے وہ مجھے ایک کمزور انسان کے بدلے فرشتوں کے معیار پر ہمیشہ کیوں جانچنا چاہتے ہیں۔ جس کے دل میں نہ کبھی شکایت پیدا ہو اور نہ وہ کبھی اس کا اظہار کرے ان کا خود یہ حال ہے کہ جو بات میں اپنے خیال میں بہت سنبھل کر کہتی ہوں وہ بھی ان کو تکلیف دیتی ہے۔ انھیں اس سے صدمہ پہنچتا ہے۔ اب میں انکا مزاج بہت کچھ پہچان گئی ہوں حتی المقدور انھیں رنج نہیں دیتی مگر آخر بندہ بشر ہوں۔ کوئی بات ان کے خلاف ہو جاتی ہے تو وہ بے حد رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ کاش وہ سمجھتے کہ ان کی رنجیدگی سے مجھے کیسی دلی اور

---

[۱] گردے کے اوپر ایک زخم تھا

روحانی کوفت ہوتی ہے۔ کئی دن عابد صاحب اداس اور خاموش رہے میں بھی رنجیدہ رہی مگر گھر میں کسی پر اپنی آپس کی خفگی کا اظہار نہیں ہونے دیا اب عابد صاحب بظاہر بالکل خاموش ہیں مگر میرا خیال یہ ہے کہ ابھی تک ان کے دل پر کچھ اثر باقی ہے یا تو عابد اتنے حساس نہ ہوتے یا پھر میں بے حد نرم مزاج اور ان کے اونچی معیار پر اترنے کے قابل ہوتی۔ خیر آئندہ سے اور زیادہ احتیاط رکھوں گی کہ عابد کو میری کسی بات سے رنج نہ پہنچے۔

کل زہرا[1] بلقیس کا نتیجہ نکل آیا انھوں نے آٹھویں کا امتحان دیا تھا۔ دونوں فرسٹ ڈویژن پاس ہوگئی ہیں۔ کل میں سب بچیوں کو اس خوشی میں فلم دکھانے لے گئی تھی۔

۲۰ رمئی

اس عرصے میں اکثر نئی کتابیں پڑھیں جن میں سے دو ایک قابلِ ذکر ہیں۔ کپور کی سنگ و خشت خوب ہے۔ مختلف عنوانات سے طنزیہ مضامین ہیں جس میں نئے اور ترقی پسند رجحانات کے قابل اعتراض چیزوں کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ عابد صاحب کا خیال ہے کہ جو اعتراضات ہیں وہ صحیح ہیں۔ انگڑائیاں ترقی پسند افسانہ نگاروں کے کچھ افسانے اس نام سے احمد قاسمی نے شائع کیا ہے۔ منٹو کا افسانہ اچھا ہے اور خلاف عادت فحش اور عریانی سے پرہیز کیا ہے۔ عصمت کا تِل جیسی کہ ان کی عادت ہے بے حد فحش اور گندا ہے جس میں بازاری چھوکری کا حال اپنے مخصوص رنگ میں لکھا ہے۔ مجھے ذرا پسند نہیں آیا۔ کرشن چندر کے ٹوٹے ہوئے تارے فنی لحاظ سے اچھا ہو تو ہو مگر عریانی اور فحش پن اس میں بھی موجود ہے۔ ہاں ممتاز مفتی کا ''آپا'' بہت اچھا ہے ان کے افسانے بعض بہت اچھے ہوتے ہیں۔

۱۹ رجون

---

[1] سیدین صاحب کی سب سے بڑی بیٹی

اس عرصے میں دوبارہ تلاشِ حق اور میری کہانی پڑھی۔ تلاشِ حق جو گاندھی جی کی آپ بیتی ہے ایک لحاظ سے بہت پسند ہے کہ اس میں بغیر کسی تصنع یا بناوٹ یا کمی بیشی کے اپنی ساری باتیں سچ سچ لکھ دی ہیں اسے پڑھ کر گاندھی جی کی زبردست شخصیت اور مضبوط سیرت کا اور بھی گہرا نقش دل پر پڑتا ہے، ان کی سچائی اور حق پرستی بھی دل کو بہت متاثر کرتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی آتا ہے کہ وہ کچھ ضدی آدمی ہیں اور اس میں تو شک ہی نہیں کہ انتہا پسند ہیں جو بات بھی ہو اس کو انتہائی حد تک پہنچا کر رہتے ہیں ان کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا یا کم سے کم سارے ہندوستانیوں کو نفس کش، مردہ دل، بے حس سادھو بنا کر رکھ دیں جن میں نہ فطری خواہشات ہوں نہ جوش نہ جذبہ۔ میں ان کی شخصیت سے تو مرعوب ہوں لیکن ان کی خیالات اور عقیدے دل لگتے معلوم نہیں ہوتے۔

برخلاف اس کے جواہر لال کی ''میری کہانی'' مجھے زیادہ اپیل کرتی ہے۔ یہ تو ضرور ہے کہ بعض جگہ وہ کچھ دنیا سے بیزار اور ہندوستانیوں کی مستقبل سے مایوس سے نظر آتے ہیں جس کی وجہ بظاہر ان کا مستقل جیل کا قیام ہے کہ غریب کو کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع بہت کم ملتا ہے لیکن پھر بھی ہندوستان کو آزاد کرانے کا گہرا جذبہ ان کے دل میں ہے۔ وہ سرمایہ داروں، تعلقہ داروں کے خلاف اور کسان اور مزدور کے ہمدرد ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ وہ اکثر جگہ گاندھی جی کی سیاست اور خیالات سے اختلاف کرتے ہیں لیکن ہمیشہ ان کے قدم بقدم چلتے ہیں اور ان کے احکام سے ایک ذرّہ انحراف نہیں کرتے۔ شاید یہ گاندھی جی کی بے مثل مضبوط سیرت کا اثر ہے کہ وہ اپنے سے مخالف خیالات رکھنے والے پر بھی گہرا اثر ڈالتی ہے۔

گرمی سخت پڑ رہی ہے۔ اگرچہ ۱۷۔۱۸؍جون کے بعد سے لو تو بند ہو گئی ہے لیکن آندھیوں نے اس زمانے میں بہت پریشان کیا۔ کبھی کبھی تو دن رات میں دو دو تین تین سخت آندھیاں آتی رہیں اور بعض اوقات مجھے اور عابد کو دو دو تین تین رات جاگنا پڑا جس سے طبیعت بہت خراب رہی۔ صرف ۲۰ کو رات کو ایک بارش ہوئی تھی بادل روز آتے رہتے ہیں پر آندھی اڑا لے جاتی ہے۔ تین دن سے گرمی

نے زور پکڑلیا ہے۔رات بھر کالے کالے بادل چھائے رہے پر صبح سے آندھی چل رہی ہے۔
آج کل صفیہ[1] کواردو اور فارسی پڑھاتی ہوں اس کی وجہ سے اس قسم کے شعر اکثر دماغ میں گونجا کرتے ہیں۔

۲۲/جون

ببّن[2] کا بہت دن سے اصرار تھا کہ سنیما دکھاؤ۔ نیا ترانہ آیا ہوا ہے۔خود میرا جی بھی چاہتا تھا،سعیدہ[3] بھی اس کھیل کو دیکھنے کو بیقرار تھی، کئی جمعہ ارادے میں گزر گئے،کبھی گرمی زیادہ تو کبھی بہن کی طبیعت خراب تو کبھی عابد صاحب کو کوئی کام کبھی سواری ندارد۔اس جمعرات کو ۲۱/جون صبح کے چھے بجے کار میں سعیدہ،ببّن اور میں روانہ ہوئے۔عابد اس لیے نہ جاسکے کہ اتفاقاً رات کو حیات اللہ انصاری آ گئے تھے۔بس نہ ملنے کی وجہ سے رات کو یہاں ٹھہرے صبح کو انھیں جانا ضروری تھا۔عابد بعد میں بس سے آئے۔سویرے اس لیے گئے کہ ذاکر صاحب کو جو سلیم صاحب کے ہاں گئے ہوئے تھے موٹر چاہیے تھی۔دوپہر میں قرول باغ میں رہے۔مکتبہ جامعہ جا کر کچھ کتابیں انھیں چھپنے کو دیں۔حامد صاحب سے پوچھا کہ ان کے پاس کاغذ ہے؟ مگر انھوں نے انکار کردیا کہ کاغذ ہی نہیں۔سال بھر سے میں اس امید میں تھی کہ عابد چاہتے ہیں کہ میری کتابیں چھپیں تو مکتبہ ہی سے چھپیں اب دونوں تیار پڑی ہیں پر چھپ نہیں سکتی نہ جانے کیوں جی چاہتا ہے کہ جلدی سے جلدی چھپ جائیں۔شاید یہ اپنی خودی کو تسکین دینے کا جذبہ ہو یا خودنمائی کا، اللہ جانے! نذر سجاد صاحب سے ملنے بھی گئی تھی۔کچھ تو وہ ہمیشہ کی بدحواس ہیں۔میاں کے انتقال نے اور زیادہ کردیا ہے۔ایک ایک بات دس دس مرتبہ پوچھتی ہیں اور پھر بھول کر پانچ منٹ بعد وہی سوال کرنے لگتی ہیں۔ان پر ہنسی بھی آتی ہے اور رحم بھی۔ان کی لڑکی قرۃ العین بھی کچھ عجیب سی ہیں۔بناوٹ بہت،سادگی کا نام نہیں۔مگر مجھ سے دونوں ماں بیٹی محبت سے ملتی ہیں۔لیکن یہ دیکھ

---

[1] ذاکر صاحب کی چھوٹی بیٹی　[2] عابد صاحب کی بھانجی　[3] ذاکر صاحب کی بڑی بیٹی

کر افسوس ہوتا ہے کہ یہ ہماری مشہور لکھنے والیوں کا یہ حال ہے۔

ٹھیک دوپہر میں قرولباغ سے بھائی محبوب[1] کے ہاں گئے وہاں سے پہلے شو کے لیے سنیما، مگر معلوم ہوا کہ نہیں ہوگا دوبارہ بڑے دواخانہ واپس گئے پھر سات کا شو دیکھ کر رات کے گیارہ بجے جامعہ نگر واپس آئے گاڑی کی لائٹ بھی خراب ہے اور ڈرائیور کی آنکھیں اور اعصاب بھی۔ اس کی وجہ سے ذاکر صاحب بہت زیادہ پریشان ہوگئے خصوصاً اس لیے کہ ان کی بچی بھی ہمارے ساتھ تھی۔ نیا ترانہ بہت عجب فلم ہے۔

۳۰ر کو عابد علی گڑھ گئے ہیں آج دوپہر تک واپس آئیں گے اور ارادہ کل رات واپس آنے کا تھا۔ اسٹیشن گاڑی بھی منگائی تھی لیکن ذاکر صاحب نے مجھ سے کہا کہ رات کا معاملہ ہے گاڑی ہرگز نہ بھیجنا۔ میں ڈرائیور کو منع کرنے کے لیے بلایا تو وہ آئے نہیں وہاں سے وہی چلے گئے دوپہر سے شام تک میں انتہائی حد تک پریشان رہی۔ ذاکر صاحب کا یہ فقرہ کانوں میں گونجتا رہا کہ (خدا نہ خواستہ نصیب دشمناں کیا آپ چاہتی ہیں کہ وہاں سے لاشیں آئیں)۔ اس قدر دل بے چین تھا کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیاں کروں۔ نہ کوئی آدمی پاس جسے بھیج دوں کہ انھیں موٹر میں آنے سے روک دے۔ بارے شام کو معلوم ہوا کہ خط آیا ہے وہ کل رات نہیں آج دن میں آئیں گے، تب جا کر کہیں اطمینان ہوا۔ رات بہت بے چینی میں گزرے سارا گھر گہری نیند کے مزے لے رہا تھا اور میں کروٹیں بدل رہی تھی۔ یہ نیند نہ آنے کا مرض بہت بُرا پیچھے لگا ہے۔

جولائی

دو دن سے جامعہ میں چھٹیاں ہیں ہم شاید پندرہ تک رام پور چلے جائیں گے۔

۱۲ر کو ریڈیو پر تقریر ہے "ہمارا اخلاق" کل اسے پورا کیا ہے۔ عابد آکر اسے دیکھ لیں اور جو ٹھیک ٹھاک کرنا ہو کر دیں تو پرسوں نقل کر کے ریڈیو اسٹیشن بھیج دوں۔

---

[1] خواجہ محبوب علی صالحہ عابد حسین کے پھوپھی زاد بھائی

۷ار جولائی

کل رات تین بجے رام پور پہنچے۔ بہت تکان ہوئی۔ زیدی صاحب مسوری گئے ہوئے ہیں آج رات آجائیں گے۔ بھابی قدسیہ بیماری کی وجہ سے بالکل زرد ہوگئی ہیں۔ بچے خصوصاً سید[1] بہت پیارا ہوگیا ہے۔ خوب باتیں کرنے لگا ہے پہلے جھینپتا زیادہ تھا۔

دہلی میں ۱۲ر کی شام کو صابرہ آئی تھیں، کل مجبوراً انھیں چھوڑ کر آئی ہوں چودہ کو بتن کو رام پور بھیجا ہے مگر اسے ابھی تک روز حرارت ہو جاتی ہے۔ اس کی طرف سے مجھے بہت فکر ہے۔ خدا کرے وہاں کی آب وہوا اسے موافق آئے۔ گرمی رام پور میں تو کچھ دہلی سے زیادہ ہے یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ شہر جامعہ نگر میں کھلی فضا اور کھلے گھروں میں رہنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ رام پور میں رات کو کمرے میں سونا پڑتا ہے۔ اس سے مجھے کافی تکلیف ہوتی ہے کیونکہ یوں بھی مجھے آسمان کے نیچے سونا بہت پسند ہے اور گرمی میں تو واقعی تکلیف بھی ہوتی ہے یہاں۔ رات بھر چھت کا پنکھا چلتا ہے مگر وہ بات کہاں۔

پرسوں مجھے ذاکر صاحب کی معرفت دہلی کے محکمہ تعلیم کی طرف سے رسالہ نونہال کی چیف ایڈیٹر کی جگہ Offer کی گئی ہے۔ سن کر خوشی بھی بہت ہوئی کہ مجھ جیسی عورت کو جس نے کالج اسکول میں باقاعدہ تعلیم بھی نہیں پائی۔ ایسی ذمہ داری دی اور معقول تنخواہ (دو سو روپیہ سال ہوئے) کے قابل سمجھی گئی کیونکہ عام طور پر دنیا قابلیت نہیں ڈگریاں دیکھتی ہے۔ جی بہت چاہتا ہے کہ کرلوں۔ کچھ اس لیے کہ ایک ذمہ داری معقول کام کرنے کی مشق ہوگی کچھ اس لیے کہ آمدنی خاصی ہے۔ سال بھر بھی یہاں کام کرلیتی تو عابد صاحب کو گھر کے خرچ کی طرف سے اطمینان رہتا اور اس عرصے میں اپنی کتاب کا کام کرلیتے۔ مگر عابد راضی نہیں ہیں ان کے منع کرنے کے وجوہات بھی معقول ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ اوکھلے سے شہر آنا جانا محال ہے۔ اگر سواری کا انتظام بھی کیا جائے تو کم سے کم سو روپے ماہوار کرخرچ اور بے حد زحمت۔ دوسرے پردے کا معاملہ۔

---

[1] کرنل زیدی کے بڑے بیٹے سید زیدی

وہاں دفتر میں کام کرنا ہوگا اور دس پندرہ آدمیوں کے سامنے تو آنا ہی پڑے گا۔ یوں میں ڈاکٹروں کے سامنے آتی ہوں۔ بعض دوستوں کے سامنے آتی ہوں، کسی کے ہاں جا کر رہنا ہو تو وہاں کے نوکروں کے سامنے بھی آنا ہی پڑتا ہے لیکن اس طرح نوکری کے سلسلے میں آنا مشکل ہے اس سرے سے اس سرے تک خاندان والوں میں شور مچ جائے گا مجھ میں اتنی جرأت نہیں کہ بزرگوں کو ناراض کروں اور صدمہ پہنچاؤں لیکن ان سب سے زیادہ اہم وجہ میری صحت کی کمزوری ہے۔ عابد صاحب نے ایک حرف نہیں کہا مگر میں خود ان کا خیال سمجھتی ہوں اور اپنے آپ بھی اندازہ کرتی ہوں کہ زیادہ محنت اور پابندی کا کام کرنے کی میری صحت اجازت نہیں دیتی۔ پچھلے پانچ چھ سال کی سخت بیماریوں نے عام صحت اس قدر کمزور کر دی ہے کہ ذرا سی بات میں بیمار پڑ جاتی ہوں۔ بعض وقت سوچتی ہوں کہ کاش میری صحت اچھی ہوتی تو شاید دنیا میں کچھ کام کر سکتی۔ اگر قسمت نے مجھ کو بچوں سے محروم رکھا تھا تو میں دوسرے کے کام اور لوگوں کی خدمت زیادہ پابندی سے اچھی طرح کر سکتی تھی مگر اس کا کیا علاج کہ صحت بھی اس قابل نہیں۔ خیر خدا کا یہی لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اس نے اتنا تندرست بھی کر دیا۔ ورنہ ایسی ایسی بیماریوں کے بعد اگر بالکل ہی محتاج اور بے دست و پا ہو جاتی تب بھی تعجب نہ تھا۔ اب خدا کے فضل سے گھر کا سارا کام کرتی ہوں آنے جانے ملنے ملانے کے علاوہ کچھ نہ کچھ لکھنے پڑھنے کا کام بھی کرتی رہتی ہوں جو عام طور پر ہمارے ہاں کی عورتیں بالکل نہیں کرتیں۔ ہاں دل میں جو بڑے بڑے حوصلے اور زیادہ کام کرنے کی امنگ تھی وہ پوری نہیں ہوئی۔

بھائی جان کشمیر برابر بلا رہے ہیں مگر میں بیماری کے سبب جانا نہیں چاہتی عابد کو ستمبر میں بھیجنا چاہتی ہوں۔ خدا کرے وہ تیار ہو جائیں۔ اس سال انھوں نے گرمی کی بڑی سخت تکلیف اٹھائی جس سے کمزور ہو گئے ہیں یوں ہی کون بڑے طاقت ور ہیں ان کی کمزوری سے میرا دل بڑا متفکر ہو جاتا ہے ارادہ ہے کہ کل سے میں اور عابد دونوں کام شروع کریں۔ مجھے آٹھ نو مہینے بعد چند دنوں کے لیے گھر کے دھندوں سے نجات ملی ہے اور انھیں جامعہ کے قصوں سے اگرچہ جیسا پہلے

خیال تھا کہ ڈیڑھ مہینے رہیں گے اور خوب کام کریں گے وہ تو پورا نہ ہو سکے گا صرف بیس اکیس دن ملیں گے مگر خیر اتنے ہی دن میں کچھ کام تو ہوگا۔ ستمبر میں میرا پانی پت جانے کا ارادہ ہے مگر وہاں کوئی لکھنے پڑھنے کا کام ہونا بہت مشکل ہے۔

کل سے عابد صاحب کے جو مضامین نقل کرنے لائی ہوں وہ نقل کروں گی پھر اپنے مضمون۔ چاہتی ہوں کہ ساتھ ساتھ ناول کا کام بھی کروں شاید اس سال جنگ ختم ہو جائے اور مجھے اپنے کتابیں چھپوانے کا موقع مل جائے۔ خدا کرے۔

سعیدہ کو علاج کے لیے رام پور لانا چاہتے تھے۔ زیدی صاحب کا بھی اصرار تھا مگر ذاکر صاحب اور ان کی بیوی راضی ہی نہیں ہوئے۔ ہزار کوشش کے باوجود کشمیر جانے پر تیار نہیں ہوئے۔ ملیریا کے زمانے میں وہ سعیدہ کو جامعہ نگر رکھ کر بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ رسم و رواج کا خیال ہے، خرچ کی مشکلات کی فکر ہے۔ گائے بھینس، بکریوں، مرغیوں کے لیے کیا ہو اس کا خیال ہے اور احساس نہیں تو اس بات کا کہ جوان لڑکی کا بیمار رہنا ٹھیک نہیں اس کی کمزوری دور کرنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ کشمیر چلے جاتے۔ ورنہ کم سے کم علاج کے لیے رام پور ہی چند دن کو بھیج دیتے مگر ظاہر ہے پرائی اولاد پر ہمارا کیا اختیار۔ مجھے جانے کیوں اس لڑکی سے بہت محبت اور اس کی صحت کی حد سے زیادہ فکر ہے مگر ہر کوئی تو میرے جیسا نہیں۔

کتابیں اس عرصے میں کئی پڑھیں مگر صرف دو بہتر تھیں۔ ''سدرشن کی''، ''تصور خیال'' اور ایک بنگالی ناول کا ترجمہ ''زمانہ ساز'' وہ بھی دوسرے درجے کی تھیں اول نمبر کی کوئی بھی نہیں۔ آج کل بہت اچھی کتاب کوئی دیکھنے میں نہیں آتی یوں بھی اس جنگ کا سب سے بُرا اثر کتابوں اور رسالوں پر پڑا ہے۔ کاغذ کا کوٹا کم ہوتے ہوتے اس کی نوبت پہنچ گئی کہ اب رسالے آٹھ دس ورق سے زیادہ نہیں چھپ سکتے اور اخبار محض ایک ایک ورق، کتابیں پہلے سے ایک تہائی چھپیں گی۔ پہلے ہی کون زیادہ چھپ رہی تھیں۔ نہ جانے کیا ہوگا اس مہینے کے چمنستان[1] کو دیکھ کر دل کو صدمہ

[1] ادبی رسالہ

سا ہوا۔ واہ کیا صورت تھی آٹھ صفحے میں رسالے میں مضمون نظمیں افسانے درج تھے۔ بیچارے پبلشر اور مصنفوں کی قسمت۔

بیگم ہاشمی سے جو منظور صاحب کی بہن ہیں، کچھ کتابیں پڑھنے کو لائی تھیں۔ تھیں تو تقریباً سب پہلے کی پڑھی ہوئی مگر بے کاری کی وجہ سے لے آئی تھی۔ فرحت کے مضامین دوبارہ پڑھے اور بہت لطف اُٹھایا۔ ظرافت کی ہلکی ہلکی چاشنی چھوٹے چھوٹے لطیف مزاحیہ فقرے اور دہلی کی ٹکسالی زبان عجب لطف دیتا ہے۔ پھول والوں کی سیر، احمد بک کے حالات اور جزیرۂ بورنیو کا سفرنامہ خاص طور پر بہت اچھے ہیں۔ پھول والوں کی سیر میں تو کمال کر دیا ہے۔ سو برس سے پہلے کی دلّی کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ کیا عکاسی ہے اور کیسا تخیل۔

'نوائے کارگر' احسان دانش کی نظموں وغیرہ کا مجموعہ بھی اچھا ہے۔ یہ شاعر بہت اچھے ہیں مگر بہت کم تعلیم پائی ہے۔ مزدور اور مفلس کی ترجمانی کرتے ہیں مگر ہمارے اکثر ترقی پسند شاعروں کی طرح محض دیکھی سنی نہیں بلکہ بیتی باتیں سناتے ہیں، بات دل سے نکل کر دل میں بیٹھ جاتی ہے۔ خصوصاً ان کی ایک نظم جس میں ایک مزدور کی لڑکی کی رخصتی کا منظر دکھایا ہے دل پر بہت اثر کرتی ہے۔

سجاد حیدر صاحب کی ایک کتاب 'جلال الدین خوارزم شاہ' ترجمہ از ترکی، پڑھی تاتاریوں کا مقابلہ ایک بہادر بادشاہ خوارزم شاہ نے سچے ایمانی جوش اور پوری طاقت سے کیا اور آخر اسی کوشش میں جان تک دے دی، مگر دوسروں نے اس کا بہت کم ساتھ دیا۔ نیم تاریخی ڈراما ہے اس کو بہت زیادہ دلچسپ بھی بنایا جا سکتا تھا۔ مگر موجودہ حالت میں تو اتنا خشک ہے کہ پڑھنا مشکل ہوتا ہے۔ مجنوں کی ایک کتاب جو کسی انگریزی ناول سے ماخوذ ہے ''سوگوار شباب'' اچھی خاصی ہے۔

کل مضامین چکبست پڑھی۔ اس میں مختلف لوگوں کے حالات اور بعض کتابوں اور شاعروں پر تنقید وغیرہ ہے۔ چکبست نسیم اور گلزار نسیم کے حد درجہ قائل اور حالی کے سخت مخالف ہیں۔ داغ پر جو مضمون ہے اس میں حقیقت کے ساتھ تھوڑا تعصب بھی موجود ہے جس میں محض

دہلی لکھنؤ کی پرانی چشمک کو دخل ہے اودھ پنچ اور سجاد حسین پر اچھا مضمون لکھا ہے۔ ذات کی تفریق میں ہندوؤں کو ان کے ایک پرانے طریقوں پر لعنت ملامت کی ہے اور ان کو سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس کے بعض فقرے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ چکبست خاصے کٹر قسم کے ہندو تھے۔ حالؔی پر جگہ جگہ موقع بے موقع فقرے کسے جاتے ہیں اور چوٹیں کرتے ہیں۔ یہ خاص اودھ پنچ کا رنگ ہے۔ اگر حالؔی سے اصولی طور پر اتفاق نہیں تھا تو جس طرح دوسرے لوگوں اور کتابوں پر تنقید کی ہے معقول طرح سے حالی کا مقدمہ شعر و شاعری پر تنقید کرتے اور ان کے اعتراضوں کے مدلّل جواب دیتے، بیچارے سے یہ تو بنا نہیں ہاں اپنے ہاں کے قاعدے کے مطابق فقرے بازی اور اعتراض وہ بھی بے موقع بے محل کر گزرے ہیں۔ بیچارے اور کیا کر سکتے تھے۔

دربار اکبری پڑھنی شروع کی تھی مگر اس قدر موٹی کتاب ہے اور اتنی غیر متعلق باتیں اس میں بھر دی گئی ہیں کہ ساری کو پڑھنا محال ہے۔ میں نے تو سو صفحے پڑھ کر چھوڑ دیے۔ اکھن[1] کے اب تک بچہ نہیں ہوا بڑی دیر ہوئی۔ صابرہ کا خط دس بارہ دن ہوئے آیا تھا، پانی پت میں کسی کی خیریت معلوم نہیں ہوئی، جی لگا ہوا ہے۔ خلیقہ[2] کی طرف سے ہر وقت فکر لگی رہتی ہے، اس کا وہی حال ہے۔

زیدی صاحب جب دہلی اور مسوری گئے ان سے فونٹین پین کے لیے کہا تھا مگر کہیں ملا نہیں۔ مجھے اس کا خیال بھی نہ تھا مگر انھوں نے اپنا قلم مجھے دے دیا مجھے بہت شرمندگی ہوئی، بہت انکار کیا مگر بھابی قدسیہ سر ہو گئیں کہ انھیں تو دوسرا (سالگرہ کے تحفے کے طور پر) مل گیا مجبوراً لینا پڑا، ان کی سالگرہ ہوئی تو میں کوئی تحفہ تو نہ دے سکی الٹا ان سے قلم لے لیا، واہ۔

رامپور میں کچھ حصے زیدی صاحب نے ہمارے لیے خریدے تھے وہ بک جائیں گے تو فائدہ ہوگا چچی اماں کا قرض بھی ادا ہو سکے گا اور سال بھر کے خرچ کے پورے ہونے کی بھی تدبیر ہو جائے گی۔ مجھے اشفاق صاحب نے نونہال کی ادارت کے لیے باقاعدہ آفر بھیجا تھا مگر میں نے بہ مجبوری انکار کر دیا۔

---

1 اختر فاطمہ، صالحہ عابد حسین کی چچازاد بہن 2 صالحہ عابد حسین کی پھوپی زادی بہن

۲۱ر اگست

۷ر کو رام پور سے ہم لوگ واپس آ گئے سفر اچھا کٹا مگر یہاں آ کر تین چار دن گرمی کی شدید تکلیف اٹھائی اس کے بعد ایک ہفتہ بہت اچھا گزرا۔ دو تین بارشیں اچھی ہو گئیں اور خوب ٹھنڈی ہوا چلتی رہی اب بارہویں دن سے پھر سخت قسم کی برساتی سڑی گرمی پڑ رہی ہے۔

۹ر کو ریڈیو پر تقریر ہوئی وہاں سے باجی صفیہ[1] کے گئی۔ سب لوگ بخیریت اکھن کے اور بچہ نہ ہونے سے پریشان اور امن اور صفیہ کی آپس کی نا اتفاقی اور کشمکش بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ بارے پچھلے اتوار کو ۱۳ر کو اکھن کے بچی پیدا ہوئی جمعہ کے دن میں بھی دیکھنے کو گئی تھی۔ ماشاء اللہ بچی خوب موٹی تازی ہے اور ماں بھی بخیریت ہے امن اور بچے کل پانی پت چلے گئے۔ چچی اماں اور اکھن بھی ہفتے بھر اور رہیں گے۔

۳ر نومبر

پانی پت کا مکان فروخت کرنے کی بہت دن سے کوشش ہو رہی ہے۔ پانی پت میں بعض عزیزوں نے اس پر بہت لعن طعن کی۔ یہاں تک کہا کہ انسان کی اصلی عزت مکان جائیداد ہی سے ہوتی ہے۔ چار تقریریں کرنے سے نہیں ہوتی مگر ہم اپنی رائے پر اڑے تھے کہ مکان بیچ کر قرض ادا کر دیں گے اور بقیہ روپیہ کسی معقول کام میں لگا دیا جائے گا۔ ہفتہ بھر ہوا ایک خریدار بالکل تیار ہو کر یہاں آ گیا۔ بیعانے کے روپے بھی لے آیا۔ دس ہزار پر معاملہ ہوا تھا جس میں سے پانچ چھ سو ایجنٹ کے تھے۔ لیکن جب خریدار کو معلوم ہوا کہ دکانیں چار سال کے لیے بہت کم کرائے پر اٹھا دی گئی ہیں اور اس عرصے میں کرایہ نہیں بڑھایا جا سکتا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ اب غالباً وہ مکان یا تو فروخت نہ ہو گا یا کم پر ہو گا۔ منشی اصغر حسین نے جو اٹھارہ برس سے تمام

---

[1] پھوپی زاد بہن

جائداد کی آمدنی کھا رہے ہیں اس وقت بھی دھوکا دیا ان کے پنجے سے چھوٹنے کا صرف یہی ایک ترکیب سمجھ میں آئی تھی خدا انھیں سمجھے کہ اس میں روڑا اٹکا دیا۔ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے۔ مجھے بہت ہی قلق ہوا، قرض کا بار سر سے اتر جاتا اور شاید کچھ تھوڑی آمدنی کی صورت بھی ہو جاتی۔

آج کل خرچ کی انتہا نہیں، گرانی حد سے زیادہ پھر بعض لوگوں کی امداد مستقل کرنی پڑتی ہے۔ اور مزید بھی اکثر دینا پڑتا ہے۔ کئی مہینے سے پانچ چھ سو روپے ماہوار خرچ ہو رہا ہے۔ اگلے سال سے خرچ کا کیا ہوگا یہ فکر سوہان روح ہے بہر حال خدا مالک ہے۔ محمود[1] صاحب بیوی بچوں کو لے کر ڈھاکہ چلے گئے۔ سارا سامان فروخت کر دیا خوب اچھے داموں پر بکا، حد کر دی کہ ٹوٹی پھوٹی چیزیں جو قیمت میں بہت کم تھیں وہ غریب لوگوں کو دیتے تو ان کا کچھ نقصان نہ ہوتا اور ان کا بھلا ہو جاتا۔ صفیہ عامر کے بچے کی ہڈی ٹوٹ گئی بیچاری بہت پریشان ہیں۔

یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر نذیر جنگ سے آ گئے اور اب بریلی ہی رہیں گے۔ بیچاری رضیہ[2] کی دعائیں خدا نے سن لیں۔ اس عرصے میں قابلِ ذکر کتابیں بہت کم پڑھیں۔ ہاں رمضان میں ترجمان القرآن کی دونوں جلدیں اور اکتوبر میں فاتحہ کی تفسیر پڑھی اور ایک کتاب شہید انسانیت اور دوسری ہماری شاعری پچھلے ہفتے پڑھی تھی۔ حیدر آباد سے ایک ادارہ نے میری کتاب چھاپنے کے لیے منگائی ہے۔ میں نے اپنے آٹھ افسانوں کو دوبارہ مرتب کیا ہے اور مجیب صاحب کو مقدمہ لکھنے کے لیے دے دیا ہے۔ ساز ہستی نام تجویز ہوا ہے۔ آج کل طبیعت خراب اور الیکشن کی وجہ سے کوئی کام باقاعدگی سے اور اطمینان سے نہیں ہوتا جس سے طبیعت الجھتی ہے۔ نہ پڑھنے کو نئی کتابیں ہیں نہ کوئی اور دلچسپی کا سامان۔ لکھنے کو طبیعت چاہتی ہے نہیں۔ سینے پرونے سے بھی الجھن ہوتی ہے۔ کام بہت ہے مگر کیا نہیں جاتا۔ خدا کرے انجکشنوں کے بعد یہ کیفیت دور ہو جائے اور خوب بہت سا کام کر سکوں۔ اس زمانے میں کئی کتابیں پڑھیں احمق الذی، حاجی بغلول، سیرت اقبال۔ بعض اچھی تھیں بعض خاصی اور بعض مہمل (ان سب کا مختصر ذکر الگ لکھتی

---

[1] ذاکر صاحب کے چھوٹے بھائی [2] پھوپھی زاد بہن

ہوں)۔ بھائی جان کا خط آیا ہے ان کا ابھی تک پورا فیصلہ نہیں ہوا کہ رامپور جائیں گے یا کشمیر رہیں گے۔ مگر اغلب یہی ہے کہ رامپور ہی جائیں گے۔...... بھائی جان تعزیت کرنے محمودہ[1] کی شادی اور کسی جلسے کی شرکت کے لیے ۴/ یا ۵/ دسمبر کو آئیں گے۔ خدا کرے جلد اور خیریت سے آئیں۔ سات مہینے ہوگئے دل بے قرار ہے۔

آج ۳۱/ تاریخ ۴۴ء رخصت ہو رہا ہے۔ بھائی جان کانپور گئے ہوئے ہیں کل آئیں گے مجھے کل ایک زنانے مشاعرے کی صدارت کرنی ہے تین دن مارا مار کر کے اس کے لیے تقریر لکھی ہے۔ حمیدہ سلطان کا اصرار تھا اس لئے ٹال نہ سکی۔ مہمانوں کی وجہ سے کام کی زیادتی ہے۔ بھابی سونے چلی گئیں عابد صاحب بھی نیند میں ہیں بارہ بجے تک جاگنے کا ارادہ سب نے ملتوی کر دیا مگر میری نیند کوسوں دور ہیں۔ یہ سال بھی گزر گیا اور کچھ نہ ہوا۔ گھر کا نظام کسی طرح میری مرضی کے موافق نہیں بنتا نوکروں نے پریشان کر رکھا ہے۔ خرچ بڑھتا جاتا ہے۔ اس سال ساڑھے چار سو کا اوسط پڑا ہے۔ مہنگائی نے ناک میں دم کر دیا ہے آمدنی اور بھی کم ہوگئی ہے۔ جامعہ میں حیدر آباد کی رقم بند ہو چکی ہے اب خدا ہی مالک ہے۔ خیال تھا کہ ۴۴ء میں ناول پورا کرلوں گی۔ افسانوں کا مجموعہ شائع ہو جائے گا اس میں سے کچھ بھی ہوا گھر کے جھگڑے بکھیرے، کام کاج اور سب سے زیادہ بیماری دم نہیں لینے دیتے۔ خدا کرے ۴۵ء بہتر گزرے۔ صحت ٹھیک رہے فکریں اور پریشانیاں کم ہوں میں اور عابد دونوں دل سے بھی اور اطمینان سے کام کرسکیں۔

خدا کرے کہ اگلے سال میں کچھ ادبی کام کرسکوں۔ کچھ علمی ترقی کروں۔ اپنے گھر کی حالت سدھار سکوں۔ قرض سے بھی بچی رہوں۔ آمدنی اور خرچ میں توازن قائم رہے اور میرے سب عزیز پیارے زندہ تندرست اور خوش خرم رہیں بھائی جان جنوری سے رامپور آرہے ہیں خدا کرے انھیں زندگی کا یہ نیا موڑ مبارک ثابت ہو۔ لو وہ بارہ بج گئے۔ سال نو شروع ہو گیا اور میری ۴۴ء کی ڈائری ختم۔ خدا حافظ۔

---

[1] مسز سیدین کی بھتیجی

1947

۱۹۴۷ء جا رہا ہے........... سالِ نو شروع ہونے والا ہے............ الوداع ۱۹۴۷ء...... الوداع........... اے خوشی و مسرت، کامیابی و کامرانی کے یادگار سال الوداع............ اے غم و مصیبت، بربادی و تباہی، ناکامی اور ناامیدی کے ناقابلِ فراموش سال الوداع..........

اے ۱۹۴۷ء! کیا ہندستان کی تاریخ تجھے فراموش کر سکتی ہے؟ اس عجیب و غریب سال کو میں اس کی جدو جہد اور کوششوں کا بہترین نتیجہ برآمد ہوا........... آزادی کا زریں زریں سورج طلوع ہوا اور دو سو سال کی غلامی کی تاریک رات ختم ہوگئی........... اور پھر........... آپس کے نفاق نے تعصب و نفرت نے خانہ جنگی کی صورت اختیار کر کے تجھے سب سے منحوس، سب سے زیادہ تاریک، سب سے زیادہ خونیں سال بنا دیا...... غیر ملک کی غلامی سے نجات پا کر ہمارا ملک آزاد ضرور ہوا مگر اس کے جاہل، وحشی باشندے اپنے نفس کی غلامی میں بدستور گرفتار رہے...... انھوں نے اس متبرک اور قابلِ قدر اور انمول نعمت کی عزت و قدر کرنے کے بجائے...... اس کی پیشانی خون سے داغدار کر دی...... جس آزادی کی خاطر انھوں نے اپنا خون بہایا تھا اسے پا کر دوسروں کا، بے گناہ، معصوم، مظلوم لوگوں کا خون بے دھڑک کرنا شروع کر دیا...... ساری دنیا کی نگاہ میں اپنے آپ کو ذلیل اور اپنے ملک کو شرمندہ کیا۔ اپنی وحشت و بربریت کے ایسے خوفناک نظارے دکھائے جو ہندوستان کی تاریخ میں خونیں حرفوں سے لکھے جائیں گے اور دنیا ہمیشہ ہمیشہ ان پر لعنت کرے گی......

اے ۴۷ء! تو نے ایک کروڑ سے زیادہ لوگوں کو بے خانماں کر دیا، لاکھوں کو محتاج، بے گور، بے وطن بنا دیا۔ لاکھوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، لاکھوں کو اپاہج و معذور کر دیا، ہزاروں عورتوں کی عزت پر بن گئی لاکھوں بچوں کی زندگی تباہ و برباد ہو گئی۔ سیکڑوں گاؤں جلا دیے، بیسیوں شہر تباہ کر دئے، ملک میں اس سرے سے اس سرے تک درد و کرب، بے چینی و بے قراری، بدحواسی و خوف، نفرت و تعصب، رنج و صدمے، غصہ اور غضب کی آگ لگی ہوئی ہے۔

آہ اے ۴۷ء! کیا میں اپنی زندگی بھر کبھی تجھے بھول سکتی ہوں؟...... کیا وہ سب واقعات جو اس سال مجھے پیش آئے کبھی بھی میرے دماغ سے محو ہو سکتے ہیں۔ وہ اثرات جو میرے دل پر پڑے کبھی مٹ سکتے ہیں؟ وہ تجربات جو چند ماہ کی قلیل مدت میں مجھے ہوئے گزشتہ زندگی بھر کے تجربات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے؟ یہ سال نہ صرف ہندستان کی تاریخ میں کبھی نہیں بھلایا جا سکتا بلکہ لاکھوں کروڑوں آدمیوں کے دلوں میں بھی اس کی خونیں یاد ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گی ......اور لاکھوں میں سے ایک میں بھی ہوں......

آہ ۴۷ء! تیرے عہد میں جہاں اور سیکڑوں گاؤں اور بیسیوں شہر تباہ و برباد ہوئے ان میں ایک میرا پیارا وطن بھی تھا۔ میرا عزیز وطن...... میرے بزرگوں کا آٹھ سو سال پُرانا گہوارہ...... ہندوستان کا مشہور تاریخی شہر...... علمی، ادبی، تہذیبی شہرت رکھنے والا...... قابلِ فخر و قابلِ رشک شہر...... پانی پت...... ناکردہ گناہ، بے وجہ، بے سبب تعصب و دشمنی کی آگ میں جل گیا...... اس کے تقریباً چالیس ہزار مسلمان باشندے جو صدیوں سے اپنے وطن میں عزت و آبرو کی، سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرتے آتے تھے، جن کی ایک اپنی خاصی تہذیب اور معاشرت تھی، جن میں دیہاتی زندگی کی جہالت و وحشت نہ تھی، شہروں کی مصنوعی تہذیب اور بناوٹی تکلف و نمائش نہ تھی...... جس کے باشندے سفید پوش اور خود دار نظر آتے تھے...... جس کے رؤسا عیاش و عیش پرست نہ تھے۔ جس کے خوش حال لوگ کاہل اور بے عمل نہ تھے۔ جس کے غریب بے غیرت اور گداگر نہ تھے...... آہ پانی پت تیری خصوصیات لوگوں کو تیری طرف کھینچتی تھیں...... تو دیکھنے میں

اس چھوٹا سا شہر تھا، جس میں شہری تہذیب کی وہ نمائشی خصوصیات نہ تھیں جن پر لوگ جان دیتے ہیں ۔ تیری سڑکیں شکستہ۔ تیری گلیاں تنگ، تیرے مکان پرانے فیشن کے۔ تیرے محلے قدامت پسند طریقے کے تھے تو سینما اور تھیٹر سے مزین نہ تھا، کالج و یونیورسٹیاں نہ تھیں۔ ہوٹل، شاندار دکانیں نہ تھیں، پر ہمیشہ سے تو ممتاز اور مشہور چلا آتا تھا...... تیری تاریخی حیثیت مسلم سمجھی گئی، تیرے عالم قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے گئے...... تیرا شاعر حالی...... ہندوستان کا محبوب ترین اور مقبول ترین شاعر ہے، تیرے بعض ہونہار سپوت علم و فضل میں یکتا نکلے...... بعض نے قوم کی بہبودی اور فلاح کی کوشش میں جان لڑادی اور اپنی علمی قابلیت اور عملی صلاحیت کا لوہا دنیا سے منوا لیا...... کسی نے حسنِ انتظام اور تجارتی مہارت کا ثبوت دیا، کوئی ہندوستان کا بہترین ماہر تعلیم ہوا...... کوئی بہترین جرنلسٹ بنا...... تیری گود کے پروردہ نونہالوں نے سارے ملک میں اور بعض نے دوسرے ملکوں میں تیرا نام روشن کیا اور ہمیشہ فخر و عزت کے ساتھ تیرا ذکر کیا اور تیری یاد ہر جگہ ان کے دل میں باقی رہی...... اپنے تجھ سے محبت کرتے، تجھ پر فخر کرتے...... کہیں رہتے، کہیں ہوتے پر سال میں ایک آدھ مرتبہ آکر تیری زیارت کر جاتے...... اور تجھ سے وابستگی اور تعلق باقی رکھتے...... تیری مذمت بھی کرتے، مگر ایسی مذمت، ایسی برائی جو کسی قابلِ رشک جگہ ہی کی کی جا سکتی ہے...... آہ!

آہ پانی پت! جہاں میں تو کبھی ممتاز تھا...... اے وطن تجھ پر کبھی ہندوستان کو ناز تھا...... مگر اے میرے پیارے وطن...... آج تو ظلم و فساد کی آگ میں جل کر راکھ ہو گیا...... تو ہم سے چھوٹ گیا...... بظاہر ہمیشہ کے لیے...... تیرے ہزاروں جاں نثار اور عاشقِ زار باشندوں کو جنھیں اپنے چھوٹے چھوٹے گھر، اپنا اپنا کونہ، دنیا کے بڑے بڑے محل، شاندار سے شاندار مقام سے زیادہ پیارا تھا گھر سے جبراً بے گھر کیا گیا...... ان کا مال اسباب لوٹ لیا، ان کا گھر اور سب چیزیں چھین لیں...... بہت سوں کو مار ڈالا بہت سی عورتوں کو جبراً پکڑ کر لے جایا گیا، سینکڑوں کو زخمی کر دیا گیا...... اور اب ہزاروں ہمارے پیارے ہم وطن دوست اور عزیز یا پاکستان میں آف کیسی خونیں

بنیاد پڑی ہے اس ملک کی...... کتنے انسانوں کی ہڈیوں پر تعمیر کیا گیا ہے یہ نیا ملک...... کتنی آہیں...... کتنے آنسو...... محتاج، بے بس، بے گھر، اجنبی، مصیبت زدہ...... کتنے نالے...... کیسے کیسے دلخراش اور خوفناک واقعات کی یادوں سے وابستہ ہے اس ملک کے قیام سے محتاج، بے بس گھر، اجنبی، مصیبت زدہ اپنی معاشرت، زبان اپنے دل...... سب سے بیگانہ اور مختلف مقام پر اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے چلے گئے یا ہندوستان کے مختلف شہروں میں اپنی جان ہتھیلی پر لیے زندگی کے مصائب کا مقابلہ کررہے ہیں...... اور ہمارے (تقریباً) ہزار سال پرانے وطن میں ستر ہزار پناہ گزینوں کا راج ہے، ہمارے گھروں میں سکھ اور ہندو قابض ہیں، ہماری چیزیں ان کی استعمال میں ہیں...... ہماری مسجدیاں مسمار کردی گئیں، ہمارے امام باڑوں میں اب حسین کے مقدس ذکر کے بجائے جانے کیا کیا، کیا جاتا ہے...... ہمارے اسکول ویران پڑے ہیں...... ہمارے بزرگوں کے مزارات لوگوں کے قبضے میں ہیں جہاں وہ جو چاہیں کریں کوئی نہیں روک سکتا۔ ہمارے قبرستان...... ہمارے پیارے عزیزوں کی قبریں اب کیسی بری حالت میں ہیں۔ کوئی دو آنسو بہانے والا اور فاتحہ پڑھنے والا باقی نہیں رہا...... آہ!...... اے پانی پت تیری یاد...... دل میں ہمیشہ رہے گی...... ہمارا وسیع اور ممتاز خاندان...... جس کی یکجہتی، محبت ضرب المثل تھی...... جس کا تو مرکز تھا...... ہر شادی غمی کے موقع پر سارے افراد خاندان ایک جگہ جمع ہوکر ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں حصہ لیتے تھے اور اپنی محبت اور اتفاق کو زندہ رکھتے تھے، آج سارے ملک میں منتشر ہے، وہ بوڑھے، بزرگ جن کو اپنے وطن گھر سے عشق تھا، جنھوں نے زندگی بھر اپنا گھر نہ چھوڑا تھا، آج ہزاروں میل دور دوسروں کے گھروں پر پڑے خون کے آنسو رو رہے ہیں...... وہ لڑکیاں جو ملک کے کسی گوشے میں بیاہی جاتیں مگر اپنے وطن اور میکے جانے کے تصور سے اپنے دلوں کو مگن اور کوش رکھتی تھیں، جن کا وہاں جا کر آنے کو جی نہ چاہتا تھا، اب مایوسی اور حسرت کے ساتھ سوچتی ہیں کہ کہاں جائیں گی؟ کس کے پاس، ہائے کیا اب اے پانی پت!! اُف یہ تصور بھی کتنا دل دوز اور پرورده ہے کہ اب تجھے دیکھ سکوں گی ہائے کبا اب کبھی اپنی پیاری اماں کی قبر کی زیارت نصیب

نہ ہوگی......اب کبھی اپنی پیاری چھوٹی باجی، اپنے چہیتے چچا ابا، اپنی نامراد زہرا کی قبریں بھی دیکھنے کو نہ ملیں گی......آہ اے ۱۹۴۷ء! بہت سے داغ......بہت سے نقصانات......بہت سی پریشانیاں تو نے دکھائیں مگر پانی پت کا داغ کبھی سینے سے نہ جائے گا......یہ سب سے کاری......سب سے مہلک......سب سے روح فرسا وار تو نے ہمارے دل پر کیا ہے......ہماری تہذیب پر کیا ہے آہ دہلی اور پانی پت کی تباہی کیا ہندوستانی اسلامی تہذیب وتمدن کی تباہی نہیں؟ علمبردار تھے قومی تہذیب کے، حامل تھے اس تمدن کے جو ہزار سال میں ہندو مسلمانوں نے مل کر بنایا تھا......ایک دلکش حسین مرقع تھے......اب جو تہذیب بنے گی......اگر کبھی بن سکی......تو وہ پرانی تہذیب نہ ہوگی جو ہندو اور مسلمانوں کی مشترک، مقدس اور خوبصورت تہذیب تھی، جو ہزاروں سال تک سنوری اور بنائی گئی تھی دونوں قوموں کے ہاتھوں......اب جو تہذیبیں بنیں گی وہ کچھ اور ہوں گی......شاید ہندوستانی میں خالص ہندوانی جگہ اور پاکستان میں ملاؤں کی تہذیب بنے یا دونوں جگہ بگڑی ہوئی مسخ شدہ مغربی تہذیب کی نقالی ہو......پر وہ تہذیب اب خواب وخیال ہو جائے گی......آہ ۴۷ء! تو نے کیا کچھ دکھایا......کیسے کیسے واقعات!

لو وہ بارہ کا گجر بجا......سال نو کی پیشوائی کے لیے سلامی کی توپیں داغی جارہی ہیں......بمبئی کی آبادی کا ایک بڑا حصہ رنگ رلیاں منا رہا ہے......اپنے ملک کی حالت سے بے حس، اپنی ذات میں مگن، اپنی فیشن سے مطمئن، دوسروں کی دکھوں سے بے حس......۴۷ء کو رخصت کرتے اور ۴۸ء کا خیر مقدم کرنے سے پہلے سال گزشتہ کے موٹے موٹے واقعات پر نظر ڈال لوں......کہ مجھے ذاتی طور پر کیا کیا پیش آیا......میں نے کیا کیا، اور کیا نہ کرسکی......کیا ارادے تھے......جو پورے نہ ہوئے۔

جنوری، فروری، مارچ اور اپریل کا مہینہ حسب معمول گھر داری کے فرائض اور جامعہ کی کٹھن مگر دلچسپ زندگی میں سر ہوئے۔ گھر کے کام، نوکروں کی مشکلات، مہمانوں کی کثرت، چلتی رہی۔ انجمن خواتین کے جلسے ہوتے رہے، جامعہ کی گہما گہمی بدستور رہی۔ کانفرنس کے شاندار

اجلاس میں شرکت کی...... دہلی میں دو تین بار چھوٹا موٹا جھگڑا کھڑا ہوا مگر اسے جلد ہی قابو میں کر لیا گیا...... مجھے لکھنے پڑھنے کی فرصت کم ملی پھر بھی مشغلہ جاری رہا...... لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے تقریر کی، دہلی ریڈیو اسٹیشن سے کئی افسانے اور تقریریں کیں، کئی نئے افسانے اور مضمون لکھے، ببّن کی نسبت کی عرصے سے فکر تھی، قمر کا پیام منظور کر لیا اور مئی میں رسم وامام ضامن بہت سادہ طریقے سے ادا ہوگی...... مجھے اس کی خوشی بھی تھی اور آئندہ کی فکر تھی...... میں عرصے سے چپکے چپکے اس کے جہیز کا سامان جمع کرنے کی کوشش کر رہی تھی...... اب زیادہ سرگرمی سے سامان کی فراہمی شروع کی ارادہ تھا کہ اکتوبر میں اس کی شادی کردی جائے گی...... جون میں گرمی کی شدت بڑھ گئی۔ اوکھلا جہنم کا نمونہ بنتا جا رہا تھا...... عابد صاحب ایک مہینے کے لیے رامپور چلے گئے اور میں اور ببّن پانی پت چلے...... آہ میرا مرحوم وطن !!!

وہاں مہینے بھر میں ببّن کے بہت سے کپڑے اور چیزیں مکمل کیں، کچھ زیور بننے کے لیے دیا...... اور جولائی کی پہلی کو دہلی آکر بھابی، بھائی جان کے ساتھ بمبئی اور وہاں سے پونا چلے آئے، چھٹیوں کے تین مہینے بھابی بھائی جان کے ساتھ آرام اور اطمینان کے ساتھ بسر کرنے اور اپنا کام دلجوئی کے ساتھ کرنے کی خاطر۔

میری دو کتابیں 'سازِ ہستی' اور 'بات چیت' نومبر ۴۶ء میں چھپی تھیں، اور میرا ناول 'عذرا' اور 'بہادر سندر' چھپ رہی تھیں۔ نقشِ اول کے دوسرے ایڈیشن کی کتاب ہو رہی تھی۔ بچوں کی تین چار کتابیں کتابی دنیا میں تھیں جن کے چھپنے کے اسی سال کا وعدہ تھا۔ جون کے آخر میں 'عذرا' کی پہلی کاپی چھپ کر میرے پاس آئی۔ میرے پہلے ناول کی پہلی کاپی...... اوہ...... اُس کو دیکھ کر جو مسرت ہوئی وہ الفاظ میں کیسے بیان کروں۔ میں نے نئے عزم اور ولولہ کے ساتھ پونا میں اپنا کام لکھنے کا شروع کیا۔ بچوں کی دو تین کہانیاں لکھیں۔ دو تین جگہ پونا میں عورتوں کے جلسوں میں تقریر کی۔ ایک دو مضمون لکھے اور ایک نیا ناول لکھنا شروع کیا۔ کتنی پُرسکون، پُرمسرت، خوشگوار اور دلکش اور حسین مناظر، تنہائی اور سکون کے مقام پر آرام دہ مکان۔ بھائی جان کی پر لطف صحبت بیٹھ

کر لکھتے رہتے...... شام کو دور دور تک ٹہلنے جاتے، میں اکثر بھائی جان سے انگریزی پڑھا کرتی تروتازہ اٹھ کر پھر کام میں مصروف ہو جاتی۔ میرا ناول تیزی سے چل رہا تھا۔ تین چوتھائی ہو چکا تھا اور میں خوشی سے پھولے نہ سماتی تھی کہ دہلی جانے سے پہلے پہلے میں اسے پورا کرلوں گی۔

اور پھر ہندوستان کی تاریخ کا وہ اہم اور یادگار دن آیا آزادی کا حسین دن...... ہم نے دلی مسرت اور سچے جوش اور پوری عقیدت سے اس مبارک دن کا استقبال کیا...... ہم کیسے اچھے زمانے میں پیدا ہوئے، ہم تاریخ بنتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، ہمیں آزادی کا زمانہ دیکھنا نصیب ہوا۔ اوہ کیسی امید تھی کہ یہ دن بھی آئے گا۔ ہم نے خوشی منائی۔ ہم نے آزاد ہندستان کے آزاد اور اچھے شہری بننے کی تدبیر دل پر غور کیا۔ ہم نے جلسہ کیا، ہر ایک سے یہ بتایا کہ ہم اپنے آزاد ملک کے لیے کیا کرنا چاہتے ہیں۔ پنجاب وغیرہ میں جھگڑا ضرور ہو رہا تھا مگر ہمیں حالات کا پورا اندازہ نہ تھا...... اور ساتھ ہی یہ یقین کہ آزادی ملنے کے بعد اور لوگوں کے حالات پورے ہونے کے بعد یہ جھگڑا فساد کم ہو جائے گا۔

اس زمانے میں میری بڑی بھانجی صابرہ امریکہ جانے کے لیے بمبئی آئی۔ ۲۳؍اگست کو وہ امریکہ بغرض تعلیم سدھاری اور باجی کو مجبور کر کے ہم نے پونا ہی میں روک لیا کہ وہ لڑکی کے جانے سے رنجیدہ تھیں۔ ان کی چاروں چھوٹی لڑکیاں، کچھ دن بعد دہلی چلی گئیں۔ ساجدہ دہلی میں اپنے گھر اور زاہدہ شاہدہ اور خدیجہ اپنے کالج علی گڑھ کے ارادے سے۔ اور پھر...... ستمبر کی شروع تاریخوں سے خوفناک جھگڑوں کی اطلاع آنی شروع ہو گئیں۔ اگست کے آخر میں بھائی جان سرکاری کام سے چین گئے تھے اور بھابی نے اپنا آپریشن کرایا تھا گھر پر میں اور عابد، باجی اور بھائی جان کی لڑکیاں ہی تھے۔ آف کتنا روح فرسا تھا وہ زمانہ...... ایک سے ایک خوفناک خبر سارے خاندان اور دوستوں اور سب شمالی ہندوالوں کی جان کی طرف سے مایوسی، کبھی یہ اطلاع کہ ساجدہ اوران کی بہنوں کا گھر لٹ گیا۔ سارا سامان اور گھر لوٹ لیا گیا اور خود ان کو اور لڑکیوں کو ان کے پڑوسی ہندو سکھوں نے بچایا۔ اور پھر پانی پت والے عزیزوں کی طرف سی لاعلمی اور فکر اور جامعہ کی

خیر خبر نہ معلوم ہونا الگ سوہان روح، نہ میرن صاحب کی زندگی کے متعلق علم نہ اور کسی اس دوست اور عزیز کے جو دہلی پانی پت کے وغیرہ میں تھے اور پھر بمبئ اور پونا میں چھوٹے چھوٹے فساد ہونے کی افواہوں کی گرم بازاری۔ اسی زمانے میں دو تین دوستوں نے عابد صاحب سے کہا: آپ کی بیوی برقعہ اوڑھ کر اسپتال جاتی اور سڑکوں پر پھرتی ہیں اس میں سخت خطرہ ہے۔ اور اس طرح تینتیس چونتیس سال کی عمر میں میرا برقعہ اترا پہلی مرتبہ...... چھ سات سال کی عمر سے میرا پرانا رفیق!! ہاں میں نے برقعہ اتارا ضرور اپنی خواہش سے۔ مجبوری کو دیکھتے ہوئے مگر اس عزم کے ساتھ برقعہ اتار رہی ہوں پر شرم وحیا کا دامن نہیں چھوڑ رہی۔ بے برقعہ ہوگئی "بے پردہ" نہ ہوں گی اور اسلام نے جس پردے کا حکم دیا ہے کہ: سوا بانہوں تک ہاتھوں اور چہرے کے سارا جسم ڈھکا رہنا چاہیے۔ اس پر کاربند رہوں گی۔ اور زینت و سنگار (بقول مولانا ابوالکلام) غیر مردوں کو دکھانے کی کوشش نہ کروں گی...... ہاں تو یہ زمانہ انتہائی پریشانی کا تھا...... پھر باجی کے اوپر لڑکیوں کے لٹنے اور پھر پانی پت اور اس کے ساتھ ان کا گھربار، ساز وسامان سب کچھ تباہ و برباد ہو جانے کا اس قدر خراب اثر پڑا کہ ان کی صحت بگڑ گئی، مزاج بگڑ گیا اور بعض وقت تو خدا نہ خواستہ دماغ پر اثر معلوم ہونے لگتا...... جتنا میں اور عابد سمجھانے کی کوشش کرتے وہ اور خفا ہوتیں...... خدا خدا کرکے بھائی جان چین سے واپس آئے...... وہاں تو امریکی اخباروں کی انتہائی مبالغہ آمیز ایسی خبریں ملی تھیں کہ بھائی جان سمجھتے تھے شاید ہندبھر میں کسی دوست یا عزیز کو زندہ نہ دیکھوں۔ وہاں یہ مشہور کیا گیا تھا کہ دلی میں پانچ لاکھ مسلمانوں کو مار ڈالا گیا ہے...... بہر حال وہ آئے تو سب سے پہلے انھوں نے جامعہ میں فون کیا جس سے وہاں کے سب لوگوں کی خیریت معلوم ہوئی کہ مہینے ڈیڑھ مہینے خطرے اور تکلیف میں رہنے کے باوجود خدا نے اپنی عنایت سے اسے صاف بچالیا جبکہ دہلی کے آس پاس کا کائی بھی گاؤں تباہی سے نہ بچ سکا تھا۔ البتہ مکتبہ جامعہ اور کتابی دنیا قرول باغ میں جلا ڈالے گئے۔ جامعہ کی پچیس سال کی انتھک کوششوں کا نتیجہ! کتنے اشخاص کی زندگی بھر کی محنت کا یہ صلہ!!! آہ اے ہندوستان!! تیری وحشت اور بربریت کا یہ حال

ہو گیا ہے تو ایک دوسرے کی دشمنی کے ساتھ ساتھ کتاب کی عظمت کو بھی بھلا بیٹھا۔ جانے دونوں میں اس طرح کتنے ادارے نفرت اور تعصب اور جلن کی اس آگ میں جل کر خاکستر ہو گئے۔ ان دونوں اداروں میں میری اور عابد صاحب کی متعدد نئی کتابیں چھپیں تھیں اور پرانی بھی۔ چھ تصانیف میری اور آٹھ دس ترجمے اور تصنیف عابد صاحب کے! ہماری زندگی بھر کے کاموں کا نچوڑ اپنا سارا روپیہ اور کاپی رائٹ۔ غرض مالی لحاظ سے بھی بالکل تہی دست ہو گئے۔ برسوں سے یہ امید تھی کہ جب یہ سب کتابیں چھپ کر بکیں گی تو مالی مشکلوں میں کسی حد تک کمی ہو گی...... اور پھر میرا کئی ہزار روپیہ جو میں نے اپنا پانی پت کا مکان اور زیور بیچ کر فراہم کیا تھا کتابی دنیا کے حصوں میں لگا ہوا تھا، وہ بھی ساتھ ہی ختم ہوا...... مگر اس وقت ان مالی نقصانوں کا تو احساس ہی نہ تھا...... لیکن کتابوں کے جلنے سے ایسا سخت صدمہ ہوا جیسے کسی کے بچّے کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہیں۔

......اور پھر بھائی جان ہوائی جہاز سے دلی گئے ان عزیزوں سے ملنے، ان کو لانے کا انتظام کیا جو کسی طرح پانی پت سے جان بچا کر بلوائے گئے تھے، جواہر لال سے ملے، گاندھی جی سے پہلے مولانا سے ملے، سب سے کہا پانی پت ابھی تک پوری طرح تباہ نہیں ہوا، کسی طرح اسے بچایئے، ان سب نے وعدہ کیا، مہاتما جی خود دو مرتبہ پانی پت گئے، لوگوں کو سمجھایا، مگر جو آگ لگ چکی تھی اسے نہ بجھا سکے، دوسری مرتبہ جا کر انھوں نے یہ تک کہا میں بھی پانی پت میں رہتا ہوں اور اگر تم مارے گئے تو تمھارے ساتھ میں بھی جان دے دوں گا۔ مگر وہاں کے مسلمان تین مہینے کی شدید روحانی اور جسمانی اذیتوں اور پریشانیوں، حاکموں اور ہمسایوں کی بدسلوکیوں سے اتنے بے دل اور تراش ہو چکے تھے اور اپنی جان اور آبرو کی حفاظت انھیں وہاں بالکل ناممکن نظر آ رہی تھی کہ وہ وہاں ٹکے رہنے پر راضی نہ ہوئے اور اس طرح بہت سے لٹ کر تباہ ہو کر اور بہت سے بچ کر اپنا عزیز ترین دیس چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے پردیسوں کو سدھار گئے۔

غرض مصیبت و پریشانیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا کہ جس کا اثر مسلسل پڑتا رہا اور نتیجہ یہ ہوا کہ آخر میں بیمار ہو گئی۔ شدید بیمار اور تین مہینے تک کا سلسلہ چلتا رہا۔ دسمبر کے آخر میں بھائی جان

پونا سے بمبئی چلے آئے اور اسی مہینے میں میری صحت خدا خدا کر کے کچھ سنبھلی اور اب میں اس قابل ہوں کہ معمولی طریقے پر اپنا کام کر سکوں۔

چھ مہینے سے گھر چھوٹا ہوا ہے، لڑکیاں الگ پریشان ہیں۔ عابد صاحب جا کر اپنا اخبار نکالنے کی سبیل کرنا چاہتے ہیں جو ان کی مدت سے خواہش ہے اور اب تو وہ اس کو مسلمان اور ہندوستانیوں کی رہنمائی کے لیے بالکل ہی ناگزیر سمجھتے ہیں۔ ببّن کی شادی ملتوی ہوگئی۔ اس کا دولھا اور سارا خاندان لٹ کر چلا گیا پاکستان۔ قمر زخمی ہوگیا تھا۔ زندگی تھی کہ بچ گیا۔ جہیز کی چیز کا بہت سامان جو پانی پت میں رکھ دیا تھا وہاں اور سب چیزوں کے ساتھ ختم ہوا۔ اب نئے سرے سے صرف ہوگا۔ غرض کچھ عجیب حالات ہیں دیس کی، قوم کی، خاندان کی اور اپنی۔ پھر بھی...... میں سمجھتی ہوں کہ تقریباً سب دوستوں اور عزیزوں کو خدا نے ایسے پُر آشوب اور تباہ کن زمانے میں جان بچائی۔ عورتوں کی عزت کا انمول گوہر محفوظ رہا۔ اور یہ نعمت کچھ کم نہیں اور ہم سب کو بارگاہ الٰہی میں شکر کرنا چاہیے۔ اور ان معمولی نقصانوں کا غم یا شکوہ کرنا گردشِ زمانہ سے اٹھانے پڑے، ناشکری ہے۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ لاکھوں تباہ حال مصیبت زدہ ہندو مسلمان، سکھوں کی طرف جو ہر طرح تباہ ہو گئے......

خدایا!...... ۴۸ء اب ایسا نہ گزرے جیسا یہ سال گزرا...... یا اللہ تو اسے مبارک کر خاندان کے لیے، قوم کے لیے اور ملک کے لیے۔

☆☆☆

1948

۶ / جنوری

پہلی جنوری کا دن خاصی مصروفیت کا گزرا۔ جب سے بمبئی آئے ہیں سوائے دادر جا کر چچی اماں یا چھو وغیرہ سے ملنے کے اور کہیں جانا نہ ہوا۔ یا تو ایک دن عابد صاحب کے ساتھ ''ہینگ انگ گارڈن'' ضرور گئی تھی، مگر خاصی دور پڑا۔ آنے جانے میں تھک گئی۔ لیکن باغ اس قدر نفیس اور نیٹ (Neat) ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔

پہلی کو صبح کو مسز کلثوم سایانی اور مسز نوراللہ سے ملنے گئی۔ کلثوم سایانی بہت اچھی عورت ہیں۔ تعلیم بالغان کے سلسلے میں بمبئی کی عورتوں میں انھوں نے بہت کام کیا ہے۔ ان کے بہو اور بیٹے سے بھی ملاقات ہوئی۔ بہو سیدھی اور کچھ بے وقوف سی معلوم ہوتی ہے۔ بیٹا خاصا ذہین۔ ان کے میاں بچارے بہرے ہیں اور اس کی وجہ سے بے وقوف سے معلوم ہوتے ہیں۔ نوراللہ صاحب اور ان کی بیوی سے جا کر ملے۔ ان کا گھر پانچویں منزل پر ہے۔ چڑھتے چڑھتے پاؤں دکھ گئے۔

شام کو عابد صاحب، بھائی جان اور میں تینوں ڈاکٹر حمید کے ہاں گئے۔ ان سے چھ بجے کا وقت مقرر ہوا تھا وہیں قریب ہی ملک راج آنند اور انیل بھی رہتے ہیں۔ ہم پہلے ان کے ہاں گئے۔ ملک راج آنند انگریزی کے بڑے اچھے ناول نگار سمجھے جاتے ہیں۔ انیل کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتی ہے اور آرٹسٹ قسم کی لڑکی (عورت) ہے۔ ملک راج بہت معقول اور غیر متعصب اور ذہین آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے ایک پبلشنگ ہاؤس کھولا ہے جس میں انگریزی اور

اردو کی کتابیں شائع کرتے ہیں۔ کرشن چندر کی تازہ تصنیف ''ہم وحشی ہیں'' اس دن چھپ کر آئی تھی۔ میں نے لے کر دیکھی، اس کتاب کے دو افسانے مجھے بہت پسند ہیں ایک پشاور اکسپریس، دوسرا امرتسر۔ فیروز مستری جو کتب خانے کے منیجر اور منتظم ہیں وہاں موجود تھے۔ میرے فسادات سے متعلق افسانوں کا ذکر آیا۔ انھوں نے کہا ہم اسے چھاپنے کو تیار ہیں۔ میں نے افسانوں پر نظر ثانی اور ان کی نقل کرنا شروع کر دیا ہے۔ خدا کرے چھپ جائے۔ اب تو جی ایسا افسردہ ہو گیا ہے کہ امید نہیں ہوتی کہ پھر کبھی کتابیں چھپنے کی نوبت آئے گی۔ برسوں کی محنت اور کوشش کے بعد جو کتابیں چھپنی تھیں وہی جل کر خاکستر ہو گئیں.......... ڈاکٹر حمید کے ہاں گئے تو وہ ملے نہیں ریس میں گئے ہوئے تھے۔ ان کی بیوی بھی ملنے نہیں آئی کہلوا دیا کہ پھر آ جانا...... ہم آنے پر تیار ہوئے۔ ان کے لڑکے نے آ کر پوچھا آپ اب کب آئیں گے؟ کہا کل صبح..... بھائی جان نے کہا ہمیں ان سے کوئی بزنس کام تو ہے نہیں۔ ہم تو محض ملنے آئے تھے اب کبھی اگر ہمارا جی چاہا تو آ جائیں گے ورنہ ان کو غرض پڑے گی وہ خود آئیں گے۔ رات کو آٹھ بجے چھوٹے بھائی جان آئے اور بولے کہ فوراً تم سب میرے ساتھ آئس کریم کھانے کیفے ناز چلو........ عابد صاحب نے مجھے بہت منع کیا کہ نزلہ ہے تم نہ جاؤ، مگر چھوٹے بھائی جان کا اصرار تھا اور میں نہ جاتی تو وہ اور کسی کو بھی نہ لے جاتے اس لیے مجھے جانا پڑا۔ کچھ لوگ موٹر میں کچھ لوگ پیدل وہاں گئے۔ وہاں سے تقریباً آدھے بمبئی کی روشنیاں نظر آتی ہیں اور چوپاٹی صاف دکھائی دیتی ہے۔ وہاں آدمی ننھے ننھے سفید پتھر سے معلوم ہوتے ہیں اور روشنیاں ستاروں کی طرح چمکتی ہیں۔ باجی نے موٹر میں اور ہم سب نے کیفے میں جا کر آئس کریم، آلو کے سموسے کھائے اور اس کے بعد گھر واپس آ گئے۔

دوسری کو چہلم تھا۔ صبح سے پہلے ہم لوگوں نے اپنے کمرے بدلے۔ میں نے ایک چھوٹا سا کمرہ جو ڈریسنگ روم ہے، لے لیا اور وہاں اپنا سامان سجا دیا۔ بڑا کمرہ امن اور اور اظہر کے لیے خالی کیا گیا۔ اس کے برابر کا بھائی جان اور بھابھی جان کا ہے۔ تیسرا کمرہ جس میں پہلے میں تھی

تینوں بچیوں کا۔ گیارہ بجے امن، اکھن، بچے چچی اماں، امی جان، محسن، اس کی ساس نند اور بچے سب چہلم کی مجلس میں شرکت کے لیے آ گئے۔ کھانے کے بعد مجلس شروع ہوئی۔ انیس کا شاہکار مرثیہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' میں نے پڑھا تو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اکھن نے چہلم کے حال کی حدیث پڑھی۔ جب میں مرثیہ پڑھ رہی تھی تو کلثوم سایانی تعلیم بالغان کے ایک سینٹر میں مجھے لے جانے کے لیے آئیں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ میں چلوں گی میرا خیال تھا کہ مجلس سویرے ہو جائے گی۔ لیکن اس وقت مجلس چھوڑ کر میں کیسے جا سکتی تھی؟ برا تو بہت لگا کہ وہ بیچاری تو آئیں اور میں نہ گئی۔ مگر میرے بدلے چھادی چلی گئی اور شام کو چھ سات بجے کلثوم سایانی مع ایک صاحبہ کے جن کا نام مسز زرینہ کریم بھائی ہمارے ہاں آئیں۔ انھوں نے کہا مسز زرینہ بڑی قابل اور کام کرنے والی عورت ہے۔ صورت سے واقعی ذہین اور معقول عورت معلوم ہوتی ہیں اور اس قدر آہستہ بات کرتی ہیں کہ سمجھ میں مشکل سے آتی ہے۔

تین کو باجی اور عابد صاحب کو جانا تھا، صبح سے ان کے سامان کی درستگی میں مشغول رہی۔ شام کو بھائی جان نے مجیب صاحب کو بلایا تھا مگر وہ تشریف نہیں لائے کچھ خریداری کرنی تھی مگر وہ دونوں آئے تھے اور صابرہ کے چچازاد بھائی طیب بھی آ گئے تھے۔ رات کو ساڑھے نو بجے باجی اور عابد صاحب کو ریل میں سوار کرانے میں امن اسٹیشن گئے تھے۔ بھائی جان کو حرارت ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ نہیں گئے۔ اظہر دادر سے سیدھے اسٹیشن آ گئے تھے۔ ان دونوں کی سیٹیں تھیں۔ باجی اور عابد کا بستر کر دیا۔ آرام سے باجی کو لٹا دیا...... پونے گیارہ بجے گاڑی روانہ ہوئی...... برابر کے کمرے میں ڈاکٹر تاراچند تھے۔ وہ بھی الٰہ آباد جا رہے تھے۔ ایک درجے میں مجیب صاحب اور مسز حبیب تھے جو علی گڑھ جا رہے تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ کی وجہ سے عابد صاحب بجائے سیدھے دہلی جانے کے چکر کھا کر براہِ الٰہ آباد آ گئے۔ میرا تو ہرگز جی نہ مانتا تھا کہ عابد صاحب اکیلے ریل سے اس زمانے میں جائیں مگر کچھ تو ان لوگوں کے ساتھ کی وجہ سے زیادہ تر اس لیے کہ باجی ان کے ساتھ جانا چاہتی تھیں اور اس رستے جانے سے انھیں حفاظت سے علی گڑھ پہنچانا ممکن

تھا۔ عابد صاحب کو اس طرف سے جانا اور مجھے بھیجنا پڑا۔ آج ان کے علی گڑھ بخیر و عافیت پہنچنے کا تار آگیا ہے جس سے اطمینان ہوا۔ زمانہ ایسا سخت ہے سفر ایسا خطرناک ہوگیا ہے کہ جو سفر پہ جائے اس کی جان کی فکر دم پر بنا دیتی ہے۔ اب کل عابد صاحب غالباً دہلی روانہ ہوں گے۔ خدا ان کو خیر و عافیت کے ساتھ وہاں پہنچائے۔ سنتی ہوں کہ اب تک دہلی اسٹیشن پر ہزاروں ہزار رفیوجیز پڑے ہوئے ہیں اور اس لیے اسٹیشن غیر محفوظ ہی سمجھنا چاہیے۔ دہلی میں بھی ابھی تک امن نہیں۔ کچھ نہ کچھ قصہ جھگڑا ضرور ہو جاتا ہے، گاندھی جی حق اور انصاف کی لڑائی برابر لڑ رہے ہیں...... اس وقت ہندستان میں ایک ہی شخص ہے جو حق کی خاطر، انسانیت کے درد، انسانوں کے دکھ سے متاثر ہو کر اپنوں ہی سے لڑ رہے ہیں اور مسلمانوں کو ہندوستان میں بسانے اور امن و امان سے رہنے دینے کے لیے لوگوں کو مجبور کرتے اور سمجھاتے ہیں۔ انھیں اس کی پروا نہیں کہ لوگ کیا کہتے ہیں اور کیا کہیں گے، وہ تو حق کا ساتھ دینے والے اور انصاف کی حمایت کرنے والے سچے حق پرست کامل انسانوں میں سے ہیں۔

میں عابد صاحب کو ہرگز اکیلا دہلی نہ جانے دیتی۔ پچھلے چار مہینے تک برابر یہی سمجھتی رہی کہ بہر حال میں ان کے ساتھ رہوں گی خواہ یہاں خواہ دہلی خواہ کہیں اور۔ ان کے ساتھ، ان کے دوش بدوش میں ساری مشکلات اور مصائب خوشی سے جھیل سکتی ہوں مگر ان کے تھوڑے دن کی جدائی اور دوری مجھ سے نہیں سہی جاتی۔ خدا انھیں زندہ و سلامت رکھے اور زندگی بھر میں ان کی محبت اور قسمت کی دولت سے مالا مال رہوں۔ ان سے مجھے جو تقویت، جو طاقت جو سہارا ملتا ہے وہ دنیا میں اور کسی سے نہیں مل سکتا...... لیکن ان سب کے باوجود مجھے انھیں دہلی جانے کی نہ صرف اجازت دینی پڑی بلکہ اصرار کر کے آمادہ کرنا پڑا کہ وہ جلدی سے جلدی دہلی جائیں اور پچھلے چار ماہ کے ملکی حالات تباہی و بربادی قومی خاندانی اور ذاتی مصائب اور مشکلات تباہی و بربادی نے ان کی دل دماغ اور اعصاب پر بہت برا اثر ڈالا۔ اس عرصے میں وہ اپنا کوئی کام نہیں کر سکتے۔ سوچتے سوچتے اور غور کرتے کرتے کیا ہوگا، کیا کرنا چاہیے، کیا ہو سکتا ہے؟ ان کی صحت

خراب ہوگئی ہے، بے کاری اور بے عملی کے باعث یاس وقنوطیت کی سی کیفیت اکثر ان پر طاری رہتی تھی...... ان کی زبردست خواہش ہے کہ ایک اُردو کا اخبار نکالا جائے، جو مسلمانوں کی صحیح رہبری کرے جس کی اس وقت اشد ضرورت ہے۔ انھیں اس بات کا بھی شدید احساس ہے کہ وہ اپنی ذاتی مشکلات اپنی فطری جھجک اور اپنی زبان کی نقص کے باعث مسلمانوں کی رہبری لیڈر کی حیثیت سے نہیں کرسکتے۔ تقریر کرنا، لوگوں سے ملنا جلنا یہ ان کے بس کی بات نہیں لیکن اخبار کے ذریعے وہ قوم کی بہت خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ لیکن مالی مشکل سب سے زیادہ اس میں حائل ہے اور پھر دوسرے مسائل ہیں۔ بہر حال اب ذاکر صاحب سے مشورے کے بعد وہ طے کریں گے کہ کیا کرنا ہے؟ اسے لیے میں نے انھیں اصرار کر کے بھیج دیا کہ جب تک معاملہ یکسو نہ ہوگا اور یہ کام میں نہ لگیں گے ان کو سکون واطمینان نہیں ہوسکتا۔ میں خود دو باتوں کی وجہ سے اس وقت ان کے ساتھ نہ جاسکی ایک تو تین مہینے کی بیماری اور مسلسل کھانسی اور نزلے کے شدید دوروں کے باعث ڈاکٹروں نے سخت دہلی جانے کی مخالفت کردی ہے کہ مبادا پھر وہاں جا کر پھر وہی حال نہ ہو جائے۔ دوسرے مالی مشکلات اس وقت بہت سخت ہیں میرا اور عابد صاحب کا کام سب فی الحال رک گیا ہے اور اردو جو بظاہر شمالی ہند میں ختم ہوتی جارہی ہے اور ہم دونوں مزدور جو اسی ذریعے سے روزی کماتے تھے اب معلوم ہوتا ہے کہ بے روزگار بیٹھے رہیں گے، جو کچھ سرمایہ تھا وہ کتابی دنیا میں لگا ہوا تھا وہ مکتبہ جامعہ کے ساتھ جل کر راکھ ہو چکا جو علمی اور ادبی سرمایہ تھا اور اس کے ذریعے آمدنی ہوتی تھی وہ سب بھی جل گیا۔ اب تو دونوں خالی ہاتھ ہیں چند سو روپیہ بینک میں پڑا ہے جو دو چار مہینے بھی کام نہیں دے سکتا۔ اس لیے اس وقت دہلی جا کر گھر جما کر بیٹھنا اور سارے خاندان کا خرچ اٹھانا بہت مشکل ہے اور جب تک مستقبل کے گزر بسر کے لیے کوئی صورت نظر نہ آئے کم سے کم خرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے تو پچھلے تین مہینے میں (بیماری کے ناگزیر اخراجات کے سوا) اپنی ذات پر بہت ہی کم خرچ کیا ہے۔ سخت سے سخت ضرورت اور خواہشوں کو ٹالا۔ عابد صاحب بچارے تو یوں ہی کبھی اپنے پر کچھ خرچ نہیں کرتے البتہ لڑکیوں

(ہمن، بیگم وغیرہ) کے لیے جن کو اشد ضروری چیزوں کی ضرورت تھی وہ تو لینی پڑیں ہیں۔ دوسرے امداد اعزاء کی مد میں جو مقررہ خرچ ہے اب عابد کے سفرخرچ میں سوا سو روپے خرچ ہوگئے۔ حالانکہ آتے وقت ہم دونوں سو روپے میں آگئے تھے مگر اس مرتبہ تو کرائے بے حد بڑھ گئے ہیں۔ قریب قریب دگنے ہوگئے...... سبھی چیزوں کو آگ لگی ہے اور آمدنی کی صورت نظر نہیں آتی۔ پہلے کی پونجی یوں ختم ہوچکی۔ اللہ عزت کے ساتھ بسر کی کوئی صورت نکالنے والا ہے۔ اتنے بڑے خاندان کی ذمہ داریاں اور فرائض ہیں اور ایک غریب عابد کی جان ہے...... خدا انھیں اتنی ہمت اور طاقت اور صحت دے کہ اس بار کو خوبی سے اٹھا سکیں اور خدا مجھے اتنی استطاعت ایسے ذرائع اور صلاحیت دے کہ میں ان کے بوجھ کو بٹا سکوں۔ میرے سوا ان کے کون بوجھ بٹانے والا ہے؟ جائیداد نہیں، سرمایہ نہیں، کوئی بھائی نہیں، بیٹا نہیں۔ بس یا تو اپنے قوت بازو پر بھروسہ ہے یا خدا کی ذات پر۔ پر یہی دو بھروسے سب سے زیادہ قابل قدر اور قابلِ اعتماد ہیں۔

۴ر جنوری اتوار کے دن میں بھابھی اور بھائی جان کے ہمراہ پرتھوی راج کا بنایا ہوا کھیل پٹھان دیکھنے گئے۔ اس نے ایک تھیٹر کمپنی قائم کی ہے اور یہ اس کا تیسرا کھیل ہے۔ ہیرو کا کردار خود پرتھوی راج کرتا ہے۔ بے مثل ایکٹنگ ہے اور بے حد عمدہ ڈراما۔ مجھے بے حد پسند آیا اور بہت اثر ہوا......

پچھلے تین دن زیادہ وقت افسانے نقل کرنے میں بسر ہوئے۔ آج کل ٹہلنا بالکل نہیں ہوتا۔ جو وقت کام سے بچتا ہے وہ امن سے گپ شپ میں گزر جاتا ہے، ٹہلنے کے لیے کوئی ساتھ جانے والا بھی نہیں۔ دونوں بھائی دفتر سے دیر میں آتے ہیں اور تھکے ہوتے ہیں۔ امن اور بھابی تو کبھی ٹہلنے کا ارادہ ہی نہیں کرتیں۔ لڑکیاں بھی تامل کرتی ہیں اور پھر بھلا میں اکیلی کیا جاؤں؟ عابد صاحب کے ساتھ کبھی کبھی چلی جاتی تھی۔

کل بیگم کا خط اور اس کی کئی نظمیں اور غزلیں آئیں۔ بعض بہت اچھی ہیں۔ سعیدہ کا بھی خط آیا۔ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ کل اس کا جواب دوں گی۔

عابد صاحب نے حسب وعدہ تار کل ہی دے دیا تھا۔ آج اظہر دفتر گئے تو انھیں ملا۔ ان کا تار آنے کے بعد ایک طرف سے تو اطمینان ہوا لیکن جب دہلی پہنچنے کا تار آئے گا پورا اطمینان تب ہوگا جب دہلی پہنچے (اگرچہ امید اس کی ہیں جب کہ دہلی میں اب تک امن نہیں تو وہاں رہنے والوں کی طرف سے اطمینان کیسے ہوسکتا ہے)۔

سوا دس بج گئے۔ آج پچھلے چھ دن کا روز نامچہ لکھ ڈالا اب نیند سے آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں اور لکھتے لکھتے انگلیاں بالکل شل ہوگئی ہیں۔ بیس صفحہ صبح افسانے کے نقل کیے اور سات صفحے اس وقت لکھے آخر انگلیاں لوہے کی تو نہیں؟......

آج صبح دس بجے آشا دیوی سے ملنے بھائی جان کے ساتھ میں اور بھابی اندو متی من چن رواں کے ہاں گئے تھے۔ آشا دیوی سے آریہ ناٹیکم کی بیوی گاندھی جی کے ساتھ پرانی کام کرنے والی تعلیمی سنگھ کی سیکریٹری اور بڑی اچھی عورت ہیں۔ ہماری ان کی کئی برس پرانی ملاقات ہے۔ اندو متی یعنی میزبان کو تو کھیر صاحب نے کسی کام سے صبح ہی بلا لیا تھا اس لیے وہ موجود نہ تھیں ہم لوگ کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر آشا دیوی نے کھانا کھلایا، ہندوستانی طریقے سے ایک ایک چوکی سامنے، پیچھے بیٹھنے کے لیے چٹائی کے ٹکڑے۔ چوکی پر پیتل کے تھالی جن میں کئی طرح کی ترکاری، دال، سلاد، دہی مٹھائی وغیرہ تھی۔ کھانا گجراتی اور بڑی صفائی اور سلیقے سے کیا ہوا، ساڑھے گیارہ بجے بھائی جان اور آشا دیوی کو سکریٹریٹ میں اُتارا، جہاں بک ایجوکیشن کی میٹنگ ہونے والی تھی۔ کھیر صاحب اور اندو متی سے صاحب سلامت ہوئی۔ اندو متی لکھ پتی کی بیٹی ہے مگر تعلیمی کام کرتی ہے اور بہت سیدھے سادے طریقے سے رہتی ہیں کھدر کی سوتی ساڑی پہنے ہوئے تھیں۔

آشا دیوی سے زیادہ تر موجودہ فسادات وغیرہ کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے بتایا کہ دہلی کی حالت ایسی ہے کہ اگر ایک دن کے لیے گاندھی جی وہاں سے ہٹ جائیں تو جانے کیا ہو؟ کہنے لگی کہ گاندھی جی تو کہتے ہیں اب میں کچھ اور نہیں کروں گا بلکہ ساری زندگی یہی

حق اور انصاف کی لڑائی لڑوں گا۔ انھوں نے اپنے سارے اچھوت آدھار، گاؤں سدھار وغیرہ کے کام چھوڑ دیے ہیں اور حیوانوں اور وحشیوں کو انسان بنانے کا کام اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ خدا انھیں کامیاب کرے۔ ہندستانی مسلمانوں کی امید اور بھروسہ اس وقت خدا کے بعد انھیں سے وابستہ ہے......

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ دہلی کی حالت بہت نازک ہے......خود گاندھی جی کا خیال ہے کہ دہلی میں مسلمانوں کا اور خود جامعہ کا رہنا مشکل نظر آتا ہے یوں تو ہمیشہ ہی دہلی کی حالت اور وہاں کے مسلمانوں کی تباہی اور دہلی سے جدائی کے خیال سے دل کو سخت تکلیف ہوتی رہی ہے مگر آج گاندھی جی کا یہ خیال سن کر دھچکا لگا اتنا سخت صدمہ ہوا کہ بیان نہیں کر سکتی......صرف خدا کی ذات پر بھروسہ ہو سکتا ہے کہ وہ پھر ایسی کوئی صورت نکال دے کہ مسلمان اپنے ہزار برس پرانے محبوب شہر میں امن و امان کی زندگی بسر کر سکیں...... مجھے رہ رہ کر بار بار یہ خیال آیا کرتا ہے کہ جامعہ اور جامعہ والوں کی ابھی کیا قسمت ہے۔ ۲۷ برس میں ادارے کی لہو پسینہ ایک کر کے خدمت کی، تنکا تنکا جوڑ کر جو آشیانہ بنایا جس کی ترقی و بہبودی کے لیے اپنی انمول زندگیاں وقف کر دیں وہ اب کیسی مایوسی اور بے بسی کی سی حالت میں ہو گیا ہے۔ جو کام اب بڑھتا، پھلتا پھولتا......ستائیس برس کی انتھک محنت اور کوشش اب بارآور ہوتی وہ اس منحوس خانہ جنگی، نفرت اور تعصب اور غلط سیاست اور لیڈروں کی خودغرضانہ پالیسی کی بدولت اس حالت میں ہو گیا ہے کہ فی الحال تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ کچھ ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔ اور اگر خدا کرے اور دہلی میں امن و امان ہو جائے اور مسلمان وہاں رہ سکیں اور کام کر سکیں جن کی بظاہر کوئی امید نظر نہیں آتی تو جامعہ کا کام نئے سرے سے جمانا اور شروع کرنا پڑے گا......پچھلے سال نومبر میں جب جامعہ کی جوبلی ہو رہی تھی تو کیا کیا منصوبے تھے، کیسے کیسے بلند ارادے تھے، کیا کیا مقاصد پیش نظر تھے......کام کو کسی قدر وسعت دینے اور کامیاب ہونے کی امید تھی...... یہ خبر نہیں تھی کہ اب ایسا برا وقت آنے والا ہے۔

مولانا آزاد کا وہ پیام جو انھوں نے جوبلی کے موقع پر دیا تھا مجھے یاد آیا کرتا ہے کہ اب جامعہ کی مصیبت اور مشکلوں کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب جامعہ والے اطمینان اور آرام کے ساتھ اپنا کام کرسکیں گے۔ یہ خبر نہ تھی کہ یہ قومی حکومتیں اتنی ناکامیاب ہوں گی۔ آزادی ایسی مہنگی پڑے گی، اہلِ وطن آزاد ہو کر وحشی جانور بن جائیں گے جو سچے قومی کاموں اور قومی اداروں کو بھی تباہ کرنے سے باز نہ آئیں گے؟ یا اللہ کیا ہوگا؟ تو ہی مدد کرنے والا ہے...... تیری ہی ذات سے امید کا آخری تار وابستہ ہے۔ وہی اس تاریکی میں روشنی کی آخری کرن پیدا کرسکتا ہے۔

۱۰ر جنوری

رات ڈائری لکھ رہی تھی کہ امن آگئیں اور باتیں کرنے لگیں اور لکھنا رہ گیا۔ آج عابد صاحب کا خط آیا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ علی گڑھ میں امن وامان ہے دو ہزار کے قریب لڑکے یونیورسٹی کالج وغیرہ میں ہیں اور لوگ مطمئن ہیں مگر عام رائے یہ ہے کہ علی گڑھ کو سوائے ذاکر صاحب کے کوئی نہیں سنبھال سکتا...... خدا کرے کہ ذاکر صاحب مان جائیں اور علی گڑھ کالج جامعہ دونوں کو ملا کر مسلمانوں کا ایک عظیم الشان تعلیمی مرکز بنا دیں جو ان کی تہذیبی اور سیاسی رہنمائی بھی کرسکے، اگر چہ پیاری دلّی کا چھٹنا اور جامعہ نگر سے دور ہونا بڑی تکلیف دہ اور دردناک بات ہوگی مگر زمانہ ہی ایسا خراب ہے جب دہلی میں مسلمانوں کا رہنا ناممکن ہوا جا رہا ہے تو وہاں کو تعلیمی کام خوبی سے کرنا تو اور بھی مشکل ہوگا اب تو صرف یہی ایک راستہ نظر آتا ہے کہ علی گڑھ کو مسلمانوں کا مرکز بنایا جائے۔ اگر چہ جامعہ کی پیدائش بھی تو وہاں کی ہی ہے۔ یہ سچ ہے کہ دہلی میں وہ پروان چڑھی، اس نے بڑی شاندار کامیابی حاصل کی، بڑی قابلِ قدر خدمات انجام دیں، اس کی ہزاروں ایکڑ زمین، اس کی خوبصورت عمارتیں، اس کی محل وقوع کی دلکشی، جگہ، دہلی میں ہے۔ یہ کیا کیا جاسکتا ہے۔؟

عابد نے لکھا ہے یہاں سب کی رائے یہ ہے کہ مکتبہ علی گڑھ میں قائم کیا جائے اور اخبار

یہیں سے نکالا جائے لیکن فیصلہ ذاکر صاحب کی رائے پر ہوگا۔ ایسا ہوا تو مجھے اپنا پیارا مختصر سا خوبصورت گھر چھوڑنا پڑے گا...... جسے میں نے کن کن مشکلوں اور دقتوں سے بنوایا ہے جو میری پسند کا ہے، میرے آرام کا گھر ہے جس کی ایک ایک چیز بنوانے اور بنانے میں اپنی جان کھپائی ہے، اسے چھوڑ کر علی گڑھ کے کوئی بدہیئت، بدوضع، بے آرام گھر میں رہنا ہوگا...... مجھے اپنے گھر کے سلسلے میں اکثر ثاقبؔ کا یہ شعر یاد آیا کرتا ہے جو انھوں نے جامعہ نگر میں جامعہ کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھے جانے کی تقریب کے موقع پر کیا تھا:

مکاں منعم کا سونے سے یہ خونِ دل سے بنتا ہے
خس و خاشاک کا گھر بھی بڑی مشکل سے بنتا ہے

یہ شعر نہ صرف جامعہ کی عمارت پر بلکہ وہاں جامعہ والے کے اپنے گھر پر بھی لفظ بلفظ صادق آتا ہے۔ ایسا گھر چھوڑنا آسان کام ہے؟ اور پھر اہلِ جامعہ کا ساتھ، جامعہ نگر کی بستی کو چھوڑ کر علی گڑھ والوں میں جا کر رہنا؟ جس کی ثروت پسندی، دولت پرستی، فیشن کی دلدادگی، جن کی نمائش و نمود کی عادت، جن کی تنگ دلی اور تنگ دماغی سے عذر مانگتے تھے۔ ممکن ہے کہ اب یہ فضا کم ہوگئی ہو...... سنتی ہوں کہ سیاسی خیالات وہاں بدل رہے ہیں اور اب وہ ابتری اور بیہودگی نہیں جو ضیاء الدین[1] کے زمانے میں تھی...... لیگ کی پرستاری بھی ختم ہوئی...... مگر طبیعت اور دل اور عادتیں بدلنے میں بہت دیر لگتی ہے...... اگر سارا جامعہ، ذاکر صاحب اور جامعہ کی ساری برادری علی گڑھ منتقل ہو جائے تو پھر تو خیر...... لیکن تنہا وہاں جا کر رہنا! اس خیال سے مجھے وحشت ہو رہی ہے...... دیکھیے کیا فیصلہ ہوتا ہے، بہر حال عابد کی خواہش اور مرضی کا خیال رکھنا سب سے ضروری ہے اگر علی گڑھ میں رہ کر اپنا اخبار نکال کر مطمئن اور خوش رہ سکیں تو میں اور سب اپنے پر جھیل لوں گی......

آج شام ناشر اور مسز ناشر بھائی جان سے ملنے آئے تھے، مجھے بھی بھائی جان نے ان سے ملوایا وہ یہاں انگریزی کا ایک بہت بڑا پبلشنگ ہاؤس چلا رہے ہیں۔ ایک اخبار ہفتہ واری

[1] ڈاکٹر ضیاء الدین علی گڑھ وائس چانسلر

Indral ان کے ہاں سے نکلتا ہے جو تھوڑے عرصے میں بے حد مقبول ہوا جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کی قیمت بہت کم ہے۔ مسز ناشر بڑی ذہین اور قابل عورت معلوم ہوتی ہیں مگر بولتی بہت ہیں اور ناک میں بولتی ہیں جس سے آواز بہت ناگوار سی معلوم ہوتی ہے۔ مسز ناشر بھی اچھے معقول آدمی معلوم ہوتے ہیں ان لوگوں کا ارادہ اردو کی کتابیں چھاپنے کا بھی ہے۔ اگر میرا نیا ناول یہ شائع کریں تو بڑا اچھا ہو۔

آج صبح مسز کریم بھائی اور مسز اسمٰعیل سے میں، بھائی جان اور زہرا[۱]، بلقیس[۲] ملنے گئے تھے۔ دونوں بہت معقول اور کام کرنے والی عورتیں ہیں۔ مسز اسمٰعیل کا دماغ کچھ بھولا بھالا سا لگتا ہے۔ جانے کیا وجہ ہے انھوں نے ایک اسپتال بچوں کے ہڈیوں وغیرہ کی خرابی دور کرنے کا کھولا ہے...... ایسا اسپتال ہندوستان میں صرف مدراس میں ہے اور کہیں نہیں۔

شام کو باچھو[۳] نے پیوپلز تھیٹر کے امن پروپیگنڈہ کا پروگرام دکھانے کے لیے بلایا تھا، جو وہ ہر ہفتے کرتے ہیں۔ اس میں گانے، چھوٹے چھوٹے ڈرامے وغیرہ ہوتے ہیں اور کوئی ٹکٹ لوگوں سے نہیں لیا جاتا، جس کا جی چاہے آئے بیٹھے، دیکھے سنے اور جب جی گھبرائے چلا جائے...... آج کئی گانے ہوئے جن میں سے دو بہت اچھے تھے۔ پریم ایک شخص ہے جو گیت کہتا بھی ہے اور گاتا بھی ہے۔ آواز بہت اچھی اور پرسوز ہے، لیکن منہ بہت برے برے بناتا ہے اور لمبے لمبے بال بڑھا رکھے ہیں جو بہت برے لگتے ہیں۔ باچھو کا ایک ڈرامہ ''چودہ گولیاں'' بجائے اسٹیج پر ہونے کے اس طرح ہوا جیسے ریڈیو پر ہوتا ہے۔ بات یہ تھی کہ یہی ڈرامہ اگلے اتوار کو باقاعدہ اسٹیج پر ہو رہا ہے۔ اور آج پورا سامان فراہم نہ ہوا تھا۔ اس ڈرامے میں کشمیر کے امر شہید مقبول شیروانی کی شہادت کا حال بیان کیا گیا ہے جنھیں آفریدی حملہ آوروں نے انتہائی بے دردی سے شہید کیا اور ایک جواں مرد نے ایسی بہادری سے جان دی جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔

---

۱ زہرہ سیدین، سیدین صاحب کی بڑی لڑکی ۲ بلقیس ان کی چھوٹی بیٹی ۳ خواجہ احمد عباس

۱۳؍جنوری

آج نو بجے بھائی جان کا تار ملا جس میں انھوں نے اپنے اور عابد کے علی گڑھ سے بخیریت پہنچنے کی اطلاع دی تھی۔ تار آنے کے بعد بھائی جان نے بتایا کہ اخبار میں خبر تھی گیارہ کو دہلی اسٹیشن پر ایک بم پھٹا جس سے بارہ آدمی مر گئے۔ موٹریں ٹوٹ گئیں وغیرہ وغیرہ۔ شکر ہے کہ انھوں نے پہلے سے یہ نہیں کہا تھا ورنہ خدا جانے پریشانی سے میرا کیا حال ہوتا پھر بھی کتنی دیر دل دھڑکتا رہا...... دس بجے عابد صاحب کا خط اور پھر شام کو تار ملا جس سے پتہ چلا کہ وہ دہلی گئے تھے۔ اللہ نے ان کی جان بچائی۔ ہے ہے اگر خدا نہ کرے گیارہ کو گئے ہوتے!! میرا تو منہ نہیں کہ میں اپنے رحیم و کریم مالک کا شکر ادا کر سکوں۔ اس نے سارے عزیزوں، دوستوں کی جانیں اس پر آشوب اور بدترین زمانے میں ایک معجزے کی طرح بچائی ہیں۔

عابد نے لکھا ہے کہ ذاکر صاحب کی رائے علی گڑھ سے اخبار نکالنے کی نہیں وہ کہتے ہیں کہ بمبئی اور لکھنؤ سے نکلنا چاہیے...... لیکن آخری فیصلہ دہلی جا کر ہوگا.......... دیکھیے کیا فیصلہ ہوتا ہے؟...... میری طبیعت بہت الجھ رہی ہے...... کل رات اعلان ہوا کہ گاندھی جی ہندو و مسلمان اتحاد کے لیے برت رکھ رہے ہیں خدا انھیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے اور انھیں زندہ رکھے۔ اس وقت ہم ہندوستانی مسلمانوں کو خدا کی ذات کے سوا اگر کسی اور پر بھروسہ ہے تو وہ ان پر ہے...... وہ خدا نہ کرے نہ ہوئے تو ہندوستان میں مسلمانوں کو مخالف اور دشمن پیس کر رکھ دیں گے۔ پنڈت جواہر لال بے حد انصاف پسند اور روادار انسان ہیں مگر ان کی حکومت گاندھی جی کے ہی بل پر چل رہی ہے اور گاندھی جی کی مدد نہ ہوتی تو وہ شاید اس وقت تک اگر ختم نہ کیے جا چکے ہوتے تو ان کی حکومت تو فسادی اور مخالف ہی ختم کر دیتے تاکہ وہ جی کھول کر مسلمانوں پر ظلم کرے اور پاکستان کا بدلہ اور پاکستان بنائے جانے کا انتقام اچھی طرح لے سکیں۔ جب سے یہ سنا ہے جی پریشان ہے اور دل سے یہی دعا نکل رہی ہے کہ خدا گاندھی جی کو کامیاب کرے۔ آج تفصیل سے

ان کے برت شروع کرنے کا ذکر آیا اور ان کا مفصل بیان بھی۔ پڑھنے کے قابل۔ ایک سچے خدا پرست اور حقیقی مصلح ہی کے منہ سے ایسی باتیں نکل سکتی ہیں اور ایسا ہی آدمی قوم کی خاطر انسانیت کے لیے اپنی جان کی بازی لگا سکتا ہے۔

آج شام بیٹھ کر بھابی، بہن[1] اور بیگم[2] کو خط لکھے۔ آج پانچ چھ مہینے بعد بھابی قدسیہ کا خط آیا تھا، وہ بیچاری بھی پریشان اور افسردہ ہیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ رام پور سے نوکری چھوڑنے کے بعد زیدی صاحب کہاں جائیں۔ پہلے تو یہ طے ہو چکا تھا کہ وہ دہلی آکر رہیں گے اور کام کریں گے لیکن اب حالات نے دہلی کو تو اس قابل رکھا نہیں کہ کوئی بھی مسلمان وہاں امن اور اطمینان سے رہ سکے جو ہیں وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر رہ رہے ہیں، ہزاروں مشکلات سہہ رہے ہیں۔ آج شام میں اور امن پھر کچھ دور ٹہلنے گئے تھے سیدہ[3] اور انور[4] کینڈر گارٹن میں داخل ہو گئے ہیں، دو دن سے خوشی خوشی جا رہے ہیں۔ فیس بہت ہے۔ تیس روپے فی بچہ!!!

۱۴ر جنوری

آج سارے دن عابد کے خط کا انتظار رہا مگر نہیں آیا۔ شام کو ان کو خط لکھ کر ڈلوایا ہے۔ کل ڈاک سے نکلے گا، شاید کل ان کا خط آئے۔ آج ناصر کا دہلی سے خط آیا، ۸ کا ملا ہوا، لکھا ہے کہ جامعہ میں لڑکے بہت کم آئے ہیں۔ دہلی کے حالات ٹھیک نہیں وغیرہ وغیرہ۔

گاندھی جی کے برت کو آج دوسرا دن تھا۔ سارے ہندستان میں ان کی طرف سے اظہار پریشانی کیا جا رہا ہے۔ کل دہلی میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوگا جس میں پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد بولیں گے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ خدا کرے دہلی میں امن و امان ہو جائے اور گاندھی جی کا برت کھل جائے۔ آج دن بھر دل پریشان سا رہا۔ اس بلڈنگ میں کئی گھروں میں سندھ سے پناہ گزیں عورتیں آئی ہیں سیکڑوں من اسباب کے ساتھ۔ امن بہت پریشان ہوئیں کہ جی ڈرتا ہے

---

[1] سیادت فاطمہ [2] سیدہ فرحت [3] انور عباس [4] سیدہ سیدین حمید

کہ یہ لوگ گڑ بڑ نہ کریں۔ میں نے کہا یہاں کچھ نہیں کریں گے.......... بہر حال خدا مالک ہے ڈرنے سے کیا ہوتا ہے۔ بمبئی میں کل اور پرسوں کچھ گڑ بڑ رہی جو غالباً سندھ کے بھاگے ہوئے لوگوں کی وجہ سے ہے۔

آج پھر پانی پت والا مضمون لکھنے کی کوشش کی مگر کچھ لکھا ہی نہیں جا سکا کل اور دیکھوں گی۔ اگر نہ لکھا گیا تو اس کا خیال چھوڑ دوں گی۔ کوئی بھی چیز زبردستی نہیں لکھنا چاہیے جب تک اندر سے نچ نہ ہو۔ ایک بات یہ بھی ہوتی ہے کہ لوگوں کی بات چیت گپ شپ کے باعث توجہ ایک طرف کو مرکوز نہیں ہو سکتی اور اس گھر میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں بالکل الگ بیٹھ کر لکھا جا سکے۔

انگریزی کا ایک طویل افسانہ "A Monk" پڑھا۔ کل ایک اور افسانہ Letters of women پڑھا تھا کل اس کا تیسرا افسانہ پڑھنے کا ارادہ ہے۔ دن کا بیشتر حصہ پڑھنے اور ریڈیو پر خبریں سننے اور اخبار پڑھنے میں گزرا۔ شام کو چند منٹ کو نیچے ٹہلنے گئی تھی مگر جلدی واپس آ گئی۔ بھائی جان کی غیر موجودگی میں آدھی تہائی رونق بھی نہیں رہتی۔ اظہر تو صبح کو گھر سے جاتے ہیں تو اکثر رات کو واپس آتے ہیں۔ عابد کے یہاں نہ ہونے کی وجہ سے یوں بھی جی اداس اور فکر مند رہتا ہے۔ بھابی قدسیہ، عابد، بہن اور بیگم کو آج خط بھیجے ہیں۔ رات کے گیارہ بجے ہیں۔ سب لوگ سو گئے ہیں، مگر میری آنکھوں میں نیند کا پتا نہیں...... تین چار راتیں بیشتر حصہ جاگتے گزر رہا ہے۔ دن میں کچھ نیند آ بھی جاتی ہے مگر رات کو دو دو، تین تین یوں ہی بج جاتے ہیں۔ پھر کمرے میں تنہائیوں سے بھی دہشت ہوتی ہے اور دوسرے کے ساتھ کسی اور کمرے میں گھبراہٹ ہوتی ہے۔ اظہر، امن، بھابی سب کا اصرار ہے کہ ہمارے کمرے میں سو رہو مگر میں نہیں مانتی۔ اپنے کمرے میں جب تک چاہوں پڑھ سکتی ہوں، چپ چاپ پڑی رہوں یا اٹھوں یا بیٹھوں کسی اور کو تکلیف تو نہیں ہوتی۔ دوسرے کے کمرے میں سونے کے معنی یہ ہے کہ میری ان کے اٹھنے، خراٹے لینے، کروٹ لینے سے نیند خراب ہو اور میری حرکتوں سے ان کی۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ اپنی اس کوٹھری ہی میں رہا جائے۔

۱۵ر جنوری

دن میں تھوڑا وقت پڑھنے کچھ لکھنے اور دیر سے سونے کے علاوہ دن کا بیشتر حصہ بھابھی اور امن سے گپ شپ میں گزرا۔ عابد صاحب کا خط آج بھی سخت انتظار کے باوجود نہیں آیا اس کی وجہ سے جی پریشان اور طبیعت ہر کام سے اچاٹ تھی۔ دس بجے، بارہ بجے، اور چار بجے غرض سارا دن، چاروں ڈاک کے وقت انتظار ہی انتظار میں کٹ گئے۔ خدا کرے وہ بخیر و عافیت ہوں۔ مجھے تو رہ رہ کر یہ فکر ہو رہی ہے کہ دہلی کی حلات جتنی خبروں میں بتائی جاتی ہے اس سے زیادہ خراب نہ ہو کہیں ایسا تو نہیں کہ اوکھلے سے ڈاک نکلنی بند ہوگئی ہو۔ خدا نہ کرے...... گاندھی جی کا فاقہ جاری ہے ان کی کمزوری بڑھتی جا رہی ہے۔ آواز نحیف ہوگئی ہے...... دہلی کے لیڈر اور صاحبِ اثر لوگ انتہائی کوشش امن قائم کرنے کی کر رہے ہیں مگر دہلی تک میں ابھی تک کوئی اثر نہیں ہوا۔ غضب یہ ہوا کہ پاکستان میں پہلے ہی کراچی میں سکھوں پر سخت حملہ ہو چکا ہے، اب گجرات میں رفیوجیز کی ایک ٹرین پر پٹھانوں نے سخت حملہ کیا اور سنا ہے کہ دو ہزار میں سے ایک ہزار آدمیوں کو مار ڈالا اس کا اثر وہیں پر اور بھی برا پڑا...... خدا جانے کیا ہوگا! کیا ہونے والا ہے! مولا تو ہی مدد کرنے والا اور ہم بے کسوں، بے بسوں کا ساتھی ہے...... اس وقت عابد صاحب ہوتے تو بہت تقویت رہتی...... ان کے ساتھ رہ کر، پریشانی، فکر، موت، زندگی بس گوارہ ہے لیکن وہ اتنی دور پر خطر شہر میں...... میں یہاں...... خدا خیر کے ساتھ ملائے......

۱۶ر جنوری کو بھی سارا دن سخت انتظار کیا مگر عابد کا خط نہیں آیا...... بھائی جان کا خط آیا مگر اس میں عابد صاحب کا کوئی ذکر نہ تھا۔ میرا اضطراب اور پریشانی میں اضافہ ہوا۔ عابد کو تو یہ عادت ہی نہیں کہ کبھی خط میں دیر کریں۔ کہیں خدا نہ کرے بیمار نہ ہوں، زخمی نصیب دشمناں نہ ہو گئے ہیں...... غرض ایسے برے برے وہموں نے ستایا جس کی حد نہیں...... سارا دن یونہی گزر گیا...... بڑی مشکل سے اپنے کو اس پر آمادہ کیا کہ دو ایک صفحے مضمون کے لکھوں، ایک خط عابد کو لکھا۔

بارے شکر ہے کہ شام کو ۷ بجے بھائی جان دہلی سے آئے اور عابد کا خط لائے۔ جامعہ کے حالات معلوم ہوئے۔ سب کی خیریت ملی۔ دہلی کے مفصل حالات سنے، گاندھی جی کے برت سے وہاں سب لوگ پریشان ہیں اور انتہائی کوشش اس کی ہو رہی ہے کہ امن قائم ہو جائے اور گاندھی جی فاقہ توڑ دیں......

عابد صاحب نے لکھا ہے کہ ذاکر صاحب اس پر تیار ہو گئے ہیں کہ اخبار عابد نکالیں۔ یہ مسئلہ زیر غور ہے کہ کہاں سے؟ دہلی کی حالت خدا نے ٹھیک کیا اور ٹھیک ہوگئی تو وہاں سے نکلے گا ورنہ علی گڑھ یا بمبئی سے۔ بھائی جان نے بتایا کہ ذاکر صاحب کچھ عرصہ اور علی گڑھ کو سنبھالنے کو تیار ہیں، اس شرط پر کہ بھائی جان بھی وہاں جائیں اور کچھ عرصے بعد وہ وہاں کے وائس چانسلر ہو جائیں۔ بھلا بھائی جان کو ذاکر صاحب کے ساتھ رہنے سے کب انکار ہو سکتا ہے۔ کل رات آدھ گھنٹے کے لیے امن کے ساتھ دادر سب سے ملنے گئی امن رہ گئیں، میں اور اظہر واپس آ گئے۔ وہاں عذرا کا سر لگ کر میری قیمتی عینک کا فریم ٹوٹ گیا جس کا بڑا افسوس ہوا۔ اب وہ بدلوانے بھیجا ہے اور پرانی عینک لگا رہی ہوں جس سے آنکھوں پر بہت زور پڑتا ہے۔

آج صبح عابد کا ۱۲ر کا لکھا ہوا ایئر میل کا خط ملا۔ خدا جانے کیا قصہ ہے کبھی تو بالکل ٹھیک وقت پر مل جاتے ہیں اور کبھی اتنی دیر ہو جاتی ہے۔ کل میں نے پریشانی میں انھیں ایک گھبراہٹ کا خط لکھ دیا تھا۔ آج دوسرا خط لکھ کر ان کا اطمینان اور کل کے خط کی تلافی کر دی ہے۔ آج اظہر (بھائی کا لڑکا) کے خط کا جواب دیا جس نے ہم سب کی خیریت پشاور سے پوچھی تھی اور ابھی یہ ڈائری لکھتے ہوئے خیال آیا کہ میں نے اسے خط تو پشاور لکھا اور اس میں کراچی کے دوستوں اور عزیزوں کی خیریت اور حالات معلوم کیے۔ یہ بالکل دھیان ہی نہیں کیا کہ وہ پشاور میں ہے کراچی سے اس کا کیا تعلق؟ واقعی آج کل دماغ کچھ بے کار سا ہو رہا ہے۔

آج گاندھی جی کے برت کا پانچواں دن ہے۔ ڈاکٹروں کا بیان ہے کہ ان کی کمزوری بڑھ رہی ہے۔ سر بھاری ہے اور اگر اگلے چوبیس گھنٹے میں بھی فاقہ نہ توڑا گیا تو خطرہ بہت بڑھ جاتا

ہے۔ دہلی میں تمام بڑے لیڈر اور ہزاروں دوسرے آدمی جان توڑ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح شہر دہلی میں مکمل امن ہو جائے اور گاندھی جی کی قیمتی جان بچ جائے۔ روز جلوس نکالے جاتے ہیں، ہندوؤں، سکھوں سب کی طرف سے، جلسے ہوتے ہیں، تقریریں ہوتی ہیں، ریڈیو پر تقریریں ہوتی ہیں......

لیکن گاندھی جی اوپری امن اور اطمینان نہیں چاہتے، وہ جھوٹی تسلیوں میں آنے والے انسان نہیں ہیں۔ وہ سچے اور حقیقی امن کے خواہاں ہیں۔ آج انھوں نے اپنی سبھا میں جو پیام دیا اس میں صاف کہا کہ کوئی مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرے۔ مجھے بعض لوگ (مسلمان) صحیح خبریں پہنچاتے رہتے ہیں۔

آج انھوں نے مولانا آزاد کی معرفت دہلی کی پبلک کے سامنے سات شرائط پیش کی ہیں کہ اگر یہ پوری ہوں گی تو وہ فاقہ توڑ دیں گے...... پہلی یہ کہ دلّی میں مہرولی میں قطب صاحب کے مزار پر جو عرس ہوتا ہے وہ ضرور ہو اور وہ امن وامان سے گزر جائے۔ عرس حال ہی میں ہونے والا ہے۔ دوسرے دہلی کی سب مسجدیں جن پر غیر مسلم قابض ہیں یا وہ مندر بنالی گئی ہیں مسلمانوں کو واپس کی جائیں۔ تیسرے مسلمان شہر میں امن و امان اور اطمینان کے ساتھ ہر جگہ آجا سکیں۔ چوتھے ہر محلے میں مسلمان رہ سکیں، پانچویں سفر بے کھٹکے کر سکیں۔ چھٹے پاکستان سے دلّی کے جو مسلمان واپس آنا چاہیں وہ آکر پھر یہاں آباد ہوں۔ ساتویں شرط مجھے یاد نہیں رہی...... یہ شرطیں کوئی ایسا شخص نہیں کر سکتا جو کسی بہانے اپنا روزہ توڑنا چاہتا ہو۔ بظاہر شرطیں (موجودہ صورت حال میں) ایسی کڑی ہیں جو پوری ہو جائیں تو معجزہ سمجھنا چاہیے...... وہ دلّی جہاں کوئی مسلمان کسی جگہ بے کھٹکے نہیں آجا سکتا اور رہ نہیں سکتا وہاں ایسا امن وامان ہو جائے گا؟ خدا میں تو بڑی قدرت ہے۔ وہ چاہے گا تو گاندھی جی کے اس اعلیٰ مقصد اور پُرخلوص آرزو کو پورا کرنا اس کے لیے کیا مشکل ہے۔ بظاہر کچھ امید تو بندھتی ہے۔ دلّی میں آج بڑے بڑے جلوس نکلے اور کچھ لوگ گاندھی جی کے پاس اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے آئے...... پاکستان سے بھی بعض لوگوں نے متاثر

ہو کر گاندھی جی کے اس عظیم الشان قربانی کا اعتراف کیا ہے۔ غضنفر علی خان، خواجہ ناظم الدین، فیروز خان، لون وغیرہ نے کچھ بیانات دیے ہیں۔ مگر مسٹر جناح جو ہندستان کے مسلمانوں کو تباہ کرنے ان پر ظلم وستم توڑوانے کا سبب بنے ان کے جھوٹے منہ سے ایک کلمہ حق نہ نکلا اور لیاقت علی خاں جن کے زیر حکومت پاکستان میں ہندو سکھوں پر انتہائی مظالم ٹوٹے اور اس کا نتیجہ ہندستان کے مسلمانوں کو بھگتنا پڑا اور پڑ رہا ہے ان کو بھی یہ توفیق نہ ہوئی کہ اس انسانیت کے سچے دوست اور حق پرستار انسان کی اس کارنامہ کا ذکر کرنے میں مسلمانوں کی بھلائی حفاظت اور امن کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دی ہے وہ کام جو مسلمان کو کرنا چاہیے تھا...... جو محمدؐ کے پیرو کہتے ہیں اپنے کو حسین کے ماتم دار کہتے ہیں ان سے کچھ نہ ہوا...... اور جس شخص کو وہ کافر بت پرست دشمن اور مخالف کہتے تھے وہ ان کے لیے اپنی جان دے رہا ہے کیسا ناسمجھ ہوتا ہے انسان بھی...... دوست کو دشمن اور دشمن کو دوست سمجھ کر اندھے کوئیں میں گر جاتا ہے...... آج اگر مسلمانوں نے گاندھی جی کو دشمن نہ سمجھا ہوتا، مولانا آزاد کی رہبری میں اپنا سیاسی مستقبل متعین کیا ہوتا اور گاندھی جی کے مشوروں پر عمل کرتے تو اس مصیبت اور تباہی میں نہ پڑے ہوتے۔ وہ قائداعظم جن کے نام کا کلمہ پڑھتے تھے اطمینان اور آرام سے پاکستان میں بیٹھے ہیں اور کوئی اس کی فکر نہیں کہ یہاں ساڑھے چار کروڑ پر کیا بیت رہی ہے۔ اگر انھوں نے حکومت ہندوستان سے یہی رویہ رکھا اور وہاں کے ہندوؤں اور سکھوں کو مصیبت سے نہ بچایا تو اور بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ اور گاندھی جی جی...... یہاں ہندوستان میں...... مسلمانوں کی خاطر اپنی جان دینے پر تلے ہیں...... اس لیے کہ وہ سچے دل سے یہ محسوس کرتے ہیں۔ ان مسلمانوں پر ظلم اور سختی کرنا حق اور انصاف کے منافی ہے اور ان کا شریف دل اور پاک ضمیر ناانصافی، ظلم اور حق تلفی کوئی برداشت نہیں کر سکتا وہ صاف کہتے ہیں کہ ایسے ہندوستان میں زندہ رہنے سے میں مرنا بہت اچھا سمجھتا ہوں......

واقعہ یہ ہے کہ اتنا بڑا کام ولی اللہ انسان ہی کر سکتا ہے......

یا اللہ......! گاندھی جی کو اپنے مقصد، اپنے مشن میں کامیاب ہو کر ہند کے مسلمانوں کو امن

اور اطمینان دے...... گاندھی جی کی جان بچا دے۔ اور ساتھ ہی ان بدنصیب مسلمانوں کو سچا مسلمان بنا دے۔ سچی انسانیت، سچی انسانی محبت، حقیقی رواداری، حق پرستی، شجاعت اور رحم دلی عطا کر...... انھیں توفیق دے کہ یہ اپنے محبوب اور محترم ہادی اپنے پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کو سمجھیں، یہ ان کی سیرت پر غور کریں، یہ آلِ نبی اور ائمہ اطہار کے نقشِ قدم پر چلیں...... یہ قرآن کو پڑھیں...... سمجھیں...... ان کی تعلیم پر عمل کریں...... اس دین فطرت پر غور کریں جو دنیا کا سب سے بہتر سب سے معقول دین ہے...... آج جس کو بھلانے کی، جس کو نہ سمجھنے کی بدولت وہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہیں مسلمان کی رٹ لگانے، اسلامی ریاست کا راگ الاپنے سے کیا کوئی مسلمان بن سکتا ہے...... یہ ہرگز نہیں...... خدایا ہم پر رحم کر...... ہم بھول جائیں تو معاف کر، ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جسے نہ اٹھا سکیں...... ہمیں نیک، پاکباز، شریف، ایماندار بنا......
آمین ثم آمین......

الحمد للہ گاندھی جی کا برت کل کھل گیا...... ان کی ساری شرطوں کو لفظ بالفظ لوگوں نے مان لیا۔ دلّی کے دو لاکھ آدمیوں نے ایک عہد نامہ پر دستخط کیے کہ ہم امن و امان سے رہیں گے، ایک سو سے زیادہ لیڈروں، افسروں وغیرہ نے جن میں سکھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے معذور، ضروری لوگ بھی تھے، ایک حلف لیا کہ ہم لوگ ہرگز ہرگز شہر میں گڑبڑ نہ ہونے دیں گے اور گاندھی جی نے جو شرطیں کی ہیں ان کو پورا کریں گے...... سارے ملک میں گاندھی جی کے برت کا اثر بہت اچھا ہوا...... یہ گاندھی جی کے برت کی ہی وجہ تھی کہ سندھ اور گجرات میں ہندو سکھوں پر حملے ہوئے اور دہلی محفوظ رہا۔ ایسا تو ایک ایک جان کے بدلے کئی کئی جانیں دہلی اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جا چکی ہوتیں...... ساری دنیا، سارے ہندوستان، حتیٰ کہ پاکستان تک میں گاندھی جی کی طرف سے فکر تھی اور اب ہر طرف سے مبارکباد اور مسرت کے پیام آرہے ہیں...... ساری دنیا گاندھی جی کے اس معجزے کا اعتراف کر رہی ہے کہ انھوں نے کسی طرح لاکھوں آدمیوں کو جو ہر وقت خون خرابہ پر آمادہ اور مسلمانوں کے جانی دشمن تھے امن اور اتحاد کا سبق نہ صرف پڑھایا بلکہ

ان کے دل تک اُتار دیا...... بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے یا خدانہ خواستہ یہ وقتی بات اور گاندھی جی کو محض دھوکا دینے کی ناکام کوشش ہے...... گاندھی جی نے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر پھر کوئی گڑبڑ ہوئی تو میرا جو جی چاہے گا کروں گا...... گاندھی جی نے اس زمانے میں جو بیانات اور تقریریں کی ہیں وہ سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ انھوں نے اپنے قول اور عمل دونوں سے ثابت کر دیے کہ وہ اہنسا کے سچے پجاری ہیں اور انھوں نے اس وقت جس ہتھیار سے کام لیا ہے، وہ جس حربے کے مالک ہیں وہ ایٹم بم سے کہیں زیادہ کارگر ہے وہ ملک کو تباہ کر کے، لوگوں کو ختم کر کے بنجر زمین کا فاتح بناتا ہے...... یہ حیوانوں کو انسان بناتا ہے، دلوں کو فتح کرتا ہے...... لوگوں کو جیو اور جینے دو کا گر سکھاتا ہے...... گاندھی جی کو اگر موجودہ دنیا کا سب سے بڑا فاتح کہا جائے تو کیا غلط ہوگا؟

کل دوپہر باچھو کے اصرار پر میں ترقی پسند مصنفوں کی میٹنگ میں گئی تھی...... خیال تھا وہاں اور عورتیں بھی ہوں گی مگر کوئی نہ تھی، چھادی[1] میرے ساتھ گئی تھی ورنہ میں اکیلی بہت ہی گھبراتی۔ سجاد ظہیر، سردار جعفری، کرشن چندر، میراں جی، وشوامتر عادل، احمد عباس کے علاوہ جو دوسرے لوگ تھے انھیں میں نے نہیں پہچانا...... ہاں سلیم صاحب کا لڑکا رافع بھی تھا جسے بعد میں باچھو نے ملایا۔ میٹنگ خالص ترقی پسند تھی۔ فرش پر سب بیٹھے تھے، دو بجے کا اعلان تھا اور شروع چار بجے ہوئی۔ سردار جعفری نے لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی جو کانفرنس کا مکمل حال سنایا اور احمد عباس نے کشمیر کے حالات بتائے...... اس کے بعد میاں باچھو نے مجھ سے اصرار کیا کہ اپنا کوئی افسانہ سناؤ...... انھوں نے چالاکی یہ کی تھی کہ میری کاپی ساتھ لیتے گئے تھے۔ یعنی میں انکار نہیں کر سکتی تھی۔ میں نہ ترقی پسندوں کی محفل میں شریک ہوئی تھی اور نہ میرا کوئی اس تحریک سے عملی تعلق کبھی رہا۔ بلکہ مجھے تو ان ترقی پسندوں کے حلقے میں ہمیشہ قدامت پسند اور ناقابلِ اعتنا ہی گردانا گیا۔ ان کے نقاد اور تذکرہ کرنے والے چار چار دن کی لکھنے والی چھوکریوں کا، جن کے ہاں فحاشی

---

[1] مسز منیش سکینہ، خالہ زاد بہن

اور گندگی کے سوا کوئی قابلِ ذکر خوبی نہیں ہوتی، الجھی ہوئی نامعقول باتیں لکھنے والیوں کا بار بار ذکر اور تعریف و تنقید کرتے ہیں لیکن میرا نام بھی شاید کبھی نہیں لیتے۔ اس لیے نہیں کہ میں زندگی یا ادب میں ترقی پسندی کی مخالف ہوں اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ اگرچہ میں بہت معمولی اور کم مایہ ادیب ہوں اور چوٹی کے اردو ادیبوں سے مقابلہ کرنے کا مجھے کبھی خیال نہیں آیا لیکن اردو کی افسانہ نگاری اور ادیب عورتوں میں سے دو تین کے سوا اور سب سے بہتر لکھتی ہوں لیکن چونکہ میرے ہاں عریانی اور گندگی اچھالنا نہیں ہوتا، میرے دماغ پر جنس مسلط نہیں اور میں جنسی مسائل ہی کو زندگی کا سب سے اہم مرکز سمجھ کر اسی پر خامہ فرسائی نہیں کرتی اس لیے......اور شاید اس لیے کہ انقلاب مزدور، طوائف وغیرہ پر میں نے قلم نہیں اٹھایا۔ میرا مسلک تو یہ ہے کہ جس چیز کو میں ذاتی طور پر اچھی طرح نہ سمجھوں اس پر قلم نہیں اٹھانا چاہیے...... میں عورت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر، عورتوں کی زندگی پر جن حالات اور جن واقعات کا اثر پڑتا ہے اس پر یا جو واقعہ مجھے بہت متاثر کرتا ہے اس پر قلم اٹھاتی ہوں اور ہمدردی خلوص اور ایمان داری سے اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اگر اس بنا پر مجھے شہرت اور تعریف نہیں ملتی......تو اگرچہ مجھے اس کا افسوس ضرور ہوتا ہے ان تھوڑے داموں میں اپنے خیالات بدلنے اپنا معیار گرانے پر تیار نہیں، میں چاہتی تو ترقی پسند عورتوں کی طرح ایسی باتیں لکھ سکتی تھی جو مجھے سستی شہرت بخش دیتی لیکن یہ میں نے کبھی نہیں چاہا خدا کرے کامیابی کے ساتھ پیش کروں.........ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ میاں باچھو نے مجھ سے کہا، سجاد ظہیر وغیرہ نے بھی کہا (شاید اخلاق) میرے لیے بڑا مشکل وقت تھا پہلی مرتبہ لوگوں سے ملی تھی اگر انکار کرتی ہوں تو یہ خیال کہ یہ لوگ سمجھیں گے کہ میں چونکہ پردہ دار اور پرانے قسم کے خیالات کی ہوں اس لیے شرما اور جھینپ رہی ہوں۔ یہ مجھے بالکل پسند نہیں کہ کوئی مجھے جھینپو اور جاہل سمجھے.........اس طرح میری عمر ہی میں...... چونتیس پینتیس سال ہو چکی ہے......نوجوانوں کے مجمع میں شرمانا بنا مجھے ہر کسی کو زہر لگتا ہے......اس لیے مجبور ہو کر مجھے باچھو کا کہنا ماننا پڑا ان میں سے ایک افسانہ ''دستگیر'' میں نے وہاں سنایا۔ معلوم نہیں لوگوں کو پسند آیا یا نہیں

اس لیے کہ کسی نے پسند یا ناپسند کا اظہار نہیں کیا۔ کرشن چندر نے ایک لفظ نکالنے کو ضرور کہا جو ٹھیک تھا بعد میں وہاں ہر چیز سنائی جاتی ہے اس پر بہت زوروشور سے اعتراض اور تنقید ہوتی ہے مگر مجھے غالباً نیا آدمی، مہمان اور شاید بزرگ ''عورت'' سمجھ کر اس سے پرہیز کیا گیا۔ باچھو نے بھی اپنا افسانہ سردار جی سنایا اسی پلاٹ پر میں نے ایک افسانہ ''لوٹ'' لکھا ہے۔ مگر میرے اور ان کے افسانے بالکل مختلف ہو گئے ہیں۔ افسانہ کو لوگوں نے پسند بھی کیا، اعتراض بھی کیے، تبدیلیاں کرنے کے مشورے بھی دیے...... کرشن چندر اپنا کوئی افسانہ نہیں لائے تھے اس لیے انھوں نے نہیں سنایا۔ میرا جی نے (جس کے لمبے لمبے بال نہایت وحشت ناک اور صورت بہت کرخت اور قدرے خوفناک سی ہے، اگرچہ جب مسکراتے ہیں تو چہرے کی کیفیت بدل جاتی ہے) اپنے تین شعر سنائے جن میں دو بہت اچھے تھے۔ وشوامتر عادل (یہ شخص ہمیشہ سے بہت بنتا ہے، اسے میں جب سے جانتی ہوں جب یہ ریڈیو اسٹیشن میں تھے) نے اپنی ایک آزاد نظم سنائی۔ لوگوں نے بہت تعریف کی مجھے تو پسند نہیں آئی۔ ایک آدھ مصرعہ یا شعر اچھا ضرور تھا......

خدا خدا کر کے یہ جلسہ ختم ہوا اور اب یہ مشکل باچھو کو اصرار کر کے باہر لائے مگر انھوں نے سارے قافلے کو دعوت دی کہ بھائی جان کے ہاں چل کر چائے پئیں۔ چنانچہ تیرہ چودہ ترقی پسند ادیبوں، شاعروں کا یہ جتھا پیدل چل کر بھائی جان کے یہاں آیا جہاں ان کو چائے پلائی گئی اور رات کو آٹھ بجے کے قریب یہ لوگ واپس گئے۔ مجھے ان لوگوں میں سجاد ظہیر اور سردار جعفری دونوں بہت معقول، ذہین اور سمجھ دار آدمی معلوم ہوئے۔ کرشن چندر بہت خاموش اور شرمیلے سے لیکن ذہین اور حساس نوجوان معلوم ہوتا ہے...... سنا ہے کہ ان لوگوں کے ان جلسوں میٹنگوں میں اس قدر بحث مباحثہ، شور وغل، جھگڑا، ہنسی مذاق ہوا کرتا ہے کہ کمرے کی چھت لیٹنے کے قریب ہو جاتی ہے اور پڑوسیوں بچاروں کو کانوں میں روئی ٹھونسنی پڑتی ہے...... لیکن غالباً میری وجہ سے یہ سب لوگ بہت خاموش اور کچھ دور بیٹھے رہے اور میں خود ان لوگوں میں اپنے کو اجنبی اور ناخواندہ مہمان سا محسوس کرتی رہی۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ تقریباً ان سارے ادیبوں کے پاؤں

میلے اور ناخون بڑھے ہوئے تھے جن کے کپڑے صاف ستھرے اور فیشن ایبل تھے انھیں بھی اپنے ہاتھ پیر کی صفائی کا دھیان نہ تھا اور میرا جی کا تو حلیہ ماشاء اللہ ہی تھا! سمجھ میں نہیں آتا کہ بڑھاپے اور بے حسی لیبل ترقی پسند بننے کے لیے کیوں ضروری ہے؟ غریب سے غریب مصروف سے مصروف آدمی بھی اپنی صفائی اور معقولیت کے لیے تھوڑا بہت وقت نکال سکتا ہے۔

آج چھادی امن کی مشین آئی ہے۔ ۲۳۰ روپے میں چھوٹی سی مشین۔ مجھے اپنی مرحوم مشین یاد آ گئی...... سنگر کی بہترین مشین تھی...... ۴۰ روپے میں آئی تھی۔ کئی برس اتنا اعلیٰ درجے کا کام دیا۔ اور بستر میں ساجدہ کے ہاں سے لپٹ گئی اب کسی ہندو یا سکھ حضرات کے گھر میں چھپا چھپ کھینچے بلاؤس سیا کرتی ہوگی۔ دہلی جا کر مشین نہ ہونے سے بہت سخت تکلیف ہوگی۔ یہاں تو اول کپڑا اپنا ہی نہیں اس لیے کچھ سینے کو نہیں، پھر بھابی کی مشین موجود ہے...... مگر گھر جا کر کیا ہوگا؟ اپنے، عابد کے، ناصر کے، ببن بیگم کے وغیرہ سب کے کپڑے سینے ہوتے ہیں۔ اتنی حیثیت تو نہیں کہ سیکڑوں روپے سلائی کو دیا کریں...... اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے درزی کے ہاتھ کے سلے ہوئے پسند بھی نہیں اور آج کل مالی حالت ایسی ہے کہ نئی مشین خریدنا ناممکن ہے...... جو تھوڑے بہت روپے ہیں ان سے ضروری اخراجات پورے کیے جائیں یا یہ چیزیں لی جائیں جن کے بغیر دنیا میں لاکھوں کڑوروں عورتیں گزارا کرتی ہیں۔ اور ہم بھی کر سکتے ہیں۔ عابد کا خط نہیں آیا۔ سخت انتظار ہے۔

کل شام باچھو کے تھیٹر کا تماشہ ''کس کا بھوت'' میں، امن اور بھابی کو لے گئے تھے۔ اس کھیل میں ایک چھوٹا سا پارٹ باچھو کا بھی ہے اور چھادی بھی انتظام میں شریک ہے۔ ہال تقریباً سارا بھرا ہوا تھا...... خوبصورت عظیم الشان وسیع ہال کھیل بہت اچھا تھا۔ خصوصاً بلراج ساہنی نے بہت اچھا کام کیا۔ ہمارے ساتھ چھدو اور انور بھی تھے۔ تھوڑی دیر بعد چھدو کو پیشاب آیا۔ بہت سخت۔ میں نے بھابی سے کہا ان کے برابر عذرا بیٹھی ہیں ان سے کہہ دو وہ اپنے میاں سے کہہ کر بچے کو باہر بھجوا دیں، مگر بھابی کو اس قدر جھینپ آئی کہ ہرگز نہ کہا، میں نے کتنا کتنا اصرار کیا کہ کہہ دیجیے، اچھا میری طرف انھیں مخاطب کر دیجیے میں کہہ دوں گی، مجھ سے وہ دور تھیں لیکن بھابی نے

نہ کہا مجھے غصہ تو بہت آیا مگر کیا کر سکتی تھی۔ اجنبی جگہ کوئی اور جانے والا سامنے نہیں، خود لے کر چھدو کو جا نہیں سکتی تھی۔ امن نے[1] حسب دستور سر سے چادر اوڑھے ہوئی تھی چونچ چادر کی بنا رکھی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ سر سے ساڑی ڈھک لیں اس طرح خواہ مخواہ سب لوگوں کی نظر پڑ رہی تھی۔ ویسے کوئی خیال بھی نہ کرتا...... مگر ان سے کون اصرار کرے ناراض ہو جاتیں۔

پرسوں کل اور آج۔ برابر کام کر کے پانی پت والا مضمون ختم کر لیا۔ بہت طویل ہو گیا ہے۔ پچاس صفحے سے زیادہ۔ امن اور بھابی کو تو بہت پسند آیا۔ بھائی جان نے ابھی پورا نہیں پڑھا مگر اندازے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کچھ پسند نہیں آیا۔ مجھے پہلے ہی اس بات کا ڈر تھا...... بہت مشکل موضوع تھا اور کوئی ماہر ادیب نہایت اختصار سے یہ انتخاب کر کے کہ کیا بات لکھی جانی ضروری ہے کیا نہیں لکھنا اور حد سے زیادہ متاثر نہ ہوتا جاتا جس طرح میں ہوں...... تو وہ چیز ہی اور ہوتی...... میں تو لکھتے لکھتے جذبات کی رو میں بہہ جاتی تھی...... دل میں درد و غم کے طوفان سے اٹھنے لگتے تھے۔ ہزاروں واقعات سنیما کی تصویروں کی طرح نظروں کے سامنے سے گزرنے لگتے تھے اور باوجود کوشش کے مضمون کو چھوٹا نہیں کر سکتی تھی...... اگر میں لکھتی رہتی تو اسے سو صفحے سے زیادہ کا لکھ سکتی تھی بہر حال اگر چھپنے کے قابل نہ بھی ہوا تب بھی اپنے عزیزوں خصوصاً عورتوں کے پڑھنے کے لیے ہو جائے گا...... یہ تو ایک پانی پت کی چاہنے والی کی دکھے دل کی آواز ہے اور کچھ نہیں۔ اس میں جتنی ادبی خوبیاں ٹھوسنا بیکار ہے۔

۲۶ر

پرسوں بھابی جان کو ایک لڑکوں کے اسکول میں اسپورٹس کے جلسے میں صدارت کرنی تھی اور بھائی جان کو انعام تقسیم کرنے جانا تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ گئی۔ کئی سو چھوٹے بڑے لڑکے لڑکیاں اور ان کی والدین، زیادہ تر مائیں بہنیں وغیرہ بہت سے آئے ہوئے تھے۔ بھابھی جان

[1] مسز اظہر عباس نے نیا نیا پردہ چھوڑا تھا۔

نے عمر میں پہلی مرتبہ اتنے بڑے جلسے میں نہ صرف شرکت بلکہ انعام بھی تقسیم کیے...... آخر میں بھائی جان نے چند منٹ انگریزی میں تقریر کی۔ جلسے کے بعد ساڑھے چھ بجے دادر پہنچے۔ چچی اماں نے سب پیوپلز تھیٹر کی لڑکیوں کی اور اپنے عزیزوں کی چائے کی دعوت کی تھی...... کافی مہمان جمع تھے۔ مجھے سرلا (کرشن چندر کی بہن) بہت پسند آئی۔ سیدھی سادی اور ذہین سی لڑکی ہے۔ مسز کیفی بھی اچھی معلوم ہوئیں اور نور جہاں سے تو کئی جگہ ملاقات ہو چکی ہے۔ بڑی سیدھی محبت کی بچی ہے۔ بچاری چھوٹی سی تھی کہ باپ نے ایک امیر کے ہاتھ بیچ دیا اس بڈھے نے اسے بیوی بنالیا اور غریب لڑکی کو جانے کیا کیا بیماریاں ہوگئیں۔ جب وہ مرا تو شرابی باپ اسے بمبئی لایا اور فلم میں کام کرانا چاہا اسے مجبور کیا حالانکہ وہ نہیں چاہتی تھی۔ اس کی جتنی آمدنی ہوتی کرا اڑاتا۔ یہاں ایک کمیونسٹ لڑکے سے اسے محبت ہوگئی اور باوجود باپ کی ناراضگی کے نور جہاں نے پرسوں اس سے سول میرج کر لی۔ میاں بیوی دونوں بہت خوش ہیں۔ خدا کرے ہمیشہ خوش رہیں۔

کل شام دادر سے واپس آئی۔ جی[1] آجکل بہت پریشان نظر آتی ہے اور کافی چڑچڑی سی ہوگئی ہے۔ سنا ہے کہ مالی پریشانیاں اور ماموں جان کے طرف سی بہت فکرمند ہے۔ وہ بیچارے سخت مشکلات میں مبتلا ہیں۔ ڈیڑھ سو تنخواہ میں اپنا پانچ چھ بچوں اور بیوی کا گزارا جانے پہلے ہی کیسے ہوتا تھا۔ وہ تو ممانی کے باپ کی اناج کی زمیں تھی۔ اپنا گھر تھا۔ اس طرح کافی آمدنی ہوجاتی تھی جس سے ممانی جان تمام ذاتی خرچ، کپڑے لتے، لین دین کے اخراجات پورے کرتی تھیں...... اب پاکستان کی بدولت مشرقی پنجاب کے ظالم حاکموں کے طفیل پانی پت کی تباہی کے ساتھ ساتھ یہاں اور چالیس ہزار آدمی مصیبت میں مبتلا ہیں وہاں وہ بھی ہیں۔ سب لوگ بیوی بچے، سسر، سالی، اس کے بچے لٹ کھشٹ کر ماموں جان کے پاس پہنچے ہیں۔ خدا جانے اس قلیل آمدنی میں کیسے بسر ہوتی ہے۔ جی چاہتا تھا کہ بھائی جان سے کہوں کہ ان کی کچھ

---

[1] مسز خواجہ احمد عباس

مدد کریں۔ جانتی ہوں کہ بھائی جان پر خاصی ذمہ داریاں ہیں پھر ان کے گھر کا خرچ ہمیشہ آمدنی سے زیادہ رہتا ہے۔ پھر بھی ان کا فرض ہے کہ مصیبت میں ماموں کی مدد کریں۔ ماموں جان اس قدر خوددار آدمی ہیں کہ آج تک کسی سے انھوں نے کبھی کوئی ذراسی مدد بھی نہیں مانگی۔ بھائی جان کو اس لیے ان کی حالت کا اندازہ بھی نہیں مگر چھوٹی بہن ہو کر اس قسم کے مشورے بھائی جان کو دینا اچھا نہیں لگتا...... کہیں انھیں برا نہ لگے...... امن کہتی تھی کہ میں اظہر سے کہوں گی! مجی پریشان بجا ہے۔ باچھو خود آج کل تنگی کی حالت میں ہے۔ سارے خاندان کا بوجھ پڑا ہوا ہے۔ وہ ماموں جان کی خود مدد نہیں کرسکتی اس لیے اور بھی دکھ ہوتا ہوگا اس کے علاوہ یہ بھی رنج ہوگا کہ اور کسی کو اس کا خیال نہیں ہے۔ اگرچہ وہ منہ سے کہتی نہیں اور نہ غالباً سمجھتی ہے چچی اماں کی طبیعت بدستور خراب ہے۔ پرسوں ایک ہندو صاحب کا دہلی سے خط آیا تھا جو پانی پت جا کر ہم سب کے گھروں کو دیکھ بھال کر آئے ہیں انھوں نے لکھا تھا کہ سب گھروں پر افسروں نے قبضہ کرلیا ہے اور تمام گھر مٹ چکے ہیں کوئی سامان باقی نہیں۔ ظاہر ہے اس خبر کا سب کو صدمہ ہوا اور چچی اماں پر زیادہ اثر ہونا لازمی تھا! بہر حال آج کل تو ان سب خبروں کو سن کر سوا انا اللہ پڑھنے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ عابد کا پرسوں خط آیا...... وہ علی گڑھ نہیں گئے۔ مجھے فروری کے شروع میں بلا رہے ہیں جب جاسکوں۔

بہن سیادت[1] بچوں اور لڑکیوں کے لیے کپڑا خریدا ہے اور امن نے سب کپڑے کاٹ کر پارسل بنادیا ہے۔ کل بھیج دوں گی، سی کر بھیجتی تو اچھا تھا مگر فرصت نہیں۔

پانی پت والا مضمون بھائی ٹھیک کر رہے ہیں۔ بہت برا لکھا تھا میں نے۔ بھائی جان کو ٹھیک کرنے میں خاصی دقت ہو رہی ہے۔ ابھی بہت تھوڑا سا ٹھیک ہوا ہے۔ کل شام دادر سے واپس آئے رات کو محسن حمید کے ہاں دعوت پر گئے۔ ان کے بارے میں مجی، باچھو وغیرہ کی رائے بہت خراب ہے لیکن اظہر کی بہت دوستی ہے، نہ جانے پر تو انھیں برا لگتا۔ امن اگرچہ ان لوگوں کے

---

[1] محسن عبداللہ

سامنے آنا نہیں چاہتی تھیں مگر اظہر کی خاطر مجبوراً آنا پڑا بیچاری خاموش اور سمٹی سمٹائی بیٹھی رہی۔ عذرا بہت مجھے پسند ہے۔ ویرا بہت اچھی نہیں تو بری لڑکی بھی نہیں ہی۔ حمید اور محسن تو بس ایسے ہی ہیں۔

آج بہت دن کے اصرار کے بعد اظہر ہمیں سنیما دکھانے لے گئے تھے۔ آج کی رات معمولی سے دوسرے درجہ کی فلم تھی لیکن ختم عام فلموں کے خلاف بہت خوبی سے کیا گیا تھا۔ یعقوب کا پارٹ بہت اچھا تھا اور ثریا کا بھی خاصا تھا۔

زاہدہ، شاہدہ، بنّن بیگم، شبو[1] کے خط آئے پڑے ہیں، کل جواب دوں گی۔

۳رفروری ۴۸ء

۳۰رجنوری کی شام کو وہ قیامت گزر گئی جس کا سان وگمان بھی نہ تھا...... اس وقت ہندستان کو جس انسان کی سب سے زیادہ ضرورت تھی جس کی بدولت ہندستان کو آزادی کی نعمت نصیب ہوئی۔ جو ہندستانیوں کی وحشت و بربریت کے خلاف زبردست احتجاج کر رہا تھا، جس نے دل میں امن قائم کرنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگائی تھی اور پھر فتح پائی تھی ۳۰رکی شام کو پرارتھنا سبھا میں جاتے وقت ایک ظالم کے ہاتھوں جام شہادت پی کر ہمیشہ کے لیے سو گیا...... گاندھی جی کو شہید کرنے کی مہا سبھا اور سیوک سنگھ کی متحدہ کوشش اور سازش تھی جس نے دو گز کے فاصلے سے گاندھی جی کی چھاتی و پیٹ میں چار گولیاں ریوالور سے ماریں...... گاندھی جی کے منہ سے رام۔ رام نکلا اور گر پڑے...... گرتے وقت ان کے ہاتھ پراتھنا کے طرز پر جڑ گئے تھے اور چالیس منٹ بعد انھوں نے اپنی جان جاں آفرین کے سپرد کر دیں...... انا للہ وانا الیہ راجعون۔ گاندھی جی جیسا بے مثل سیرت، زبردست شخصیت اور لاثانی صفات کا انسان ہندستان کی تاریخ میں پیدا نہیں ہوا...... وہ سچے رہبر، حقیقی مصلح اور باخدا رہنما تھے...... اس ظلم و فساد، قتل وخون کی موجودہ دنیا میں

---

[1] عابد صاحب کی بھانجی

شاید خدا نے انھیں امن کا پیامبر بنا کر بھیجا تھا...... انھوں نے اپنی زندگی میں ہزاروں کام انجام دیے ہندستان کی آزادی دلائی۔ تعلیمی رہنمائی کی۔ سیاسی قیادت کی، مذہبی اصلاح کی، لوگوں کے دلوں سے نفرت و تعصب، دشمنی و انتقام کے جذبات دور کرنے کی کوشش کی، لوگوں کو ایمان کی روشنی میں نیکی اور شرافت کی زندگی بسر کرنے کے گر بتائے...... غریبوں، مصیبت زدوں، گرے ہوئے، کچلے ہوئے، بے بس لوگوں کی مدد کے لیے زندگی بھر تن من دھن سے تیار رہے...... اور اپنی زندگی بھر اپنے ان سارے اصولوں کو عملی صورت دیتے رہے اور خود نمونہ بن کر دکھایا...... لیکن جس بات نے انھیں اس وقت صرف ہندستان ہی کا نہیں ساری دنیا کا رہبر اور ہیرو بنا دیا وہ ان کا امن کا پیامبر ہونا ہے...... وہ ہمیشہ سے تشدد اور ہنسا کے سخت مخالف رہے اور ان کا اصول رہا کہ ہر قسم کی لڑائی جھگڑے، دشمنی، مخالف کے انتقام کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان محبت اور برداشت سے دشمن کو زیر کرے اور مخالفت کو دور کرے۔ اس انوکھے ہتھیار کو انھوں نے دنیا کی سب سے بڑی طاقت اور سلطنت برطانیہ کے مقابلے میں آزمایا اور پچیس تیس سال کے مسلسل اور ان تھک کوشش کے بعد آخر فریقِ مخالف کو ہتھیار ڈالنے پڑے، گاندھی جی کی فتح ہوئی اور برطانیہ کو ہندوستان کو آزادی دینی پڑی۔ لیکن چالاک حکومت جانے سے پہلے نفاق کا بیج اتنا گہرا بو چکی تھی اور جاتے جاتے تفریق اور بٹوارے سے ملک کی فضا اتنی تباہ کن کر دی تھی کہ آزادی ملنے کے بعد، آزادی کے اس بہادر جنرل کو دنیا کا سب سے بڑا دکھ سہنا پڑا۔ اس کے پیرو، اس کے ہم وطن، ہم مذہب اس کی تعلیم کو بھول گئے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو کر انھوں نے ملک میں غدر برپا کر دیا اور ایسے ایسے ظلم و ستم کیے جو چشمِ فلک نے بھی نہ دیکھے تھے...... گاندھی جی کا حق پرست، انصاف پرست، دردمند دل یہ سب کیسے دیکھ سکتا تھا؟ انھوں نے ہر ممکن کوشش کی، لوگوں کو سمجھایا، بتایا کہ طعنے اور نفرت کو چھوڑ دو، بدلے اور انتقام کا خیال چھوڑ دو۔ کسی کے گناہ اور ظلم کا بدلہ کسی اور بے گناہ، بے قصور مسلمان سے لینا کس طرح جائز ہے؟ اور ہر طریقے سے مسلمانوں کی، ہندستان کے بے بس اور مظلوم مسلمانوں کی مدد اور حمایت کرنے کا بیڑا اٹھا لیا...... جب لوگ کسی طرح نہ

مانے تو انھوں نے صرف برت رکھ لیا...... آخر کار دلّی والوں پر اس کا اثر ہوا...... دلّی میں امن قائم ہوگیا اور گاندھی جی کا برت کھل گیا...... ملک میں اس سرے سے اس سرے تک خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ خود گاندھی جی کتنے خوش اور مطمئن ہوئے۔ انھیں امید تھی رفتہ رفتہ سارے ملک کی فضا ٹھیک ہو جائے گی۔ لیکن غالباً یہ حالات دیکھ کر ان فسادی غنڈوں اور فرقہ پرست لوگوں کے جن کا بھلا اس میں تھا کہ ملک میں بدامنی اور فساد قائم رہے، چھکے چھوٹ گئے...... ایک مرتبہ چار پانچ دن پہلے گاندھی جی پر بم پھینکنے کی کوشش کی تھی مگر وہ ناکام ہوئے اور گاندھی جی بچ گئے۔ لیکن ۳۰ رجنوری کو ان بے ایمانوں نے اس طرح سے حملہ کیا کہ بچنے کا کوئی امکان باقی ہی نہ رہے......

گاندھی جی شہید ہو گئے دنیا کے سب سے بڑے خدارسیدہ رہنماؤں کی طرح...... جو حق کی خاطر ہمیشہ سے جان کی بازی لگاتے آئے تھے اور ساری دنیا کی مخالفت کے باوجود ان کے قدم راہِ راست سے نہ رکے تھے، گاندھی جی بھی ثابت قدمی کے ساتھ اپنی حق بات پر جمے رہے اور اس کے نتیجے کے طور پر انھیں شہادت نصیب ہوئی...... جیسی شاندار ان کی زندگی تھی ایسی ہی ان کی موت ہوئی...... سچے شہید کی موت......

بظاہر گاندھی جی کی موت سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کی اور ان کے ساتھیوں کی آنکھیں سی کھل گئی ہیں اور حکومت فرقہ پرست فسادی جماعتوں اور انجمنوں وغیرہ کو کچلنے کے لیے تیار ہے۔ عوام تو حد سے زیادہ بھڑکے ہوئے ہیں...... سارے ملک میں مہا سبھائیوں وغیرہ پر حملے لوٹ مار کی وارداتیں ہو رہی ہیں...... دیکھیے انجام کیا ہوتا ہے......

ہم ہندستانی مسلمانوں کو صرف گاندھی جی کے ذات کا بھروسہ تھا...... اب سوائے خدا کے کسی کا بھروسہ نہیں...... جس نے ایک ذریعہ گاندھی جی کی ذات کو بنا کر ڈھارس بندھائی تھی اب وہ ذات نہ رہی مگر وہ ذات واحد جو سب سے بڑا محافظ، سب سے زیادہ قوی نگہبان اور بھروسہ کرنے والوں کا بہترین سہارا ہے اس کی ذات موجود ہے...... ہمارے گھر میں آج کل عام طور پر سب یہ کہتے ہیں کہ گاندھی جی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہم بالکل بے سہارا اور خلا میں رہ گئے ہیں

لیکن باوجود گاندھی جی کے سخت صدمے کے مجھے کبھی یہ خلا محسوس نہیں ہوا......اور برابر دل کو یہ یقین ہے کہ خدا ضرور کوئی بہتری کی صورت پیدا کر دے گا۔شہید کا خون ضائع نہیں ہوسکتا ہے اور اس وقت جو صورت حال نظر آ رہی ہے اس سے امید بھی یہی بندھنے لگی ہے۔آگے یہ مالک کی مرضی۔

گاندھی جی کی عظمت اور عقیدت تو آج سے نہیں ۳۰ء سے جب میں ایک بالکل الھڑ اور ناواقف لڑکی تھی، تب سے میرے دل میں موجود ہے جو رفتہ رفتہ بڑھتی رہی......لیکن پچھلے چھ مہینے میں گاندھی جی نے میرے (اور میرے ساتھ اور ہزاروں لاکھوں دلوں میں) دل میں اتنی گہری محبت پیدا کر لی تھی جیسی اپنے کسی نہایت قریبی اور چاہنے والے پیارے بزرگ کی ہوتی ہے...... میں نے باپ کو نہیں دیکھا، باپ کی محبت نہیں جانتی کیسی ہوتی ہے، لیکن اپنے چچا ابا سے مجھے باپ کی سی محبت تھی حد سے زیادہ محبت......گاندھی جی کی موت کا اثر چچا ابا کی وفات سے کچھ زیادہ محسوس ہوتا ہے......وہ ایک خاندان کے سر پرست تھے......یہ تیس چالیس کروڑ کے سر پرست ہمارے ہاں سب پر گاندھی جی کی موت سے ایسا ہی صدمہ گزرا جیسے اپنے کسی قریبی عزیز بزرگ کی موت کا۔امن کو میں نے یہ کہتے سنا کہ ابا کے بعد بھی مجھے ایسا ہی صدمہ ہوا تھا اور ایسی ہی بے بسی محسوس ہوتی تھی......دو دن اور ایک رات ہم سب کو مسلسل روتے گزر گئے......ریڈیو پر پروگرام، تقریریں اور حالات گور و کفن سنتے تھے اور روتے تھے......میری تو اب تک یہ حالت ہے کہ چار راتیں ہو گئیں نیند نہیں آتی......

گاندھی جی کی ارتھی کا جلوس اس شان کا نکلا کہ آج تک ہزاروں برس کی تاریخ میں ہندستان میں کسی بڑے سے بڑے شہنشاہ یا کسی رشی منی کا نہ نکلا ہوگا۔دس بارہ لاکھ آدمی جلوس کے ساتھ تھے اور ساری دنیا کے لوگ ریڈیو کے ذریعے ذرا ذرا سی بات اور رسم جو ہو رہی تھی اس کی خبر سن رہے تھے۔سارے ملک میں لاکھوں آدمی جلوس کے ساتھ تھے اور سارے ملک میں لاکھوں آدمی ان کی چتا کو آگ لگنے کے وقت اپنے اپنے ہاں کی ندی، دریا یا سمندر کے قریب جمع ہوئے

اور دعا پرارتھنا وغیرہ کی اور اس طرح دور سے جنازے میں شرکت کی...... گاندھی جی پر ساری دنیا میں ان کو دنیا کے سارے مقدس اور معزز نام اور خطاب سے یاد کیا جارہا ہے۔ اس سے جہاں اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ گاندھی جی کتنی بڑی، کتنی اچھی اور کیسی بلند اور برتر ہستی تھے وہاں اس بات سے بھی دل کو خوشی ہوتی ہے کہ ابھی دنیا میں لوگوں کے اندر اچھے آدمیوں کو پہچاننے ان کی قدر کرنے اور ماننے کی صلاحیت باقی ہے...... شاید دنیا ابھی اتنی بے حس اور بری نہیں ہوئی جتنی اپنے ظاہری کرتوتوں سے نظر آتی ہے۔

۱۰ر فروری

گاندھی جی کی وفات کو آج بارہ دن گزر گئے۔ اب تک سارے ملک میں ان کا سوگ منایا جارہا ہے۔ پرسوں بارہ تک منایا جاتا رہے گا۔ پرسوں ان کے ''پھول گنگا جمنا کے سنگم'' پریاگ (الہ آباد) میں گنگا کی آغوش میں سونپ دیے جائیں گے، اس بے مثل سپوت کے پھول جو وہ ہزاروں سال کی گردش کے بعد پیدا کرسکی تھی اور انسانِ کامل کی راکھ جس نے اپنی ساری زندگی انسانیت کی خدمت میں گزاری...... اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ خالق کو پانے کا سچا اور اصلی راستہ یہی ہے کہ اس کے بندوں سے محبت کی جائے اور اس خدا کے برگزیدہ بندے نے زندگی بھر انسانیت کی اور انسانوں کی خدمت کی اور اس مقصد کے تحت اپنی جان نچھاور کردی۔ آج سارا ملک انکا سوگ منارہا ہے۔ دنیا ان کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتی۔ سارے ہندستان کے لوگ ان کی راکھ کو عقیدت اور محبت سے لے کر ہر ہر صوبے میں دریا یا سمندر میں ڈالنے کی رسم دھوم دھام سے منانے کی تیاری کررہے ہیں تاکہ ملک کا کوئی حصہ اس سعادت سے محروم نہ رہ جائے۔ دلّی کے مسلمان اس راکھ کو لے کر دفن کریں گے، قبر بنائیں گے اور شاید عرس کیا کریں گے اس ولی اللہ کے مزار پر سارے ہندستان نے ابھی سے گاندھی جی کو پوجنا شروع کردیا..... ان کی راکھ کی پوجا ہورہی ہے، انھیں بھگوان کا اوتار، رِشی، مہاتما، ولی، پیغمبر کے ناموں سے پکارا جارہا ہے۔

یوں تو ساری دنیا مردہ پرست ہے مگر دنیا میں سب سے زیادہ مردہ پرست ہم ہندستانی ہیں۔ پیغمبروں، اماموں، ولیوں، مہاتماؤں، رشیوں کی تعلیم کو سمجھنے اور ماننے میں خواہ سب سے پیچھے رہیں مگر قبر پرستی، بت پرستی میں ہمارا درجہ سب سے افضل و اعلیٰ ہے۔ کاش مہاتما گاندھی......ان کی روح پر ہمیشہ رحمت نازل کرے....ان کی تعلیم کو ہم لوگ سمجھیں۔ ان کے اصولوں پر غور کریں۔ان کی ہدایت پر عمل کریں۔انھوں نے عدم تشدد، مساوات، انسانیت اور محبت کا جو راستہ ہمیں دکھایا، جس کی خاطر اپنی انمول جان تک انھوں نے نچھاور کردی۔ اس پر چلنے کی کوشش کریں۔محض گاندھی جی کے جے کارے پکارنے، ان کی راکھ اور پھولوں کی بھاری بھاری رسمیں انجام دینے اور ان کے مجسمے بہت سارے ملک میں استادہ کرنے اور ان کی تعریفیں کر کے ہمارا فرض پورا نہیں ہوتا۔ہمیں تو یہ سوچنا چاہیے کہ اس عارف نے کیا بتایا تھا؟ کیا سکھایا تھا، جسے ہم پوری طرح نہ سمجھ سکے۔ سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ آج ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے۔اس پر عمل کرنا چاہیے۔ خصوصاً ہم مسلمانوں کو سوچنا چاہیے کہ ہماری اخلاقی اور ذہنی حالت کس قدر پست ہو چکی ہے۔ہم کس قدر تنگ نظری اور تعصب کی گھٹی ہوئی فضا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ہم نے اپنے دل اور دماغ کی کھڑکیاں بند کرلی ہیں۔ نہ ہم اپنے ہادی، رہنما محمد مصطفیٰؐ کی سیرت اور تعلیم پر غور کرتے ہیں، نہ خدا کی کتاب کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نہ کسی خیر خواہ مصلح اور رہبر کی بات سنتے ہیں۔ ہم سے اسلام زندہ نہیں ہوتا بلکہ بدنام ہوتا ہے۔ حیف ہے کہ دس کروڑ....دس کروڑ ہندستانی مسلمانوں میں کوئی انسان گاندھی سا پیدا نہ ہوا۔

اسلام کی تعلیم کا نچوڑ ایک غیر مسلم سے نکلا۔ کیا یہ اس کا ثبوت نہیں کہ ہم لوگ واقعی اسلام کی حقیقی روح سے بے گانہ، سچی تعلیم سے بے خبر، اندھیرے میں جہالت اور تعصب کی تاریکی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہاں بے شک مسلمانوں میں خال خال لوگ ہیں جو اسلام کو سمجھتے ہیں، اس کی صحیح تعلیم پر عامل ہونے کی کوشش کرتے ہیں، وہ اسلام کا بول بالا کرنا چاہتے ہیں، وہ انسانیت کے خادم ہے۔لیکن کتنے ہیں ایسے آدمی، اور کون سنتا ہے ان کی بات؟ کاش، اے کاش! اب بھی

مسلمانوں کو عقل آجائے۔ اب بھی وہ اپنی مذہبی، اخلاقی، تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی حالت کو سنبھال لیں۔ کاش اب بھی ایسا ہو کہ ہندستان کے باقی اور پانچ کروڑ انسانوں کو عقل آجائے۔ خدا کی ذات سے تو کوئی بعید نہیں۔

عابد پر گاندھی جی کی شہادت کا سخت صدمہ گزرا اس دوران میں ان کے کئی خط آئے جس سے ان کی حالت کا اندازہ ہوا۔

میں نے چاہا کہ اس وقت جلد سے جلد عابد کے پاس پہنچ جاؤں مگر نہ جاسکی۔ جہاز میں سیٹ نہیں ملی۔ آخر اب ۱۸ کو جانا طے ہوا ہے۔ اکیلی ہی جاؤں گی۔ خدا کرے ملک کی فضا ٹھیک رہے اور میں بھی خیریت سے پہنچ جاؤں۔ عابد کا خط آیا ہے کہ شاید اخبار بجائے علی گڑھ کے دلّی سے نکالا جائے۔ ذاکر صاحب پہلے ہی میرا خیال تھا کہ آسانی سے عابد کو جامعہ سے جانے نہ دیں گے۔ خود میرا دل بھی جامعہ چھوڑنے کو کسی طرح نہیں چاہتا۔ ہاں اگر سال دو سال کو عارضی طور پر جانا ہو تو خیر اور بات ہے۔ دیکھیے آخر میں کیا بات طے ہوتی ہے۔

دادر تین دن کے لیے گئی تھی۔ چچی اماں بمبئی سے سخت بیزار ہیں۔ پانی پت کی جدائی سے دلگیر اور رنجیدہ اور صحت بھی بہت خراب ہو گئی ہے۔ خدا رحم کرے اس کا اثر سارے گھر پر پڑ رہا ہے۔ باچھو پریشان اور مجی دلگیر رہتی ہے اس کے اعصاب اور مزاج پر بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ امن اور اکھن سخت رنجیدہ اور فکر مند کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔ اور باقی ہم سب بھی بے بسی سے ان کی یہ حالت دیکھتے ہیں۔

۱۶ر فروری

آج کل زندگی اس قدر مصروف گزر رہی ہے کہ ڈائری لکھنے کا وقت بھی نہیں ملتا۔ یا یوں کہوں تو بجا ہے کہ سکت نہیں رہتی۔ ایک تو لکھنے کا کام آج کل سخت ہے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ اب دلّی جا کر گھر داری کے جھگڑوں اور کاموں میں لکھنے کی فرصت بہت کم ملے گی۔

افسانوں کا مجموعہ جو پچھلے پانچ مہینوں میں حالاتِ حاضرہ پر لکھے تھے مرتب کر کے کل کتب پبلشر کے پاس بھیج دیا ہے۔ خدا کرے کہ وہ جلد چھاپ دیں۔ کتاب کا نام ''نراس میں آس'' رکھا ہے۔ عابد کے تجویز کردہ پانچ افسانے ہیں اور دو نیم مضمون نیم افسانے ہیں۔ یعنی ایک تو پانی پت کی زبانی اس کی کہانی بیان کی گئی ہے اور ایک عورت کی زبانی اس کی بپتا۔

اور ایک ریڈیو پر گاندھی جی کی تقریر کی بلکہ بقول ریڈیو والوں کی کہانی پڑھی۔ کیونکہ ان لوگوں نے کہانی کی طرح ہی لکھوائی تھی ایک تقریر مسلمان عورتوں کے جلسے میں گاندھی جی پر کی جسے بہت پسند کیا گیا۔ مجھے احساس ہے کہ بہت جلدی میں اور خراب لکھی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ گاندھی جی پر لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ دل میں اتنے جذبات ہوتے ہیں اور ان کی شخصیت، سیرت، ان کے کارنامے اتنے بلند اور ایسے زبردست ہیں کہ مجھ جیسے کم مایہ انسان کا ان پر قلم اٹھانا بڑی جرأت کا کام ہے۔ مسز کلثوم سایانی کی فرمائش پر ان کے جلسے کے لیے ایک گاندھی جی پر مکالمہ سا لکھ کر آج مکمل کیا ہے۔ بہت گھٹیا لکھا گیا نہ فرصت تھی اور نہ فرمائشی چیز لکھنے کی صلاحیت مگر ان سے وعدہ کر چکی تھی۔ اب اگر انھوں نے ناپسند کیا، جلسہ نہ کرایا تو اچھا ہی ہے۔

آج ہم اودے شنکر کی 'کلپنا' دیکھنے گئے تھے۔ کیا غضب کی فلم بنائی ہے؟ کیسے کیسے مثل ڈانس ہیں اور پارٹ غضب کا ہے۔ مجھے تو بہت ہی متاثر کیا۔ یہ فلم اپنی طرز کی لاجواب اور بہترین فلم ہے۔ اگر یہ فلم نہ ہو تو اور بھی زیادہ اندازہ ہو جائے گا (پہلے کیا ہے) کہ ہمارے دیس کے لوگوں کا مذاق کس قدر گر گیا ہے۔

پرسوں مسز امیر حسن (ڈاکٹر ہادی حسن کے والد محسن ملک کی بھاوج) نے چائے پر بلایا تھا۔ بڑی دلچسپ اور سمجھدار بی بی ہیں۔ پرانی تہذیب کی زندہ یادگار۔ بڑی بااخلاق، مولانا حالی کی تو اس قدر مداح اور معتقد ہیں کہ میں نے اس سے زیادہ آج تک کسی کو نہ دیکھا تھا۔ دو گھنٹے تک وہ بڑی مسلسل باتیں کرتی ہیں اور اس قدر دلچسپ انداز میں کہ لڑکیاں تک شوق سے سنتی ہیں ورنہ آج کل لڑکیاں بوڑھی عورتوں سے یوں ہی گھبراتی ہیں۔

....

خدا خدا کر کے جہاز میں سیٹ ہوئی ہے اور پرسوں صبح انشاء اللہ دلّی روانگی ہے۔ ابھی تک عابد صاحب کا خط یا تار نہیں آیا کہ انھیں میرے پہنچنے کی اطلاع ہوگئی یا نہیں۔ بھائی جان کل شام دورے پر سدھار گئے اور ترسوں یعنی میرے جانے کے بعد آئیں گے۔ ان سے تین دن پہلے ہی چھوٹ جانا بہت شاق گزرا۔ یوں تو سبھی سے جدا ہونے کا مجھے اور سب کو میرے جانے کا قلق اور صدمہ ہے۔ لیکن بھائی جان کو چھوڑنا کسی قدر تکلیف دہ ہے۔ خاص طور پر اس مرتبہ تقریباً آٹھ مہینے مسلسل پاس رہ کر اب ایک طویل مدت کے لیے ان سے جدا ہونا، اتنی دور جانا، خیال ہی سے دل بے چین ہو جاتا ہے۔ یا اللہ! کیا میری زندگی میں ایسا دن بھی آئے گا کہ میں اور بھائی جان ایک ہی شہر میں ہوں؟ یعنی وہ بھی دلّی میں نوکر ہو کر آجائیں۔ عابد اور بھائی جان دونوں میرے پاس ہوں تو پھر دنیا میں کس چیز کی آرزو باقی رہ جاتی ہے؟

....

بھائی جان نے راستے سے ایک خط لکھ کر مجھے ڈالا تھا جو آج شام ملا۔ اس خط کو پڑھ کر میرے دل کی جو کیفیت ہوئی وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ مجھے میرے پروردگار نے بہت سی نعمتیں عطا کی ہیں جن کا زندگی بھی شکر ادا کروں تو نہیں کر سکتی۔ لیکن بھائی جان جیسا بے مثل صفات کا چاہنے والا بھائی اور عابد جیسا عاشق اور شوہر جس کی سیرت اور شخصیت کا انسان مشکل سے ملے گا۔ یہ دو اتنی بڑی اور ایسی انمول نعمتیں ہیں جن کے میں قابل نہیں تھیں۔ جس عورت کو ایسے انمول گوہر حاصل ہوں اسے اور کسی چیز کی آرزو ہونی چاہیے...... اور پھر خدا کی مہربانی سے ان دونوں کی محبت ہی نہیں قدر اور عزت کی دولت بھی مجھے میسر ہے۔ بھائی جان نے جن الفاظ میں میری تعریف کی ہے، انھیں پڑھ کر بے اختیار کتنی دیر تک میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ خدا مجھے توفیق اور صلاحیت دے کہ میں حقیقت میں ایسا ہی بنوں جیسی کہ وہ مجھے سمجھتے ہیں یا چاہتے ہیں۔

آج بھائی جان کا خط پڑھ کر مجھے جو دلی خوشی جو روحانی مسرت ہوئی وہ میں نہیں سمجھتی ہوں کہ کوئی دس لاکھ روپے یا اور دنیا کی ہزاروں نعمتیں مجھے بخش دیتا تو اس سے آدھی خوشی بھی حاصل ہو سکتی۔ محبت اور عزت، یہ دونوں انمول جواہر جسے مل جائیں اسے اور کیا چاہیے۔

☆☆☆

1950

۴۹ء ختم ہوا ۵۰ء شروع ہوا تو دل نے کہا اس سال بہت پریشانیاں اٹھائیں، بہت مشکلیں جھیلیں، بیماریاں سہیں، خدا کا شکر ہے کہ یہ ختم ہوا۔ اب یہ نیا سال شروع ہو رہا ہے۔ خدا اِسے مبارک کرے اور مشکلوں اور پریشانیوں سے محفوظ رکھے۔ ۴۹ء میں چھوٹی موٹی بیسیوں باتوں کے علاوہ تین وقت بہت کٹھن گزرے۔ عابد صاحب کا اپنڈکس کا رام پور میں آپریشن۔ ایک مہینہ پہلے سے میری پریشانی کی جو حالت تھی وہ خدا ہی جانتا تھا اور پھر آپریشن کا دن اور اس کے بعد ایک ہفتہ، پر بنی رہی کہ خدا انھیں خیر و عافیت کے ساتھ اس مرحلے سے گزار دے۔ اس کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ آپریشن بہت کامیاب ہے۔ بہت جلد انھیں صحت حاصل ہوگئی۔ اس زمانے میں بہت سے لوگوں نے جس ہمدردی، انسانیت اور محبت کا سلوک کیا اس کی یاد ہمیشہ دل میں رہے گی۔ خاص طور پر بھابی قدسیہ[1] کی پُر خلوص محبت اور بے انتہا خیال اور خاطر اور خدمت تو ایسی چیز ہے جسے بھلانا ممکن ہی نہیں۔ کوئی حد سے زیادہ چاہنے والی سگی بہن بھی اپنے بھائی کا زیادہ سے زیادہ بس اتنا ہی خیال رکھ سکتی ہے۔ ایسے ہی موقعوں پر دوستوں کی دوستی اور خلوص کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ ہمارے اس ملک میں محبت کا دعوا تو بہت کیا جاتا ہے لیکن اول تو محبت کی شدت بھی عام طور پر ہمارے ہاں تکلیف دہ ہوتی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے پیارے ہمارے اشاروں پر ناچیں، ہماری محبت کا ہر وقت اعتراف کریں اور اتنی ہی شدت سے ہم سے محبت

---

[1] قدسیہ زیدی بیگم بشیر حسین زیدی

کریں۔ سمجھداری کے ساتھ محبت کرنا اور جن لوگوں سے محبت ہو ان کے دکھ درد کو محسوس کر کے اسے دور کرنے کی کوشش کرنا، شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ چاہنے والوں میں خلوص کی کمی ہوتی ہے اور وہ دراصل اپنی ذات سے اس شدت سے محبت کرتے ہیں کہ (غیر محسوس طور پر) باقی سب کی محبت پس پشت پڑ جاتی ہے۔ اگر چہ وہ صرف دوسروں کو ہی نہیں خود اپنی ذات کو بھی اس دھوکے میں رکھتے ہیں کہ دراصل وہ دوسروں سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں یا پھر اگر خلوص موجود بھی ہو تو عقل کی کمی ہوتی ہے۔ جس آدمی کے لیے ہم جان تک دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اس کی چھوٹی چھوٹی خواہشیں پوری کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے اور اپنی محبت گویا اس پر لادتے رہتے ہیں اور وہ ذرا سا احساس نہیں کرتے کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ اس میں شاید سیرت شناسی کی اور مشاہدے کی کمی کا بھی دخل ہوتا ہو۔ بہر حال یہ حضرات اور ہمارے ہاں کی عورتوں میں، درمیانہ طبقے میں خاص طور پر بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔ بہنیں، مائیں و بیٹیاں، بیویاں، سبھی اپنے نزدیک بے حد چاہنے والی ہستیاں ہوتی ہیں لیکن اگر ہماری محبت میں خلوص اور سمجھ اور سیرت شناسی موجود ہوتی تو اس دیس میں ہزاروں لاکھوں کی گھریلو زندگی اس قدر ناخوشگوار، غیر مطمئن اور سکون و عافیت سے اتنی دور ہرگز نہ ہوتی۔

بھابی قدسیہ نے عابد کی بیماری میں میرے ساتھ جس ہمدردی اور محبت کا سلوک کیا اور عابد کا جس طرح خیال رکھا وہ صرف ایک پُر خلوص اور محبت کرنے والی بہن ہی کا حصہ ہے۔ عابد صاحب نے تو انھیں بہن بنا بھی لیا ہے۔ وہ انھیں بھابی نہیں بجیا کہتے ہیں اور وہ بھی اپنے بچوں سے انھیں ماموں جان کہلواتی ہیں۔

عابد صاحب کی صحت ٹھیک ہونے کے بعد کچھ دن کے لیے ستمبر میں بمبئی گئی اور وہاں سے دو ہفتے کے اندر واپس آئی لیکن راستے ہی سے طبیعت خراب ہوگئی اور پھر جو شدید نزلہ، سخت کھانسی اور جانگداز دمہ کا سلسلہ چلا ہے تو مسلسل ڈیڑھ ماہ اس قدر سخت تکلیف میں گزرا کہ خدا کی پناہ۔ کوئی دوا علاج کارگر نہ ہوتا تھا۔ دس دس راتیں بیٹھے بیٹھے گزر گئیں۔ دن میں کئی کئی گھنٹے کی مسلسل کھانسی

کا ایسا دورہ ہوتا تھا جس میں پانچ منٹ بھی سکون لینے کو نہ ملتے تھے۔ خدا بھلا کرے بدر پور کے ڈاکٹر راجندر پرشاد کا انھوں نے نئی طرح سے علاج کیا۔ کچھ نسخے دیے، کچھ مالش، نہانا گرم پانی میں پاؤں ڈالنا وغیرہ بتایا۔ غذا میں احتیاط بتائی اور انھیں چند ٹوٹکوں نے دو ہفتے میں بالکل اچھا کر دیا۔ کمزوری بہت ہوگئی تھی مگر مرض جاتا رہا اور جاڑے میں ان ہی ترکیبوں پر عمل کرتے رہنے سے پھر اس بیماری کا اتنا سخت حملہ نہ ہوا۔ لیکن قسمت میں چین کہاں۔ اپنی بیماری سے سنبھلنے نہ پائی تھی کہ سنا باجی کی طبیعت خراب ہے۔ خیر کچھ دن بعد ان کی صحت کے بارے میں تو اطمینان ہوا مگر نومبر کی ۲۷ تاریخ کو یہ خطرناک خبر ملی کی ذاکر صاحب کو 'ہارٹ اٹیک' ہوا ہے۔ اُف! ذاکر صاحب! ملک اور قوم کا بہت قیمتی سرمایہ، اپنے خاندان اور دوستوں کی عزیز ترین اور مقبول ترین ہستی، مسلمانوں کی امیدوں کا سہارا، دل اور دماغ کی انمول قوتوں کا مالک، جامعہ کا ناخدا، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا کھیون ہارا اور اس خطرناک مرض میں مبتلا۔ یا اللہ! اب کیا ہوگا؟ الٰہی! گاندھی جی جیسی انمول اور لاثانی ہستی تو نے اٹھالی، جس پر ساری دنیا کی آنکھیں لگی رہتی تھیں جو اس بدنصیب اور گمراہ قوم کا رہنما اور ہادی تھا۔ لیکن پھر بھی کم سے کم اتنا تو دل کو سمجھایا جا سکتا ہے کہ وہ ۸۰ سال اپنی عمر طبعی تک پہنچے۔ اب خدا نے انھیں ایسی شاندار مسرت نصیب کی، شہادت کے درجے پر فائز کیا اور ان کی موت بھی قوم کی بھلائی کا سبب بن گئی۔ اور ذاکر صاحب، وہ ابھی جوان ہیں۔ انھیں تو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ جامعہ کو ترقی کے بلند بام پر پہنچانا ہے، مسلم یونیورسٹی کی تباہ حالت اور غلط راہ کو سدھارنا ہے، ہندی مسلمانوں کی امید اور سہارا ان کی ذات ہے، انھیں تعلیمی دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے، ہندستان کی تعلیمی حالت کو بہتر بنانا ہے۔ یا اللہ! ہمارے دیس میں تو یوں ہی قحط الرجال ہے۔ یہ چند آئی گئی ہستیاں جو رہ گئی ہیں انھیں سلامت رکھ۔ الٰہی ان کا بال بیکا نہ ہو۔ ذاکر صاحب کی دلکش شخصیت اپنوں ہی میں نہیں غیروں اور دشمنوں تک میں محبوب ہے۔ خدایا اس حسین شخصیت کو آلام و آفات سے محفوظ رکھ۔ غرض دو ڈھائی مہینے جب تک وہ خطرے سے باہر نہ ہوگئے، میرے، عابد کے، بھائی جان کے اور ذاکر صاحب کے بیسیوں

دوستوں کے لیے عجب پریشانی اور اضطراب کے تھے۔ خدا خدا کرکے ان کو صحت نصیب ہوئی اور سب لوگوں نے کچھ اطمینان کا سانس لیا۔ البتہ یہ اطمینان کسی کو بھی نہ تھا وہ اپنی آئندہ زندگی ایسی منظم، باضابطہ اور با اصول بنالیں گے اور اس مریض کی صحت اور زندگی کے لیے لازمی ہے۔ ذاکر صاحب کی بیماری میں بھی علاوہ اور لوگوں کے زیدی صاحب اور بھابی قدسیہ نے ہر طرح کی خدمت اور خیال کیا۔ زیدی صاحب نے نواب[۱] صاحب سے ان کے علاج کا خرچ دلوایا۔ اس کمبخت بیماری پر ہزاروں روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ بیچارے ذاکر صاحب کے پاس پہلے ہی کیا تھا کہ وہ خرچ کرتے۔ خیر خدا کا شکر ہے کہ پریشانی کا زمانہ بیت ہی گیا۔ ذاکر صاحب اور عابد صاحب دونوں اچھے ہوگئے اور میری تکلیف اور بیماری بھی جاتی رہی۔ ۴۹ء اور ۵۰ء کی رات کو تقریباً ساری رات میں یہی سوچتی رہی کہ اب پریشانیوں کا زمانہ خدا نے گزار دیا۔ ۵۰ء اطمینان، مسرت اور صحت وکامرانی کا سال ہوگا۔ کاش! کاش ایسا ہی ہوتا۔

....

[۱] نواب رام پور

1958

یکم جنوری

آج بھائی جان اور عابد صاحب کے ساتھ مولانا آزاد سے ملنے گئی۔ اپنا ناول ''قطرے سے گہر ہونے تک'' مولانا کی نذر کیا۔ بہت مرجھائے ہوئے، زرد اور حسبِ دستور خاموش تھے۔ ان کو دیکھ کر پہلے خوشی ہوا کرتی تھی، اب افسوس ہوتا ہے۔ پھر رادھا کرشنن سے ملنے گئے۔ بڑے موڈ میں تھے۔ خوب باتیں کرتے اور گاتے رہے۔ اپنی حکومت اور اربابِ حکومت کی کامیابی گناتے رہے، اور بار بار کہتے رہے ''میڈم! لکھو، لکھو، لکھو۔ ہمارے بارے میں، ہماری خرابیوں کے بارے میں، لکھو۔'' کتنی اچھی بات کہی ''چھوٹے دماغ والوں کا ملک بڑا نہیں ہوتا۔'' ان سے مل کر جیسے روح تازہ ہو جاتی ہے۔ عابد صاحب بولے ''یہ شخص سو برس تک زندہ رہے گا۔'' مگر ایسا لگتا ہے کہ بس وہ باتوں کے مرد ہیں۔ عمل کے نہیں۔

۴ رجنوری

حسن احمد اور غلام حیدر[1] ملنے آئے۔ غلام حیدر کی ملازمت کا اب تک کچھ نہیں ہوا۔ بچارا بڑا پریشان ہے۔ عابد صاحب ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں مگر اب تک کامیابی نہیں ملی۔

شام کو مرید صاحب کے بیٹے کی دلہن عذرا کچلو کو دیکھنے گئی۔ ایک تحفہ دلّی سے لائی تھی، وہ

---

[1] قیصر نقوی کے بھائی

دیا۔ یہ ڈاکٹر کچلو کی لڑکی ہے۔ علی گڑھ ویمنز کالج میں ہوم سائنس کی معلمہ ہے۔ اچھی لڑکی ہے۔

بشیر الدین صاحب کی آنکھ کا آپریشن ہوا ہے۔ ان کو دیکھنے کے لیے گئے۔ اب اچھے ہیں، پرسوں تک گھر آجائیں گے۔

آج رات کو ساجدہ کے ہاں کھانے پر گئے تھے۔ وامق اور سیدہ فرحت کا کلام، کھانے کے بعد دیر تک سنتے رہے۔ بعض چیزیں اچھی تھیں بعض بہت معمولی۔

۵/جنوری

آج صابرہ اور شاہدہ کے ساتھ کچھ اور لڑکیوں اور خواتین کو چائے پر بلایا تھا۔ سات نے تو انکار ہی کر دیا، بارہ آئیں۔ میرے آج صبح ہی سے ''کولن'' میں درد تھا۔ یہ درد کبھی سال چھ مہینے میں ہو جاتا ہے۔ دوا کھائی، سکائی کی مگر درد اب تک بدستور ہے۔ دعوت کا کام بھی زیادہ تر صغرا[1] بچاری کرتی رہی۔ درد اب تک ہے بلکہ خوب بڑھ گیا ہے۔

ابھی بھابی جان کا خط ملا کہ کل گیارہ بجے لڑکیاں آئیں گی۔ عابد صاحب کا خیال ہے چھدو اور ذکیہ آئیں گی اور میرا خیال یہ ہے کہ زہرا اور ذکیہ آئیں گی۔

۶/جنوری

گیارہ بجے ذکیہ اور زہرا پہنچیں۔ شام کو بیگم کے ہاں ہم سب چائے پر مدعو تھے۔ وہاں باوجود درد کی تکلیف کے گئی۔ اس لیے کہ وہ بچاری جانے کس مشکل سے تو دعوت کر پائی تھی۔ میں نہ جاتی تو رنجیدہ ہو جاتی۔ رات کو حمیدہ سالم نے بلایا تھا مگر میں درد کی وجہ سے نہیں گئی۔ یوں بھی زہرا اور ذکیہ کے بغیر جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

درد تمام دن رہا۔ اگرچہ برداشت کے اندر ہے مگر بہت تکلیف دے رہا ہے۔ دن گرم بوتل

---

[1] صغرا مہدی عابد صاحب کی بھانجی

کے سہارے کٹا۔اب بوتل ٹھنڈی ہوگئی ہے اور درد نے بڑھنا شروع کر دیا ہے۔ڈاکٹر حفیظ کو بلوایا تھا مگر وہ ملے نہیں۔

بیگم کے ہاں غلام حیدر نے گانا سنایا۔ بہت اچھا گاتا ہے۔اس کی آواز بھی بہت اچھی ہے اور گانا سیکھا بھی ہے۔

۸ر جنوری

زہرا اور ذکیہ سدھار گئیں۔صبح پانچ بجے سے اٹھنا پڑا۔ذکیہ کا بخار اور نزلہ کم تھا۔صابرہ بھی آج روس کے لیے روانہ ہوگئیں۔ابھی دلّی گئی ہیں۔۱۰ یا ۱۱ کو روس چلی جائیں گی۔ان کو الوداع کہنے کے لیے میں بھی اسٹیشن پر گئی تھی۔باجی ساتھ گئی ہیں۔تین ہفتے آنکھ جھپکتے گزر گئے اور اب پھر نئے سرے سے اس کی جدائی اور دوری کا احساس تکلیف دے رہا ہے۔

۱۷ر جنوری

آج مسز حبیب کے ہاں چائے پر گئی۔مسز فیضی ان کے ہاں ٹھیری ہوئی ہیں۔ان سے ملنے کے لیے چند عورتوں کو بلایا تھا۔میری یاد میں گزشتہ ۳۰ سال میں مسز حبیب کے ہاں یہ دوسری یا تیسری بار چائے کی دعوت ہوئی ہے۔مسز فیضی حسبِ دستور بڑی محبت اور خلوص سے ملیں اور حسبِ عادت گھبرا گھبرا کر مختلف سوال کرتی رہیں جن میں سے کسی کا جواب وہ کبھی نہیں سنتیں۔

آج ہی سردار جعفری اور سلطانہ نے بھی چائے پر بلایا تھا۔سلطانہ اپنی بہن کے ہاں علی گڑھ آئی ہوئی ہیں۔چھے بجے ان کے ہاں پہنچ گئی۔ بہت سے مہمان جمع تھے۔وامق[۱]، سردار[۲] اور خورشید[۳] نے اپنا اپنا کلام بھی سنایا۔خورشید کے دو قطعے اچھے تھے۔وامق کی چیزیں کچھ پھسپھسی رہیں۔سردار نے نئی نظم زندگی سنائی، بہت اچھی تھی۔اسے روز بروز زبان پر قدرت بڑھتی جاتی

۱ وامق جونپوری ۲ سردار جعفری ۳ خورشید السلام

ہے اور انداز بیان میں زور اور جوش تو ہے ہی۔

۳۱رجنوری

گزشتہ دنوں بے حد مصروفیت رہی۔ شبو کے بیاہ کے سلسلے میں تین دن کے لیے دہلی جانا پڑا۔ وہاں اس کی شادی کے کارڈ چھپوائے۔ اس کے جوڑوں وغیرہ کو مکمل کیا۔ واپس آ کر بھی بتن بیگم اور انیس کے بچوں کے کپڑے، نوکروں کے کپڑے، شبو کا کوٹ، ناصر کی اچکن قمر کی اچکن سلوانا اور سیکڑوں دوسرے چھوٹے موٹے کام۔ شادی جتنی قریب آ رہی ہے کاموں کی یورش بڑھ رہی ہے اور اس کا احساس کہ یہ سب کیسے ہوگا۔

بھائی جان آج آ رہے ہیں، کل چلے جائیں گے۔ ان کا علی گڑھ کا مکان ۳۰ ہزار میں بک گیا ہے۔ عابد نے اس سلسلے میں بہت دوڑ دھوپ اور کوشش کی۔ ان میں یہ خاص بات ہے کہ اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتے اور دوسروں کے لیے سب کچھ کرتے ہیں۔ خصوصاً بھابی بھائی جان کے لیے کسی بھی کام کے لیے دن رات ایک کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔

۵رفروری

سارا دن دعوتی کارڈ بھیجنے اور دعوت کے انتظامات کے بارے میں لوگوں سے گفتگو کرنے میں گزرا۔ پانسو سے زیادہ آدمیوں کا اندازہ ہے۔ کلام[۱] صاحب اور مجتبیٰ[۲] صاحب بار بار کہتے ہیں کہ اتنے آدمیوں کو کیوں بلا لیا کیسے انتظام ہوگا؟

شبو کو آج رات مانجھے بٹھا دیا گیا۔ بھابی جان، امّن اور سب لڑکیاں وغیرہ آئی تھیں۔ شبو کے سسرال والے بھی آئے۔ مگر الگ تھلگ سے بیٹھے رہے.... ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی میں کوئی امنگ ہی نہ ہو۔

---

[۱] جامعہ ابوالکلام آرٹ کے استاد [۲] جامعہ کے قدیم رکن

شیری بھی کل ہی آ گئی تھیں۔ ان کے آنے سے خاصی تقویت ہوئی۔

۶؍فروری

آج شام عابد صاحب آ گئے۔ دن بھر جو خریداری باقی رہ گئی تھی اس میں گزرا۔ سات بجے عابد کو لے کر اوکھلے واپس آئی اور مجتبیٰ صاحب، کلام صاحب، اختر[1] صاحب اور شبیر[2] صاحب کو بلا کر میٹنگ کی گئی۔ بہت سے بحث مباحثہ کے بعد آخر کار یہ طے ہوا کہ شامیانے وغیرہ اور برتن سب کرائے کے آئیں گے۔ اس لیے کہ اتنے برتن پورے جامعہ نگر میں نکلنا محال ہے۔ نکاح ہمارے گھر کے سامنے شامیانے میں ہوگا اور نکاح کے بعد کلام صاحب کے انسٹیوٹ کے سامنے کے لان میں مردوں کی دعوت کا انتظام اور گھر پر عورتوں کی دعوت کا انتظام ہوگا۔ مینو بھی بنا۔ ایک پھل، ایک مٹھائی، تلے ہوئے مٹر، بسکٹ اور چائے۔ مَردوں کو سگریٹ اور عورتوں کو پان دیے جائیں گے۔ باقاعدہ کمیٹیاں[3] بنائی گئی ہیں۔ کام بانٹ دیے گئے ہیں۔ یہ سب لوگ مجھے سمجھا رہے ہیں کہ تم پریشان نہ ہو سب کام ہو جائے گا۔ مگر طبیعت الجھی ہوئی ہے۔ اور اتنی بڑی دعوت جس میں آدھے سے زیادہ عورتیں اور بچے ہوں گے۔ خیال ہی سے طبیعت پریشان ہے۔ مجھے خیال بھی نہیں تھا کہ لوگ اتنے ہو جائیں گے۔ مگر ماشاء اللہ جامعہ برادری ہی اتنی بڑھ گئی ہے اور پھر شہر کے عزیز اور دوست ہیں۔

۷؍فروری

آج کنیز[4] بھی کان پور سے مع چار بچوں کے آ گئیں۔ اب مستقل رہنے والے گھر میں پینتیس سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ پھر دن بھر آنے والوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ کسی وقت بھی ذرا سا

---

۱ جامعہ کے استاد ۲ شبیر ندوی جامعہ کے قدیم کارکن ۳ اس وقت تک جامعہ ایک خاندان کی طرح تھی اس لیے سب مل کر ذمہ داری اٹھاتے تھے۔ ۴ عابد صاحب کی چچازاد بہن

سکون ملنا ناممکن ہے۔

شیری اور بہن سیادت نے کھلانے، پلانے پلوانے کا کام سنبھال رکھا ہے جسے بڑی خوبی سے کرتی ہیں۔ تقریباً پچاس ساٹھ آدمی ایک وقت میں کھانے پر ہوتے ہیں۔ غفران[1] کے ہاں سے خیمے آگئے ہیں۔ ایک ناصر[2] کے ہاں لگایا گیا ایک اپنے ہاں۔ عابد صاحب اور میرن خورشید کے ہاں سوتے ہیں۔ نوکر قسم کے سب مرد خیمے میں اور باقی گھر کے ہر کمرے میں کئی کئی مائیں اور بچے۔

جوں جوں وقت گزر رہا ہے مجھ پر کاموں کی یورش بڑھ رہی ہے۔ صبح سے شام تک مرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ جو خواتین ملنے آتی ہیں ان کے پاس بیٹھنے اور بات کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ اللہ رات کو غلام حیدر اور قیصر کی بہنیں وغیرہ آکر گانا گاتے ہیں۔ غلام حیدر بہت اچھا گاتا ہے اور جب تک میں نہ بیٹھوں گانے پر تیار نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ کہ رات کو بھی دیر تک بیٹھنا پڑتا ہے۔ عابد صاحب بچارے کی طبیعت صاف نہیں۔ پھر بھی جہاں تک ہوسکتا ہے انتظام کے لیے لوگوں سے کہتے سنتے رہتے ہیں۔

۸ر فروری

آج کا دن بھی سخت مصروفیت میں گزرا۔ بیگم، بہن، انیس اور کنیز چاروں کا ایک ایک دو دو بچہ بیمار ہے۔ شبو کو نزلہ بخار ہے اور دولھا میاں اور ان کے گھر میں بھی کئی آدمی بیمار ہیں۔ چنانچہ دیگر کاموں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر کو بلا کر دکھانا اور دوا منگوانا بھی فرائض میں داخل ہے۔ خدا ساتھ خیریت کے یہ مرحلہ طے کرائے۔

۹ر فروری

بارہ سے تین تک بے چینی کی نیند آئی اور پھر پلک نہ جھپک سکی۔ آخر چار بجے نیچے چلی گئی۔

[1] کرنل غفران جو اس زمانے میں راشٹر پتی کے اے ڈی سی تھے [2] اس شادی کا دولھا

دیکھا کہ بہن سیادت اور شیری بھی جاگ رہی ہیں اور نذیر[1] بھی۔ چنانچہ چاروں ذمہ دار جاگتے اور مشورے کرتے اور کھانے کے مینو بناتے اور انتظامات پر بات چیت کرتے رہے۔ اور سات بجے تک بس لوگوں کو ناشتہ سے فارغ کرادیا۔ پھر میں نے صغرا اور حشمت اور مجید کے ساتھ چار کمروں میں اوپر نیچے فرش فروش کرایا۔ بڑے کمرے کے ساتھ ایک بڑا سا شامیانہ لگوادیا گیا ہے اس میں فرش وغیرہ کرایا۔ ساڑھے نو بجے تک جامعہ لاری میں برتن اور شامیانے آگئے۔ اور بارہ تک لگ گئے۔ بھائی جان کے ہاں کے سب لوگ سوا بھائی جان کے آگئے ہیں۔ بھائی جان کل جے پور سدھار گئے ہیں۔ آج رات کو واپس آئیں گے۔

تحفوں کی بھرمار ہے۔ سب لوگ شبو کو بڑے خوبصورت اور کارآمد اور کافی قیمتی تحفے دے رہے ہیں۔ تقریباً ستر اسّی تحفے آئے جن میں کپڑے، برتن فرنیچر اور سجاوٹ کی چیزیں سبھی ہیں۔ عاقل[2] صاحب نے بجلی کا ٹیبل فین دیا جو سب سے قیمتی تحفہ ہے۔ گھر میں بعض لوگوں کو شبو کو اتنے تحفے ملنا ناگوار گزرا۔ خدا ایسے لوگوں کو رشک کے مرض سے نجات دے۔

ایک بجے صفی پور سے دس مزید آدمی مہمان آگئے۔ بنّو، خلن، بسو[3] کی بیوی اور دونوں کے لڑکے لڑکیاں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب نے طے کرلیا ہے شبو کی شادی میں ضرور شریک ہوں گے۔

ساڑھے تین پر برات آئی، چار بجے نکاح ہوا، ساڑھے پانچ تک دونوں جگہ ایٹ ہوم ہوا۔ باہر تین سو سے زیادہ مردوں کا اور گھر پر ساڑھے تین سو عورت بچے اور ملازم وغیرہ کا۔ چھے بجے دلہن رخصت ہوکر اپنے گھر سدھار گئی۔

تین سو سے زیادہ عورت اور بچے جس سے ہمارا چھوٹا سا گھر اور بڑا سا احاطہ کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ وہ ہنگامہ تھا، وہ شور تھا، وہ گہما گہمی اور ہماہمی تھی۔ اور پھر بیک وقت پانچ چھے آوازیں پڑتی رہتی تھیں۔ ''ممانی جان، فلاں بات بتاؤ''۔ ''پھوپی جان سنیے''۔ ''بیگم صاحب ذرا یہاں

---

[1] عابد صاحب کے رشتے کے بھائی [2] جامعہ کے پروفیسر [3] عابد صاحب کی کزن منور علی

آیئے''۔''مصداق! سنتی نہیں ہو''۔ بھابی! بھابی!'' معاذ اللہ بہر حال خدا کے فضل و کرم اور جامعہ والوں کی محبت اور محنت اور میری اور بہن کی ان تھک محنت اور پھر سب عزیزوں اور دوستوں کی مدد سے یہ اتنا بڑا مرحلہ اس قدر خوبی سے طے ہو گیا کہ حیرت ہوتی ہے۔ ہر کام وقت پر ہوا۔ نہایت عمدہ انتظام رہا۔ سب چیزیں تھی اچھی تھی۔ کوئی بدمزگی نہیں ہوئی۔

شبو سدھار گئی۔ خدا اُسے خوش و خرم رکھے۔ بہت بڑا مرحلہ طے ہوا۔ اگر یہ شادی کامیاب ہوئی تو میری بہت بڑی فتح ہو گی۔

۱۰ر فروری

اب بھی گھر میں پچاس آدمی موجود ہیں۔ آج رات کو ناصر کے دوستوں اور گھر والوں کی کھانے کی دعوت تھی۔ چالیس آدمی انھوں نے لانے کو کہا۔ کچھ لوگ گھر کے تھے، کچھ ہم نے اور بلائے۔ سو کی دعوت کا انتظام کیا۔ اور ناصر صاحب دس بارہ آدمیوں کو لائے۔ دوستوں کو کہنا بھول گئے۔ بڑا انکما لڑکا ہے۔

آج سارا دن سامان سمیٹتے اور لوگوں کا سامان بھجوانے اور بل چکاتے گزرا۔ طبیعت بہت خراب ہے۔ کل پورے بیس گھنٹے مسلسل کھڑے اور پھرتے گزرنے کے بعد رات کو لیٹی تو جسم سچ مچ پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ اور آج پھر چھے بجے سے وہی سخت مصروفیت۔ ضرورت اس کی ہے کہ فوراً علی گڑھ جاؤں اور مکمل آرام کروں۔ مگر جب تک سارا حساب کتاب نہ ہو جائے اور سب کی چیزیں ان کے گھر نہ پہنچ جائیں میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔

بنّو خلن وغیرہ کے آنے کی وجہ سے ہنگامہ اور مصروفیت اور بڑھ گئی۔ یہ لوگ پہلی بار آئے ہیں۔ نذیر اور بہن پر ظاہر ہے کہ مہمان داری کا سارا بار ہے۔ مجھے تو اس کی بھی فرصت نہیں کہ گھنٹے آدھ گھنٹے بیٹھ کر بات کر سکوں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان گھر کی پردے دار خواتین نے دلّی آتے ہی پردہ بالکل ختم کر دیا اور ہم لوگوں سے زیادہ بے تکلفی سے چل پھر رہی ہیں۔ ناصر مہدی

کے صفی پوری عزیز لڑکیوں نے بھی پردہ کو خیر باد کہہ دیا۔ زمانے کا رنگ کتنے غضب کا ہوتا ہے۔ جو لوگ سب سے زیادہ اعتراض کرتے ہیں وہ بھی اس کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔

۱۱ر فروری

عابد صاحب اور خانساماں ریل سے علی گڑھ گئے۔ میں نے طے کیا ہے کہ کل میں بھی چلی جاؤں گی۔ کہیں یہاں بیمار پڑ گئی تو اور مصیبت ہوگی۔ اردو کانفرنس تک ٹھہرنے کا ارادہ تھا مگر اب ملتوی کر دیا، ہو سکا تو پھر آ جاؤں گی۔

آج سارا حساب کتاب ہو گیا۔ زیور کپڑے وغیرہ کے علاوہ اکیس سو روپیہ اوپر سے خرچ ہوا جس میں دعوت کا خرچ، شامیانوں اور خیموں وغیرہ کا کرایہ، ملازموں وغیرہ کو انعام اور لوگوں کا سفر خرچ وغیرہ بھی شامل ہے اور کچھ برتن وغیرہ اور متفرق جہیز کا سامان بھی اور دولھا کے سامان کا خرچ بھی۔ بن بیگم کی شادی ایک ہزار کے اندر اندر ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ اس وقت نسبتاً مہنگائی کم تھی۔ کچھ یہ کہ جامعہ برادری کی آبادی چوتھائی بھی نہ تھی اور نہ گھر میں مستقل پچاس آدمیوں کی رہائش تھی۔ آخر میں تو خیال یہ ہو گیا تھا کہ شاید اس سے بھی زیادہ خرچ نہ ہو۔ لیکن چونکہ دعوت میں خرچ اندازے سے کم ہوا اس لیے پوری پڑ گئی۔ اب بنک بالکل خالی ہے اور حالت یہ ہے کہ ہر ماہ آمدنی سے دو تین سو روپیہ زیادہ خرچ ہوتا ہے۔

بھابھی جان نے آج شبو اور اس کے سسرال والوں کی دعوت کی تھی۔ ہم سب لوگ گئے اور رات کو دس بجے واپس آئے۔ شبّو ہمارے ہاں آ گئی ہے اور ناصر بھی اور آٹھ دس دن یہیں رہیں گے۔ شبو کو بھی سیادت نے روک لیا ہے اور کنیز اور بچے بھی فی الحال رک گئے ہیں۔

۱۲ر فروری

آج شام علی گڑھ واپس آ گئی ہوں۔ تکان بہت ہے۔ طبیعت بے حد کسل مند ہے۔ اگرچہ

سفر بہت اچھا گزرا۔ بچارا ڈرائیور حشمت صرف اچھا ڈرائیور ہی نہیں بہت کارگزار، ہمدرد اور محنتی آدمی بھی ہے۔ اس نے شادی میں اس قدر کام کیا کہ سب کو حیران کر دیا۔

۱۴ر فروری

ارادہ تھا کہ دن بھر آرام کروں گی مگر صبح ہی معلوم ہوا کہ زیدی صاحب دس بجے دلّی اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے جا رہے ہیں۔ چنانچہ جلدی جلدی تیار ہو کر ان کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ایک بجے دلّی پہنچے۔ معلوم ہوا زہرا، بلقیس اور میّا[۱] تینوں پرسوں سے بیمار ہیں۔ آج طبیعت بہتر تھی مگر زہرا بہت کمزور ہو گئی ہے۔ شادی میں کھانے پینے کی بد پرہیزی، سردی کھانا اور محنت۔ ان سب نے مل کر ان لوگوں کو بیمار ڈال دیا۔

شبو ریڈیو اسٹیشن ڈراما کا ریہرسل کرنے آئی تھی۔ رات کو یہیں رہے گی۔ خاصی خوش معلوم ہوتی ہے۔

۱۵ر فروری

صبح سب سے ملنے جامعہ گئی۔ سیادت حسب توقع بستر پر دراز اور تکان سے زیادہ بیماری کی شاکی تھیں۔ ببن کا بچہ سخت بیمار ہو گیا تھا۔ انیس اور ناصر بھی اچھے نہ تھے۔ کچھ دیر وہاں ٹھیری۔ ببن اور قمر کے کرائے کے لیے سوا سو روپیہ انھیں دیا۔ کچھ اور رہے سہے بل ادا کیے۔

تین بجے اردو کانفرنس کے افتتاحی جلسہ میں شرکت کی۔ زیدی صاحب نے پنڈت[۲] جی کا استقبال کیا۔ چند منٹ کی اچھی تقریر تھی۔ پنڈت جی نے تقریباً پچیس منٹ تک تقریر کی۔ اردو زبان کو سراہا، اس کے جاندار زبان ہونے پر اظہارِ مسرت کیا۔ زبانوں سے تعصب رکھنے والوں کو برا کہا۔ لیکن اس تقریر سے یہ نتیجہ نہ نکل سکا کہ وہ اردو کو علاقائی زبان بنوانے پر تیار ہیں یا نہیں۔

---

۱ مسز سیدین کی نانی ۲ پنڈت جواہر لال نہرو

پنڈت سندر لال نے مولانا آزاد کا خیر مقدم بہت جوش وخروش سے کیا۔ مولانا نے دس منٹ کی تقریر کی۔ بہت زور اور جوش میں بولے اور بتایا کہ اردو اور ہندی کی میراثی رقابت ہندی کے سرکاری زبان بن جانے کے بعد ختم ہو چکی۔ اب اردو ہندی کی جگہ نہیں اپنا حق مانگتی ہے۔ اس لئے اردو سے اب جو رقابت باقی ہے وہ پرانے اثرات اور ذہنوں کی وجہ سے ہے جو ختم ہو جانی چاہئے۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے آدھ گھنٹے سے زیادہ تقریر کی جس پر اردو کی تاریخ اور اس کے مطالبات وغیرہ پر بہت مفصل روشنی ڈالی۔ صدر جلسہ ڈاکٹر تارا چند کا خطبہ اور بھی لمبا تھا مگر دونوں تقریریں باوجود بڑی ہونے کے لوگوں نے دلچسپی اور توجہ سے سنیں۔ جلسہ میں دس ہزار کے قریب آدمی ہوں گے۔ انتظام بہت اچھا تھا۔ بہت سے ادیب وشاعر اور نقاد اور ادب نواز حضرات ملک کے گوشے گوشے سے آئے تھے۔ افسوس ہے کہ میں زیادہ نہ ٹھہر سکی۔ زیدی صاحب کا آج ہی واپس جانے کا پروگرام تھا اس لیے واپس آ گئے، مگر پھر کل صبح روانگی طے پائی۔

۱۶ر فروری

علی گڑھ واپس آ گئی۔ طبیعت ٹھیک نہیں سارا دن لیٹے گزرا۔ تھکان کچھ اور بھی بڑھ گئی ہے۔ چلی ہوں تو امن کا موڈ خراب تھا چھوٹے کا گلا خراب تھا۔ بھابھی جان اور بھائی جان رامپور روانہ ہو رہے تھے۔

۱۸ر فروری

بہت مصروف رہی۔ عابد صاحب کے کپڑے درست کیے۔ معلوم ہوا پاجامے بہت کم ہیں۔ کچھ پھٹ گئے، کچھ لوگوں کو دے دیئے۔ کچھ دھوبی کے کچھ میلے پڑے ہیں۔ اُسی وقت کھدر نکالا۔ کاٹے، سیئے، اور دھوبی کے پاس بھیجے۔ کچھ میز کے کپڑے، کشتی پوش وغیرہ بھی سیئے۔ شبو کی شادی کے سلسلے میں میرا گھر کا کام، پڑھنے لکھنے کا کام سب ہی پٹ پڑ گیا تھا۔

۱۹ر فروری

ابھی رات کی خبروں میں مولانا آزاد پر فالج کے حملے کی خبر سنی۔ طبیعت سخت پریشان ہے۔ اس دن کانفرنس میں ان کا سانس پھول رہا تھا اور میں ان کو دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ مولانا اتنے جوش میں بول رہے ہیں، کہیں خدانخواستہ بے ہوش نہ ہو جائیں۔ پھر میں نے اپنے دل ہی دل میں ملامت کی۔ کیا خبر تھی کہ یہ اندیشہ اتنی جلد حقیقت بن جائے گا۔ مولانا کی عمر، صحت اور کمزوری دیکھتے ہوئے ان کی صحت کی امید بہت کم معلوم ہوتی ہے۔

خدایا! مولانا اس وقت ہندستان کے لیے ایک رحمت ہیں۔ ہندستانی مسلمان کا سہارا ہیں۔ علم کا سہارا، ادب کا علم بردار۔ ایک عظیم شخصیت۔ ایک بلند انسان۔ خدایا! ہم گنہگار ہیں پر ہماری دعائیں سن لے اور ہمارے مولانا کو صحت عطا کر۔

۲۰ر فروری

مولانا کی صحت کی طرف سے اطمینان نہیں۔ برابر یہی خبریں مل رہی ہیں کہ حالت سیریس ہے۔

۲۱ر فروری

آج کی خبریں بہت تشویش ناک ہیں۔ صبح سے برابر ریڈیو یہی خبر دے رہا کہ مولانا کی حالت بہت نازک ہے۔ اب تو زبان سے دعا بھی نہیں نکلتی۔ جیسے مایوسی سی ہوتی جا رہی ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

۲۲ر فروری

صبح سویرے ریڈیو لگا کر نماز کی نیت باندھی ہی تھی کہ ریڈیو پر یہ جان فرسا خبر سنی کہ ہمارے

مولانا خدا کو پیارے ہو گئے۔ نہیں معلوم نماز کیسے ختم کی۔ سلام پھیرا۔ ریڈیو برابر اردو انگریزی میں یہ اعلان کر رہا تھا۔ بار بار کلام مجید کی تلاوت ہو رہی تھی۔ میں ریڈیو کے سامنے زمین پر بیٹھی بچوں کی طرح سسک سسک کر رو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت ہی عزیز بزرگ بچھڑ گیا ہو۔

سوا سات پر عابد ٹہل کر واپس آئے اور یہ خبر سنتے ہی سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئے۔ بارہ بجے جنازہ اٹھے گا اور کسی طرح اس سے پہلے دلّی پہنچنا ضروری ہے۔ فوراً سائیکل پر آدمی دوڑایا۔ آٹھ بجے تک ڈرائیور آ گیا۔ ہم لوگ جیسے تیسے جلدی جلدی سوا آٹھ پر روانہ ہوئے۔ موٹر تیز چلتا رہا اور اس سے کہیں زیادہ تیز خیالات کی پرواز تھی۔

۴۶ء سے آج تک جتنی بار ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ وہ سب یادیں آ رہی تھیں۔ ان کی محبت اور شفقت۔ ان کا حالی اور ابا[1] میاں کا بار بار تذکرہ کرنا۔ میری کتابوں کو بڑی شفقت سے قبول کرنا اور ہر بار اس بات کو سراہنا ''بہت اچھا کرتی ہو۔ کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی ہو۔ بہت اچھا کرتی ہو۔'' مجھے ترجمان القرآن کی ایک جلد اپنے دستخط کے ساتھ عنایت کرنا، یادگارِ حالی پر تعارف لکھ کر دینا، ہر سال مجھے، عابد، بھائی جان اور ان کے سب بال بچوں کو کھانے پر بلانا۔ ہائے کیسی اچھی لگتی تھی وہ دعوت جس میں مولانا ایک شفیق بزرگ میزبان کی شان سے شریک ہوتے تھے اور ہم سب لوگ بالکل ان کے خاندان کے افراد کی طرح ان کے چاروں طرف بیٹھ کر کھاتے، ہنستے اور باتیں کرتے تھے۔ اور پھر آخری بار پہلی جنوری کو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر میں نے اپنا نیا ناول پیش کیا۔ کتنے زرد اور کمزور لگ رہے تھے۔ اور ان کی آخری زیارت آج ہی کے دن اردو کانفرنس کے جلے میں ہوئی۔ شاید حمیدہ سلطان نے اسی لیے اصرار کر کے مجھے ڈائس پر لے جا کر بٹھایا تھا کہ میں اپنے مولانا کو آخری بار بہت قریب سے دیکھ لوں۔ وہ ان کی جوش و ولولہ سے بھری ہوئی تقریر۔ وہ بار بار مجھے یہ خیال آنا۔ اگر اس وقت مولانا بیہوش ہو کر گر پڑیں تو!! اور اپنے کو ملامت کرنا۔ یہ کون سی غیبی قوت میرے دل میں یہ خدشہ پیدا کراتی

---

[1] خواجہ غلام الثقلین

تھی!!! اور آج وہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ کتنی مصیبت سے لگ بھگ بارہ بجے مولانا کے گھر تک پہنچے، میل بھر تک لاکھوں آدمیوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ کسی طرح اندر جانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ بڑی مصیبت سے کسی نہ کسی طرح اندر گھسے اور پندرہ منٹ کی جدوجہد کے بعد وہاں پہنچ سکے جہاں ہمارے خاندان کے تمام خواتین اور بہت سی جاننے والیاں کھڑی تھیں۔ چند لمحے کے لئے مولانا کا آخری دیدار کر سکی۔ اس کے بعد مولانا کا جنازہ توپ گاڑی پر رکھا گیا۔ پنڈت نہرو خود تمام کام وانتظام کر رہے تھے۔ سارے کانگریس کے لیڈر اور وزیر والنٹیروں کی طرح بھاگ دوڑ اور کام میں مصروف تھے۔ صبح سے اب تک ڈھائی تین لاکھ آدمی آخری زیارت کے لیے آچکے تھے۔ کتنے لوگ رو رہے تھے...... ہر چہرے پر رنج وغم کا تاثر تھا، ہر زبان پر ان کی مدح وثنا تھی۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں کا ممدوح ومحبوب ہستی کا آخری جلوس ایک بجے گھر سے روانہ ہوا اور پونے تین پر جامع مسجد پہنچا۔ ہم لوگ پہلے ہی سے پہنچ گئے تھے اور مجھے اور صغرا کو مسز شفیق کی وجہ سے عین اسی حلقے میں جگہ مل گئی جہاں مولانا کی آخری آرام گاہ تیار کی جارہی تھی اور ان کے قریبی دوست اور ساتھی ان کا انتظار کر رہے تھے۔ لال قلعے اور جامع مسجد میں میلوں آدمیوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ جامع مسجد بجائے سرخ پتھر کے انسانی چہروں سے تعمیر کی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ پانچ چھے لاکھ سے زیادہ کا مجمع اپنے محبوب رہنما کا بے قراری سے انتظار کر رہا تھا۔ پونے تین پر جلوس پہنچا۔ آہ! اب بھی کیا رعب، کیا شان، کیا وقار تھا اس ہستی کا۔ نماز کے بعد جس وقت ان کو آغوش قبر کے سپرد کر دیا گیا تو سب لوگ رو رہے تھے۔ نہرو کا تو یہ حال تھا کہ کسی کا عزیز، محترم رفیق، مشیر، سگا بھائی بچھڑ جائے تبھی ہو سکتا ہے۔ ہائے پنڈت جی کا تو بازو ہی ٹوٹ گیا۔ اور آخر لاکھوں آدمی باچشم پرنم اپنے اپنے گھروں کو واپس سدھارے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں کچھ ایسا خلا ہو گیا ہے جو اب پُر نہ ہو سکے گا۔ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ. اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

بھائی جان پر بے حد اثر ہے۔ کئی راتوں سے سوئے نہیں ہیں۔ کئی دن سے ٹھیک سے کھایا پیا نہیں ہے۔ بھائی جان، لڑکیاں سبھی کا یہ حال ہے۔ واقعی ہمارے گھر میں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ

اس گھر کا کوئی بزرگ سدھار گیا ہے۔ ذاکر صاحب بھی بہار سے بذریعہ ہوائی جہاز عین نماز کے وقت پہنچ گئے تھے۔

دلّی میں آج ایسی ویرانی، ایسا سوگ، ایسی وحشت برس رہی ہے کہ لاکھوں آدمیوں کا مجمع بھی اس ویرانی کو دور نہیں کر سکتا۔ شاید یہ سچ ہو کہ دل اداس ہو تو دنیا اداس ہو جاتی ہے۔ دل میں خلا اور ویرانی ہو تو ساری کائنات ویران لگتی ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج
چشمِ اعدا بھی اشک بار ہے آج

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
دہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

ہرگز نہ مرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کار ساز

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نظر دلنواز

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو، رزم ہو یا بزم ہو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

۲۵ر جنوری

عابد صاحب نے مولانا کی تاریخ وفات اس مصرعہ سے نکالی ہے ع
''دل پہ آج ہجوم یاس تیرے غم میں ہے آزادؔ''
باجی نے دو مرثیے مولانا کے لیے کہے ہیں جن میں ایک اچھا ہے۔ یہ مرثیہ غالب (از حالی) کے وزن پر کہا ہے۔ بیگم (سیدہ فرحت) نے بھی ایک پراثر اور عمدہ نظم کہی ہے۔ دراصل یہ تضمین ہے اس شعر کی ''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا''
کئی دن سے ارادہ کر رہی ہوں کہ مولانا پر ایک مضمون لکھوں۔ لیکن دل پر ابھی تک بہت اثر ہے۔ سوچتی ہوں، مہینہ بیس دن بعد لکھنا شروع کروں۔ اسی وقت جذبات کی شدت غالب آجائے گی...... لیکن محسوس کر رہی ہوں کہ جب تک کچھ نہ کچھ لکھ نہ لوں گی دل پر جو بوجھ ہے اُس میں کمی نہ آئے گی۔ ہر ایسے موقع پر اگر میں کچھ کچھ نہیں ہوں تو میرے دل کو سکون مل جاتا ہے۔
حمیدہ سلطان نے انجمن ترقی اردو شاخ دہلی اور سہیلی سبھا کی طرف سے تعزیتی جلسوں میں مجھے تقریر کرنے کے لیے بلایا ہے۔ مگر مجبوراً میں نے معذرت کر دی۔ اس لیے پچھلے تین ہفتوں میں چار سفر دہلی کے کر چکی ہوں اور اب نہ جیب میں گنجائش ہے اور نہ جسم میں طاقت! جامعہ میں یوم رسوؔا ہو رہا ہے۔ اس میں بھی مقالہ پڑھنے کا وعدہ تھا۔ اس کی بھی معذرت کرنی پڑی۔ یکم مارچ کو انڈو پاکستان مشاعرہ کا بلاوا آیا۔ اس میں ظاہر ہے کہ شرکت کرنا ناممکن ہے۔ علی گڑھ آکر بہت سی میری دلچسپیاں تو ختم ہو گئیں۔

۲۶ر فروری

'رالف رسل'[۱] ایک انگریز ہے، جو اردو کا اسکالر ہے۔ پہلے بھی ہندوستان آچکا ہے اور اردو زبان کو بڑی الفت سے سیکھتا رہا ہے۔ آٹھ سال بعد پھر آیا ہے۔ ہم نے اُسے ۲۲ تاریخ کو کھانے

[۱] مشہور اردوداں انگریز

پر بلایا تھا مگر اس دن مولانا کی وفات کی وجہ سے دلّی جانا پڑا۔ چنانچہ اب آج اسے مدعو کیا ہے رات کھانے پر۔ خورشید الاسلام اور وامق[1] ولی اصاحب کے علاوہ بیگم کو بھی بلا لیا۔ سرور صاحب کو بلایا تھا مگر وہ موجود نہیں۔ رشید صدیقی صاحب سے بہت اصرار کیا مگر وہ غالباً کہیں بھی آتے جاتے نہیں۔ آج کا تقریباً پورا دن پکانے اور دعوت کی تیاری میں صرف ہوا۔ چاہے چار آدمیوں کی دعوت ہو یا چودہ کی، وقت اتنا ہی صرف ہو جاتا ہے۔ ننھے چچا بھی آج واپس گئے۔ ان کے لئے ناشتہ وغیرہ تیار کرایا۔ دعوت اچھی رہی۔ کھانے کے بعد خورشید، فرحت اور وامق نے اپنا کلام سنایا۔ خورشید الاسلام بہت کم کہتے ہیں مگر اچھا کہتے ہیں۔ آدمی تیز ذہین ہیں مگر بہت ہی حساس اور زود رنج واقع ہوئے ہیں۔ اگر چہ ابھی تک ہم لوگوں سے بہت خوش ہیں۔ وامق کے کلام میں بہت سی خوبیاں ہیں مگر وہ تڑپ اور وہ جوش نہیں جو شاعری میں جان ڈالتی ہے۔ بقول عابد کے وہ امید ورجا کا پیام بھی کچھ رورو کر دیتے ہیں۔ پھر بھی ان کے ہاں کلام کے دیگر محاسن اور سب سے بڑی چیز خلوص ہے جو ان کے کلام میں اثر پیدا کرتا ہے۔ سیدہ فرحت کو اگر چہ گھر داری کی چکّی اور بچوں کی خدمت بہت کم موقع کہنے کا دیتی ہے پھر بھی وہ ترقی کر رہی ہے۔ کہیں اُسے کوئی پروپیگنڈہ کرنے والا مل جاتا اور تھوڑا سا گانا آتا تو اس کا نام بہت مشہور ہو جاتا۔ لیکن اب بھی صاحب ذوق حضرات اس کا کلام پسند کرتے ہیں۔ اثر[2] صاحب اس کے استاد اور مداح ہیں اور اس کی کتاب (جو فروغِ اردو نے چھاپنے کا وعدہ کیا ہے) پر بہت اچھا دیباچہ لکھا ہے۔ ایک بار جامعہ کے ایک مشاعرہ میں جگر صاحب نے اس کا کلام سنا اور بہت تعریف کی۔

۲۸ رفروری

کئی سال ہوئے میں نے ''اپنی کہانی'' لکھنی شروع کی تھی جو اماں کے انتقال کے واقعہ تک لکھی جا سکی۔ یعنی اس وقت تک کا حال جب میری عمر پندرہ سال کی تھی۔ ارادہ خلوص اور یقین

---

[1] شاہجہاں پوری [2] آثر لکھنوی

کے ساتھ تھا اور ہے کہ اِسے پورا کروں گی۔ شاید میرے بڑھاپے میں یا میرے بعد جب وہ چھپے تو وہ ایک اچھی چیز ہو۔ لیکن آگے لکھنے کا موقع اب تک نہیں ملا، آج کی کاپی نکال کر پڑھتی رہی۔ اس نظر سے گویا کسی اور کی کہانی کوئی اور پڑھ رہا ہے۔ اگر چہ بہت مشکل ہے کہ آدمی ذاتی جذبات کو الگ رکھ سکے مگر میری کوشش یہی تھی۔ بہر حال کم سے کم مجھے وہ دلچسپ چیز معلوم ہوتی ہے۔ آج کل لکھنے کا کوئی اور خاص کام کر رہی ہوں۔ افسانے لکھنے کی تو عادت ہی چھوٹ گئی۔ ریڈیو کی تقریریں بھی یہاں آکر ختم ہوگئی ہیں۔ فرمائشی مضمون اور کہانیاں لکھنا طبیعت کو کچھ گوارا نہیں ہوتا اور نیا ناول ابھی شروع نہیں کرنا چاہتی۔

حمیدہ[1] شام کو ملنے آئی تھی۔ میں اور باجی اور ساجدہ سے ملنے گئے۔ سالم[2] بھی وہاں پہنچ گئے۔ ساجدہ کے ان سے بحث ہوتی رہی۔ دونوں ایک دوسرے پر بلکہ کہنا چاہیے کمیونسٹوں اور غیر کمیونسٹوں پر فقرے کستے رہے۔ پھر ساجدہ نے ان سب کو کباب اور پوریاں کھلائیں۔ ٹہل کر واپس آرہے تھے کہ بشیر[3] صاحب، ان کی بیگم اور بہو مل گئیں اور اصرار کر کے اپنے ہاں لے گئیں۔ کچھ دیر وہاں بیٹھے۔ واپسی میں بوندا باندی شروع ہوگئی اور اب خوب بارش ہو رہی ہے۔ بادل تو نہیں دن سا تھا۔ یہ وہ بارش ہے جو عموماً فروری کے شروع میں ہوتی ہے۔ خدا نے بڑا کرم کیا کہ اس بار دیر سے ہوئی ورنہ شادی کے زمانے میں ہوتو لوگوں کو بڑی مشکل ہوتی۔

۲۸ر فروری

شام کو این۔ آر۔ سی کلب میں ایٹ ہوم میں بلایا گیا تھا۔ مگر وہاں جا کر معلوم ہوا کہ سوا میرے اور بیگم کے کوئی بھی اور عورت نہیں اور بھانت بھانت کے ڈیڑھ سو کے قریب مرد تھے۔ بہت کوفت ہوئی۔

ساڑھے چھ بجے گرلز کالج میں بیت بازی کا مقابلہ تھا جس میں مجھے جج کرنے کے لیے بلایا

[1] حمیدہ سالم [2] پروفیسر ابو سالم [3] بشیر الدین لائبریرین

گیا تھا۔ بیت بازی شروع ہوئی۔ پہلے ڈے اسکالر لڑکیوں اور سلطانیہ ہوسٹل کی لڑکیوں میں ہوئی۔ پہلی بار این آر ایس سی کی لڑکیاں جیت گئیں۔ ان میں دو لڑکیاں بہت عمدہ شعر دیتی ہیں اور بہت اچھی پڑھتی ہیں۔ پھر اس ٹیم کی وحیدیہ ہوسٹل سے بیت بحثی ہوئی۔ میرے علاوہ شہناز[1] اور سلمہ[2] جج تھیں۔ دوسری بار سلمہ نے صریحی طرفداری کی۔ حالانکہ خود بھی معترف تھیں کہ ڈے اسکالر لڑکیاں بہت اچھے شعر دے رہی ہیں۔ پھر بھی نمبر انھیں بہت کم، اتنے کم دیئے کہ میرے اور شہناز دونوں کے ملا کر بھی برابر نہ ہو سکے اور زبردستی انھوں نے وحیدیہ ہوسٹل کو جتا دیا۔ ہم لوگوں نے اپنی طرف سے سالم[3] کی بہن شمیمہ کو جو تھرڈ ایئر میں پڑھتی ہے، بڑی ذہین اور خوش ذوق لڑکی ہے، اپنی طرف سے ایک انعام دینے کا اعلان کیا۔ اس لڑکی کی ٹریجڈی یہ ہے کہ اس کا قد قامت، ہاتھ پاؤں مشکل سے تین سال کے بچے کے برابر ہیں اور ذہن و دماغ نہایت اعلیٰ درجہ کا۔ بڑی حساس، بڑی سمجھدار، بڑی متوازن لڑکی ہے۔ سوچتی ہوں کہ اس کا کیا ہوگا؟ شادی نہیں ہو سکتی۔ نوکری کر نہیں سکتی۔ غریب اپنا کام بھی اچھی طرح سے نہیں کر پاتی ہے۔

۴ر مارچ

رسل سے بات ہوئی۔ وہ خوشی سے مجھے پڑھانے اور اس سے زیادہ خوشی سے پڑھنے پر آمادہ ہے۔ کل سے سبق شروع ہو جائے گا۔ ایک دن میں اُسے پڑھاؤں گی۔ ایک دن وہ مجھے۔

آج شام کو ڈاکٹر نورالحسن کی والدہ سے ملنے ہم لوگ گئے۔ پرسوں نورالحسن، ان کی بیوی اور والد ہم سے ملنے آئے تھے۔ وہاں گفتگو اُردو اور سیاست پر ہوتی رہی۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ دس برس کے اندر اندر سب مسلمان بچے بھی ہندی پڑھیں گے اور اردو کا سوال ہی باقی نہ رہے گا۔ ان کا کہنا تھا کہ اب بھی کم سے کم یو پی میں، مسلمان ماں باپ بچوں کو صرف ہندی پڑھانا چاہتے ہیں۔ میں سمجھی یہ محض دوسروں کی بات کہہ رہے ہیں، لیکن جب ڈان (مسز نورالحسن کی بیوی) نے

---

[1] شہناز ہاشمی [2] سلمہ صدیقی [3] پروفیسر ابو سالم

کہا کہ ہم نے اپنے بچوں کو مسوری اسکول میں ہندی پڑھوائی ہے۔تو میری سمجھ میں آ گیا۔ پہلے یہی امیروں کا طبقہ حاکم قوم انگریز کی زبان سے بچوں سے الف بے کراتا تھا۔اب انگریزی اور ہندی دونوں حاکموں کی زبان ٹھہری۔ ایک ان کے روحانی گرو،دوسرے ملک کے' حاکم'۔ (حالانکہ جمہوریت میں حاکم عوام ہوتے ہیں اکثریت نہیں) پھر بچاری اردو کو کیوں پوچھا جائے۔

۱۲/مارچ

آج شام بھابی جان آئی ہیں۔ان سے بہت سی باتیں ہوئیں۔اقبال[۱] کو اب ٹائیفائڈ تجویز ہوا ہے اور اس کی دوا ہو رہی ہے۔زہرا عنقریب لندن روانہ ہونے والی ہے۔ باچھو بمبئی واپس آگئے ہیں۔

آج کل اخباروں میں یہ خبر بہت گرم ہے کہ ذاکر صاحب سے ایجوکیشن منسٹر ہونے کے لئے کہا گیا تھا مگر انھوں نے بر بنائے صحت انکار کر دیا۔ میں اور عابد صاحب برابر یہی کہتے رہے کہ یہ افواہ ہے۔آج بھابھی جان سے اس کی تصدیق ہوگئی کہ اس کی کوئی اصلیت نہیں۔امکانِ غالب یہ ہے کہ بجائے ذاکر صاحب کے مسلمان وزیر حافظ ابراہیم کو لیا جائے تا کہ پنت صاحب کا ہاتھ مضبوط ہو اور تعلیم کا کام شری مالی ہی کرتے رہیں۔ایسا ہوا تو بھائی جان کے لیے بڑی مشکل پیش آئے گی۔افسوس ہے کہ پنڈت جی نے ذاکر صاحب کی تعلیمی صلاحیتوں، ذہانت و قابلیت اور خلوص وحب الوطنی سے ملک کو فائدہ پہنچانے کا موقع کھو دیا۔ویسے ہی موقعوں پر مولانا ان کی رہنمائی کرتے تھے۔اب کون کرے؟ ذاکر صاحب آتے تو مولانا کی کمی اتنی زیادہ شاید نہ محسوس ہوتی۔یعنی سیاست میں۔

---

[۱] ڈاکٹر اقبال مہدی عابد صاحب کے بھانجے

۱۳/مارچ

بھابھی جان کے ساتھ دو چار جگہ ملنے گئے۔ کوئی ملا کوئی نہیں۔ دن مصروفیت کا گزرا۔ حمیدہ، باجی اور دیگر لوگ ملنے کے لیے آتے رہے۔ رسل صاحب برابر آرہے ہیں۔ ایک دن وہ پڑھتے ہیں ایک دن میں ان سے پڑھتی ہوں۔ بڑا ذہین اور شوقین آدمی ہے۔

۱۶/مارچ

شام کو عابد صاحب واپس آگئے۔ اقبال کو ایکسرے وغیرہ کے بعد پلورسی تشخیص ہوئی ہے۔ کل ڈاکٹر سکند دلی کے مشہور ٹی۔ پی اسپیشلسٹ کو دکھایا گیا۔ ڈاکٹر نے ایک سال تعلیم چھوڑ دینے کا مشورہ بھی دیا ہے اور بہت احتیاط، آرام اور دوا غذا کا خیال رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ یہ سب وہاں کیسے ہوگا؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ ماں ہیں مامتا مجبور کرتی ہے کہ خدمت اور تیمارداری بھی کریں، پریشان بھی ہوں مگر اپنی عادت اور مزاج سے مجبور ہیں۔ پچیس برس میری شادی کو ہوگئے شاید ہی کوئی مبارک چھ ماہ یا سال ایسا گزرا ہو جس میں کوئی نہ کوئی فرد سخت بیمار نہ ہوا ہو اور اس کی پریشانی، (اکثر تیمارداری) اور اس موذی بیماری کے اخراجات اور نتائج نہ بھگتنے پڑے ہوں۔ ہر سال جاڑوں میں پہلے میں اور پھر سیادت کا چکر چلا، گرمیوں میں شبو مہینوں سخت بیمار رہی، اس سال سیادت تو خیر دائم المرض ٹھیریں اور یوں بھی تھوڑا بہت سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے سب لوگوں کا، مگر اقبال کی بیماری نے پھر سے پریشان کر دیا۔ نوجوان بچہ ہے اور پھر خلقاً کمزور۔ خدا اُسے صحت وطاقت عطا کرے۔

۱۷/مارچ

صبح رسل صاحب کو انیس پڑھا ہی رہی تھی کہ حمیدہ سلطان ملنے آگئیں۔ دو گھنٹے ان سے

بات چیت رہی۔ مولانا کے بارے میں زیادہ دیر تک باتیں ہوئیں۔ یہ بچاری خلوص ومحبت کی آدمی ہیں۔ اردو کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرتی رہی ہیں اور لگن اور محنت سے کرتی ہیں لیکن ذرا ''خبطا'' ٹائپ ہے اور اسی لیے لوگ ان سے گھبراتے ہیں اور ان پر فقرے کستے ہیں۔

شام کو ڈاکٹر محمد حسن اور ان کی نئی دلہن سے ملنے گئی۔ وہ دو بار ہمارے ہاں آ چکے تھے۔ انھوں نے اپنی ہی ایک شاگرد سے جو اس سال ایم اے پر یویس کر رہی ہے، شادی کی ہے۔ باجی کے پاس بھی گئی۔ ان کی طبیعت کچھ صاف نہیں۔ کافی گھبرا رہی تھی۔ میں نے دو دوائیں انھیں بھیج دی ہیں۔

عابد صاحب کی طبیعت کئی دن سے ٹھیک نہیں ہے اور سفر کی وجہ سے تکان اور سستی ہوگئی ہے۔ کل شام خبر ملی کہ اچانک ڈاکٹر عبدالحق (مدراسی) کا انتقال ہوگیا۔ بہت سخت افسوس ہوا۔ علی گڑھ میں عام طور پر لوگوں پر بہت اثر ہے۔ وہ ڈیڑھ سال تک علی گڑھ میں پی۔ وی۔ سی رہ چکے تھے۔ بڑی قابل اور اہم ہستی تھی۔ جنوب میں انھوں نے بہت کچھ تعلیمی کام سرانجام دیے۔ وہ ساؤتھ کے سرسید کہلاتے تھے۔ بڑے سچے مسلمان اور مخلص اور قابل انسان تھے۔ افسوس ساٹھ سے بھی کم عمر پائی۔ مسلمانوں کی کیا بدقسمتی ہے کہ جس سے قوم کی بہبود کی امیدیں وابستہ کی جاتی ہیں خدا کو پیارا ہو جاتا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

۲۲ر مارچ

آج صغرا، مجید اور خانساماں کا روزہ تھا۔

مونس رضا نے معصوم رضا راہی کی طویل نظم ۱۸۵۷ء پر، سنوانے کے لیے بلایا تھا۔ ہم دونوں گئے۔ قدسیہ اور انور مجیب اور دو تین اور آدمی موجود تھے۔ بڑی خوبصورت، زوردار اور عمدہ نظم ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم نے کہیں کہیں سے اس کے ٹکڑے سنے۔ بعض تو بہت ہی اچھے تھے۔ یہ پانچ ہزار اشعار کی طویل نظم ہوگی۔ اب تک تین ہزار اشعار کہہ چکے ہیں۔ بچارے کی صحت اچھی نہیں، کہتے ہیں اُسے بھی ٹی بی ہے۔ بڑا افسوس ہوا یہ سن کر۔

۴/ اپریل

ساجدہ[1]، قیصر[2] اوران کے کچھ دوست پکنک کے لیے نوراجا رہے ہیں۔ مجھے بھی مدعو کیا مگر ایک تو گلے میں ابھی تک کافی تکلیف ہے اور دوائیں جاری ہیں۔ دوسرے ان لوگوں کا وہاں رات کو ٹھیرنے کا قصد ہے۔ ہمارے لیے اس طرح جانا دشوار ہے۔ عابد صاحب کے معمولات میں فرق آئے تو انھیں تکلیف ہو جاتی ہے۔ اس لیے میں نے انکار کر دیا۔ ارادہ تھا کہ ۷/ اپریل[3] کو سالگرہ منانے آگرہ جاؤں۔ عابد صاحب کو بھی رضامند کر لیا تھا۔ مگر حشمت (ڈرائیور) کے روزے ہو رہے ہیں اس لئے میں نے سوچا کہ اُسے تکلیف ہوگی اس لیے ارادہ ملتوی کر دیا۔ اب ۷ تاریخ کو کچھ لوگوں کو کھانے پر بلانے کا ارادہ ہے۔ اگر چہ دلّی کے کوئی بھی عزیز شریک نہیں ہو رہے اس کا غم ہے۔ شبو، ناصر، اقبال، جو ہر سال ہوتے تھے وہ بھی اقبال کی بیماری کی وجہ سے نہ آسکیں گے۔ جی چاہتا تھا کہ یہ سلور جوبلی ذرا اچھی طرح کی جائے۔ مگر حالات اکثر دل کی خواہشیں پوری نہیں ہونے دیتے۔

☆☆☆

۱۔ عابد صاحب کی بھانجی ۲۔ قیصر حسین زیدی ساجدہ کے میاں ۳۔ ۷/ اپریل کو ان کی شادی کی سالگرہ ہوتی تھی۔

1959

۸؍جنوری

مختلف موقعوں پر کچھ تنقیدی مضامین لکھے تھے۔ آج اُن کو دیکھ رہی تھی۔ خیال آیا کہ کیوں نہ ان کا مجموعہ مرتب کر کے چھپوانے کی کوشش کی جائے۔ اس قسم کے مضامین ۹۔۱۰ ہیں۔ دو حالی پر ہیں، تین غالب پر ہیں۔ ایک رتن ناتھ سرشار کے ناول فسانہ آزاد پر ہے۔ ایک نذیر احمد کی دلی۔ ریڈیو تقریر ہے۔ ایک شاعری پر ہے اور ایک ادبی ڈراما مومن خاں مومن پر ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ مجموعہ چھپ جائے تو ایسا غیر مقبول بھی نہ ہوگا۔

آج رات اندور سے ریڈیو مشاعرہ ہوا۔ ڈیڑھ گھنٹے کا اچھا صاف ستھرا مشاعرہ تھا۔ گھٹیا شاعر صرف دو تھے، روش، جذبی، تاباں، شاداں کی غزلیں اچھی تھیں۔ خاص طور پر شاداں کو پہلی بار سنا اور بہت پسند آئے۔ روش کے دو تین اچھے شعر یاد رہ گئے۔

شوخیِ نقشِ تمنا پہ نہ جا
رنگ بھرتے ہیں مٹانے کے لیے
ہم نے سو داغ سہے ہیں دل پر
ان کے دامن کو بچانے کے لیے

میں تو سمجھتی ہوں کہ اس دور کے شاعروں میں جگر کے بعد روش[1] ہی کا مقام آتا ہے۔ ابھی

[1] روش صدیقی

وہ جوان ہیں، مشق جاری ہے۔ اگر اس طرح ترقی کرتے رہے تو کوئی عجیب نہیں کہ ایک دن اردو کے چوٹی شعرا کی صف میں جگہ پائیں۔ اگرچہ ہمارے ترقی پسند دوست روش کے شعروں کو پسند نہیں کرتے۔ اس لیے کہ اس میں سوشلزم کا پیام نہیں ہوتا۔ اگر کوئی پیام ہوتا ہے تو عام انسانی اخلاقی قدروں کا یا پھر گاندھی کی تعلیم کا ان پر کافی اثر ہے۔

۹ر جنوری

اپنے تنقیدی مضامین کے لیے ناظر کاکوری صاحب کو خط لکھا ہے۔ وہ مجھ پر بہت مہربان ہیں اور اکثر میرے مضامین وغیرہ کی تعریف میں خط لکھا کرتے ہیں۔ میرے مذہبی مضامین ''سلکِ گہر'' کو اپنے پبلشرز سے چھپوانا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے اس مجموعہ کو بھی وہ پبلشر چھاپنے پر آمادہ ہو جائے۔

آج اردو ہفتے کا افتتاح تھا۔ زیدی صاحب نے افتتاح کیا۔ تقریر بہت مختصر اور یونہی سی تھی۔ سرور صاحب نے حسب عادت تمہید ہی میں کافی وقت لے لیا۔ سمپوزیم کا موضوع تھا ''ادب اور نظریہ''۔ لکھنؤ اور دلی سے حصہ لینے والے ادیب نہیں آئے۔ پٹنہ سے اختر اور رینوی البتہ آئے ہیں۔ بحث کا آغاز انھوں نے ہی کیا۔ یوسف حسین خاں ان کے بعد بولے۔ اس کے بعد ڈاکٹر علیم نے تقریر کی۔ اختر اور یوسف تقریباً ہم خیال تھے اور علیم اشترا کی نقطۂ نظر کے حامی۔ تقریر علیم صاحب کرنا جانتے ہیں۔ خیالات میں وضاحت بھی ہے اور نقطۂ نظر تنگ ہے۔ اول الذکر دونوں حضرات اِدھر اُدھر بہک گئے تھے۔ دراصل موضوع ہی گنجلک سا تھا، ''ادب میں نظریہ کا مقام!'' مگر کس نظریے؟ کس خاص ازم کا؟ کس خاص سیاسی یا مذہبی نقطۂ نظر کا یا عام اخلاقی اقدار کا؟ یہ بات کسی نے صاف نہ کی۔ نظریہ کے معنی اگر کسی خاص نظام کے ماتحت ادب کی تخلیق ہے تو کہنے والے لاکھ کچھ کہیں وہ پھر پروپیگنڈا یا صحافتی ادب بن جاتا ہے۔ علیم صاحب نے فرمایا بھی کہ ''غلاف چڑھا کر پیش کرنا چاہیے'' لیکن آخر یہ بھی تو ہوسکتا ہے (اور ہوتا ہے) کہ

مختلف نظریہ رکھنے والے ایک قسم کے اخلاقی اقدار کے پابند ہوں! منزل مقصود ایک ہو۔ راستے مختلف ہوں۔ اگر کوئی ادیب دنیا میں مساوات، انصاف، امن، راحت، معاشی برابری اور سب انسانوں کو زندہ رہنے اور زندگی سے لطف اٹھانے کا برابر حق دینا چاہتا ہے تو خواہ وہ اسلامی اقدار کا پرستار ہو، خواہ ہندوازم کا ماننے والا ہو، خواہ اشترا کی نظام کا دلدادہ۔ وہ اپنے ادب میں ان کو پیش کرسکتا ہے اور اس کا نظریہ درست کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً میں اسلامی قدروں کو سچا سمجھتی ہوں، کوئی دوسرا ادیب ہندو مذہب میں وہی قدریں پاتا ہے اور تیسرا کسی تیسرے نظریہ میں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مقصود ان اعلیٰ اخلاقی قدروں اور سماجی برابری پھیلانے کا ہے یا اس کا کہ ہر ادیب جب تک کسی مخصوص نظام کو نہ مانتا ہو، کسی خاص نظریہ کا پابند نہ ہو آپ اسے اچھا ادیب اور اس کے ادب کو بلند پایہ ادب ماننے پر تیار نہ ہوں گے۔

جلسے میں علی گڑھ کے ادیب، شاعر، نقاد اور ادب دوست حضرات کافی تھے مگر طالب علم بہت کم تھے۔ البتہ عورتیں کافی تھیں جن میں سے زیادہ تر گرلز کالج کی استانیاں اور ایم اے کی یا اردو لٹریچر کی لڑکیاں تھیں۔ یہاں پانچ ہزار طالب علموں کی یونیورسٹی میں جہاں اکثر اردو پڑھنے والے ہیں۔ سو سوا سو طالب علم جمع ہو سکتے تھے۔ حالانکہ سال گزشتہ جب میں گیا کالج کی بزم ادب کی صدارت کے لیے گئی تھی تو اس چھوٹے سے کالج کی اس بزم میں تقریباً ۹ سو یا ہزار آدمیوں کا مجمع تھا جن میں اکثریت طلبا کی تھی اور یہاں سارا مجمع ہی ملا کر دو سو سے زیادہ نہ ہوگا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے طالب علموں کی سنجیدہ چیزوں سے کتنا کم لگاؤ ہے۔ البتہ کل کے مشاعرہ میں اتنا ہجوم ہوگا کہ انتظام مشکل ہو جائے گا۔ اس لئے کہ مقصد ہلڑ بازی کرنا اور گلے بازی سے لطف اٹھانا ہے۔ شعر وادب سے کوئی ذوق بہت ہی کم لوگوں کو ہے۔

۱۰ر جنوری

اردو ہفتے کا مشاعرہ آج چھے بجے سے تھا جو پونے سات پر سرور صاحب کی اس تمہید کے

ساتھ شروع ہوا کہ ''اس بزم سخن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بہت وقت پر شروع ہو رہا ہے'' مشاعرے میں خواتین و حضرات نے وقت سے پہلے پہنچ کر سیٹوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ طالب علموں کا مجمع بھی کافی تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ لاؤڈ سپیکر خراب تھے اور آگے کی صفوں میں بیٹھنے والے بھی شاعروں کا کلام بہت کم سن پائے۔ بہت سے مقامی مشاعروں کو خوہ مخواہ بھر لیا گیا تھا۔ لکھنؤ کے کوئی حبیب احمد صدیقی اور سنہا صاحب آئے تھے۔ حبیب اچھے خاصے شاعر ہیں اور سنہا معمولی۔ اختر ارینوی تو بالکل اکتسابی شاعر ہیں۔ سرور صاحب کے شعروں میں بھی وہ جان اور تڑپ نہیں ہوتی جو شعر کی جان ہے۔ اختر انصاری بہت اچھے شاعر سہی مگر وہی پرانے قطعہ سنانے پر بس کرتے ہیں۔ ایک گونڈے کے شاعر حیرت بھی آئے تھے۔ ان کا بہت کم کلام سن پائی مگر یہ شخص بہت خوب کہتا ہے۔ چھوٹی بحر کی سات آٹھ شعروں کی بڑی پیاری غزل انھوں نے سنائی۔ دلی سے جگن ناتھ آزاد اور تاباں آئے تھے۔ تاباں نے عرصہ بعد ایک نئی غزل سنائی جو اچھی تھی۔ آزاد نے اپنے جمہور نامہ کے چند بند سنائے۔ لڑکوں نے حسب عادت سی سی اور سُو سُو اور ناپسند شاعروں پر فقرہ بازی کافی کی لیکن ذرا آہستہ یعنی ہم سن سکتے تھے لیکن خود شاعر نہیں۔ انتظام کچھ خاص اچھا نہیں تھا۔ ہڑبونگ سی تھی۔ سب سے زیادہ سیدہ فرحت (بیگم) کی نظم بھی ''سیاست سے مجھے سروکار نہیں'' پسند کی گئی۔ مسز کاظمی بچاری کو خدا جانے کیا شوق ہے شعر کہنے اور پڑھنے کا جبکہ دونوں سے کوری ہیں اور خواہ مخواہ تضحیک کا نشانہ بنتی ہیں۔ زاہدہ[1] کے قطعے اور غزل اچھی تھی مگر آواز اتنی چھوٹی ہے کہ لوگ پوری طرح سن نہیں سکتے۔ مجھے تو اس مشاعرے سے خاص مایوسی ہوتی۔ توقع یہ تھی کہ علی گڑھ جیسی جگہ میں بڑا عمدہ اور کامیاب مشاعرہ ہوگا مگر نام بڑا درشن چھوٹے کا قصہ ہے۔

۱۸ر جنوری

سردی کم ہوگئی ہے۔ مگر کہرا اور بادل کا سلسلہ جاری ہے۔ بھابھی جان آج واپس چلی

---

[1] زاہدہ زیدی

گئیں۔کل کی چوٹ آج دن بھر تکلیف دیتی رہی۔لالہ رُخ میں مجلس میں گئی۔کوئی مولوی طاہر ہیں انھوں نے پڑھا تھا۔ مجھے تو پسند نہیں آیا۔عجب بے ربط سا بیان اور وہی تیرہ ساڑھے تیرہ سو برس پرانا مسئلہ یا پھر سائنس اور مذہب کو مطابق کرنے کی کوشش۔مجھے پردۂ غفلت[۱] کے شیخ جی کا یہ جملہ اکثر ایسے موقع پر یاد آجاتا ہے جو انھوں نے مذہبی بحث کے دوران میں کہا تھا کہ ''بھائی میں سائنس سے مذہب کو ثابت کرنے کا قائل نہیں، البتہ مذہب سے سائنس کو ثابت کر سکتا ہوں۔'' وہاں سے میرا بلاوا نہیں آیا تھا محض مجلس میں شرکت کے لیے چلی گئی تھی۔ وہاں خواتین پیچھے پڑ گئیں کہ کھانا کھا کر جانا مگر میں نے عذر کیا اور چلی آئی۔یوں بھی اتنے بڑے رئیس گھر میں بد انتظامی اور گڑ بڑ بہت زیادہ تھی۔اس خاندان میں بھی زمینداری نظام کے ساری نشانیاں موجود ہیں۔گھٹی ہوئی فضا، مردوں کی تن آسانی اور عیاشی۔عورتوں کی جہالت اور تنگ نظری اور اس گھٹے ماحول کے نتیجے میں غیر اخلاقی حرکات۔شان اور غرور، شیخی اور جہالت سبھی میں کسی نہ کسی حد تک نظر آتی ہیں۔سب سے افسوس کی بات یہ ہے کہ عورتیں لونڈیوں سے کچھ بہتر معلوم نہیں ہوتیں۔

۱۹؍جنوری

لاکھ کوشش کے باوجود لکھنے کا وقت نہیں ملتا۔کبھی کوئی آ گیا، کبھی کوئی آگیا۔گھر کے مختلف کام، ہنگامے، جھگڑے اور کچھ نہیں تو صغرا اور نرجس[۲] کی مسلسل باتیں۔پھر نرجس اور پروین کو پڑھانے میں کافی وقت نکل جاتا ہے۔نرجس پنجاب سے ایف اے کے لیے امتحان پڑھ رہی ہیں۔دونوں کی اردو اچھی نہیں اور پڑھانے میں جو لطف و مسرت حاصل ہونا چاہیے وہ نہیں ہوتا۔

آج اختر حسن کی لڑکی کی شادی ہے لیکن دوپہر سے بادل اور تیسرے پہر سے بوندا باندی ہو رہی ہے۔دعوت ہم لوگوں کی بھی ہے۔جانا تو پڑے گا مگر اس موسم میں ہمت نہیں پڑ رہی ہے۔

رات صابرہ اور ساجدہ آئی تھیں۔بہت سی انگریزی کی کتابیں خرید کر لائی تھیں۔ان میں

---

[۱] ڈاکٹر عابد حسین کا ڈرامہ [۲] نرجس عباس صالحہ عابد حسین کی بھتیجی

سے دو میں نے بھی پڑھنے کے لیے لی ہیں۔ ''سینٹ جون'' اور ایک ناول All things Betray Thee جو Guian Thomas کا لکھا ہوا ہے۔ آج اس ناول کو پڑھنا شروع کیا۔ زبان خاصی مشکل ہے میرے لیے اور شروع میں تو کوئی خاص دلچسپ بھی نہیں۔ لیکن غالباً آگے چل کر دلچسپی بڑھتی جائے گی۔ مشکل یہ ہے کہ انگریزی کتابیں پڑھنے کے لیے بھی وقت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ملنا محال ہے۔ اردو جتنی تیز پڑھتی ہوں انگریزی ظاہر ہے کہ اس سے بہت سست رفتاری سے پڑھتی ہوں۔

۲۰ر جنوری

باقر کے نویں کی مجلس مسز زیدی کے طرف سے ساجدہ کے گھر آج ہوئی۔ مسز زیدی پر اس کی موت کا بہت اثر ہے۔ اس کا ذکر کرتے کرتے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہیں۔ ان کو حد سے زیادہ قلق اس کا ہے کہ آخری وقت میں وہ ماں کو یاد کرتا رہا اور وہ اُنھیں نہ بلا سکیں۔ ظاہر ہے کہ پاکستان سے اس طرح بلانا اور آنا کتنا دشوار ہوتا ہے۔ مجلس میں حضرت علی اکبر کے حال کے مرثیے پڑھے گئے۔ بیویاں کافی آگئی تھیں اور اس حادثہ سے متاثر ہو کر اور زیادہ امام زادے کی بے کسی پر آنسو بہا رہی تھیں۔

کل کی رات اختر حسن کے ہاں شادی میں شرکت کے لیے گئی۔ علی گڑھ کی خواتین کا کافی بڑا مجمع تھا۔ انتظام اچھا خاصا تھا اور ان کی خاندان اور دوستوں کی تیس چالیس لڑکیاں اور عورتیں انتظام میں لگی ہوئی تھیں۔ یہاں کی خواتین کو جتنی دلچسپی شادیوں، منگنیوں، دعوتوں وغیرہ سے ہے اور کسی چیز سے نہیں۔ ایک مضحکہ خیز بات یہاں میں نے یہ بھی دیکھی کہ ہر قسم کے فنکشن جلسے وغیرہ ہمیشہ وقت سے بہت بعد شروع ہوں گے۔ لیکن جہاں چائے پارٹی، یا دعوت وغیرہ کا سوال ہو، وہاں سب کچھ وقت پر ہو جاتا ہے اس لیے کہ مہمانانِ عزیز بڑے وقت سے پہنچ جاتے ہیں۔ صرف اسی ایک موقع پر مرد اور عورت دونوں پابندیٔ وقت کا لحاظ رکھتے ہیں۔

۲۱/جنوری

افسر مہدی[1] میلادِ علی کا بلاوا دینے اور چندہ لینے آج آئے تھے۔ علی گڑھ میں آکر چندوں اور مانگنے والوں کا زور بہت بڑھ گیا ہے اور غیر مستحق سوال کرنے بہت کثرت سے ہیں اور مجھ سے کسی سے انکار کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

کل ایک سخت افسوسناک حادثہ کی خبر سنی۔ علی گڑھ کے ایک مرحوم تحصیلدار کی بیوی بہت مفلسی اور مصیبت کی زندگی گزار رہی ہیں۔ بچاری کبھی کبھار امداد مانگنے آجایا کرتی ہیں۔ بڑی خوبصورت اور شاندار عورت ہے جسے زمانے نے بری طرح تباہ کیا ہے۔ پرسوں اس کی اٹھارہ برس کی لڑکی کنویں میں ڈوب مری۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ماں نے کسی بات پر کہا کہ ڈوب مر اور ڈانٹا ڈپٹا۔ وہ گھر سے باہر نکل گئی اور پھر واپس نہ آئی۔ تلاش کے بعد کوئیں میں لاش پائی گئی۔ خدا جانے اس قصے کے تہہ میں اور کیا کیا اندوہناک حالات پنہاں ہوں گے۔ مفلسی اور مصیبتوں نے اُسے جان دینے پر مجبور کیا کہ سخت گیریوں نے، کسی کی محبت اور بے وفائی نے غریب لڑکی کی جان لی یا کسی شرمناک حرکت کی بدولت یہ سانحہ پیش آیا۔ ماں بدنصیب پر کیا گزر رہی ہوگی۔ پہلے ہی بدنصیب اپنی بیوگی اور غربت اور بچوں کی پرورش اور تعلیم کی فکروں میں تباہ ہوتی جاتی تھی۔ ایسے حادثات کے بعد مہینوں دل و دماغ میں وہی ایک خیال گونجتا رہتا ہے۔ خدا اس غریب لڑکی کے گناہ کو معاف کرے اور ماں کو صبر دے۔

حشمت[2] اور اس کی بیوی میں ان بن ہے۔ کئی دن ہوئے وہ میرے پاس آئی تھی کہ آپ اسے سمجھائیے۔ آج میں نے اس سے وعدہ لیا ہے کہ پرسوں وہ اپنی بیوی کو میکے سے بلوا کر یہاں لائے گا اور خود بھی آئے گا اور دونوں روبرو بات کریں گے۔ بیچاری لڑکی دس مہینے سے میکے بیٹھی ہے۔ ساس اور نند اس پر سختی اور ظلم کرتی ہیں اور میاں کو بھرتی رہتی ہیں۔ یہ ذرا کچے کانوں کے

---

[1] صالحہ عابد حسین کے کزن کے بیٹے [2] ڈرائیور

حضرت ہیں۔نسبتاً نیک مگر مزاج کے تیز ہیں۔اور وہ لڑکی بھی کسی سے دبنے والی معلوم نہیں ہوتی۔ ویسے میاں کی یاد میں بہت رو رہی تھی۔خدا کرے دونوں میں مصالحت ہو جائے۔

۲۲رجنوری

افسر مہدی کے ہاں زنانہ میلاد تھا۔تین بجے کا بلاوا تھا۔پانچ بجے شروع ہوا اور سات کے بعد ختم۔میں تو چھ بجے چلی آئی۔صغرا کا روزہ تھا اور یونین میں جو میلادِ علی کا جلسہ تھا اس میں جانا تھا۔زنانہ میلاد میں شور وغل، ہنگامہ، بچوں کی چیخ پکار، عورتوں کی باتیں اور بیچ بیچ میں صلوات کے نعرے گویا اپنی غیر دلچسپی کو چھپانے کے لیے۔پڑھنے والوں میں کچھ لڑکیاں خاص تھیں۔صاحب خانہ بچاری بے حد شوقین ہیں پڑھنے کی مگر آواز خراب ہے اور نثر کی غلطیاں بہت کرتی ہیں اور سب سے زیادہ یہ کہ بقول صغرا Over acting بہت زیادہ جوش ونمائش کا اظہار ہوتا ہے۔

مردانہ میلاد شاید پہلی بار یونین میں علی مرتضٰی کی پیدائش کا میلاد ہوا۔عورتیں تو دس بارہ سے زیادہ نہ تھیں مگر مردوں اور لڑکوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔یوسف صاحب صدر تھے۔افتتاحی مختصر تقریر انھوں نے اچھی کی۔اس کے بعد فنا بنارسی نے جو گیا میں رہتے ہیں، حمدیہ اور نعتیہ کلام سنایا۔آواز اچھی ہے۔گاتے خوب ہیں اور کلام میں بھی عقیدت اور جوش وخلوص کے ساتھ ساتھ شعریت بھی موجود ہے۔مولوی طاہر صاحب جنھوں نے پرسوں لالہ رُخ میں مجلس پڑھی تھی، ایک تقریر پچاس منٹ کی کی اور خلاف توقع بہت اچھی کی۔سارا مجمع نہایت ذوق وشوق سے سنتا رہا۔اگرچہ تقریب کی ضرورت اور علی کی سیرت کے ساتھ ساتھ وہ سائنس اور ایٹم کو ضرور گھسیٹتے رہے۔لیکن بحیثیت مجموعی اچھا بولے۔ان کے بعد مانی جائسی نے اپنا کلام سنایا۔ستّر سے زیادہ عمر، ننھی سی آواز اور وہ بھی ترنم سے پڑھنا اور کلام بھی مدحیہ قصیدہ جس کا ذوق آج کل کے نوجوانوں میں عنقا۔نتیجہ یہ کہ لڑکوں نے نہ سنا نہ سننے دیا۔بہت افسوس ہوا۔اس لیے کہ اچھے شاعر کا اچھا کلام نہ سن سکے اور اس لیے بھی کہ ایک بزرگ سے لڑکوں نے بداخلاقی کی۔بہر حال ہم بیچ

میں ہی چھوڑ کر اٹھ گئے۔ عابد صاحب پٹنے جانے والے تھے اس لیے مجھے جلسہ بیچ میں چھوڑ کر آنا پڑا۔ امن صاحب اور یوسف صاحب نے میرے آنے کے بعد تقریریں کیں اور سنا کہ بہت اچھی کیں۔ عابد نو بجے پٹنے ذاکر صاحب کے پاس سدھارے ہیں۔

۲۳ر جنوری

دلّی سے شکیل[۱] آیا ہے۔ اس نے بتایا کہ شبو پرسوں شام اسپتال چلی گئی اور کل دوپہر تک بچہ نہیں ہوا تھا۔ آج دن بھی انتظار کے باوجود دہلی سے کوئی خط یا تار اُس کی خیریت کا نہیں ملا۔ طبیعت سخت پریشان ہے۔

جعفر زکی کے ہاں آج میلاد تھا۔ مجمع تقریباً سارا کل والا تھا مگر وہ ہنگامہ اور ہڑبونگ نہ تھی۔ مجھ سے بھی پڑھنے کی فرمائش کی گئی۔ میں نے کوئی بیس پچیس منٹ زبانی حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کے اہم واقعات اور سیرت پاک کے بارے میں کچھ باتیں بتائیں اور کہا کہ اس قسم کی مجالس اور محفلوں کا مقصد اور اس سے ہمیں کیا سبق لینا چاہیے اور کس طرح منانا چاہیے۔ ساتھ ہی شیعوں کے ہاں حضرت علی کے ذکر میں بار بار نصیری کے خدا کا بیان آتا ہے۔ اس پر میں نے اظہار خیال کیا کہ کسی مسلمان کو یہ جائز نہیں کہ علی کی عظمت منوانے کے لیے کسی کا خدا کہہ کے پکارے۔ یوں تو حضرت عیسیٰ کو خدا کا درجہ دیتے ہیں مگر قرآن ان کے اس فعل کو غیر مستحسن قرار دیتا ہے۔ میں نے کہا علی کی بڑائی اس میں نہیں کہ وہ کسی سر پھرے کے خدا تھے بلکہ اس میں ہے کہ وہ ایک انسان کامل تھے۔ بہرحال جیسا کچھ سمجھ میں آیا گیا کہہ گئی۔ خواتین نے بہت خاموشی اور دلچسپی سے سنا اور بہت پسند کیا۔ بعض کو دل میں برا ضرور لگا ہوگا لیکن میرے سامنے کسی نے اظہار نہیں کیا۔

بیگم اور باجی کے ہاں شام کو گئی، کچھ دیر بیٹھ کر چلی آئی۔

---

۱ شکیل اختر فاروقی

۲۴ رجنوری

غالب پر مضمون آج پورا کیا۔ لیکن ابھی بہت بے ربط اور طویل ہے۔ اس کو مختصر اور درست کرنے کے بعد ریڈیو کے لیے ٹھیک کرنا ہے۔

صبح خورشید صاحب آئے اور کوئی گھنٹہ بھر بیٹھے رہے۔ موضوع گفتگو زیادہ تر اپنی تعریف و توصیف کرتے رہے یا بیماریوں کا تذکرہ۔ ان کی بیماری نوّے فی صدی سے زیادہ وہم کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

سارا دن پریشانی میں گزرا۔ شبو کی خیریت اب تک معلوم نہیں ہو سکی۔ کل یہ اطلاع ملی تھی کہ پرسوں وہ اسپتال میں داخل ہو گئی ہے لیکن بچہ ہونے کی خبر اب تک معلوم نہیں ہوئی۔ خدا اسے تندرست رکھے۔ شام دو گھنٹے تک باہر کھڑے ہو کر تار یا خط کا انتظار کرتی رہی مگر کوئی بھی تار یا خط نہیں ملا۔ اس وقت محمد نور کو زیدی صاحب کے ہاں بھیجا ہے کہ شاید وہ دلّی سے آئے ہوں اس کی خیریت معلوم ہو۔

۲۵ رجنوری

صبح دس بجے قدسیہ کے ہاں جا کر شبو کی خیریت معلوم کی۔ پتہ چلا کہ کل رات تک بچہ نہیں ہوا تھا۔ اس وقت ارجنٹ کال بک کی۔ فون پر چھدّو[1] ملی۔ اس نے بتایا کہ صبح آٹھ بجے شبو کے بچی پیدا ہوئی ہے اور بھابی جان اور امن وہیں گئی ہیں۔ اس کی خیریت اور مفصل کیفیت ممکن ہے پرسوں تک معلوم ہو۔ خیر شکر ہے۔ سخت پریشانی تو کم ہوئی۔

آج بال سبھا کی طرف سے بچوں کا میلا شروع ہوا ہے۔ بہت اچھی طرح منظم کیا گیا ہے۔ قیصر نقوی کو اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے کاموں میں کمال حاصل ہے۔ بچوں میں تو انھوں نے

---

[1] سیدہ سیدین حمید

جان ہی پھونک دی ہے یہاں کے۔

اس وقت آل انڈیا ریڈیو سے چودہ زبانوں کا مشاعرہ ہو رہا ہے۔ شاعر اپنی زبان میں اپنا کلام سناتا ہے اور پھر اس کا ہندی ترجمہ سنایا جاتا ہے۔ اردو شاعری کی نمائندگی جمیل مظہری نے کی اور ایک نہایت حسین، دلکش اور شاندار نظم انسان پر سنائی۔ پڑھنے کا انداز بھی بہت خوب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گوشہ نشیں خلوت پسند شاعر کا نام بھی مدتوں سے سنا تھا اس دور کا بہترین شاعر کہا جاسکتا ہے یا کم سے کم دو تین بہتر شاعروں میں سے ایک ضرور ہے۔

۲۶ر جنوری

آج یوم جمہوریت ہے۔ آزاد ہندوستان کا سب سے بڑا قومی تہوار۔ آج کے دن ہمارے دل فخر و مسرت سے لبریز اور سر ناز و غرور سے اونچے ہو جاتے ہیں، لیکن افسوس کہ اب بھی ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس اہم دن کو نہ صرف کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ مذاق اڑاتے ہیں۔ کہتے ہیں کون آزاد ہوا؟ آزادی سے کیا حاصل ہوا؟ کچھ کی محبت پاکستان کے لیے اور کچھ کی روس کے لیے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ جو لوگ یوم مئی اور جمہوریت روس کا دن زور شور سے مناتے ہیں وہ اپنے دیس کے یوم جمہوریت و آزادی سے بیزاری یا کم سے کم بے گانگی کا اظہار کرتے ہیں۔ پھر اگر یہ کہو کہ تمہاری وفاداریاں دوسرے ملک کی طرف ہیں تو آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ دراصل ابھی تک ہم میں احساس قومیت اور وطنیت پوری طرح بیدار ہی نہیں ہوا۔

آج جون آف آرک ڈراما (برنارڈ شا کا) ختم کیا۔ کتنا پر اثر کتنا دلکش ڈراما ہے اور کتنے تیز طنز و تضحیک کے نشتر پوشیدہ ہیں اس میں۔ شا کا دیباچہ جو پچاس صفحوں میں پھیلا ہوا ہے، پہلی بار پڑھا۔ اگرچہ سمجھ میں مشکل سے آیا مگر برابر پڑھتی رہی تو سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی۔ ان دیباچوں سے ہمیں شا کا نقطہ نظر نہ صرف اس کتاب بلکہ ساری دنیا اور دنیا کے حالات کے متعلق سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

جون آف آرک کا ترجمہ ستائیس اٹھائیس برس ہوئے عابد نے ہندوستانی اکیڈمی کے لیے کیا تھا۔ انھوں نے اُسے شائع نہیں کیا بلکہ مسودہ کھو دیا۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ شا کا ڈراما اور عابد کا ترجمہ کیسی عمدہ چیز ہوتی۔

۲۷/جنوری

آج باجی کے سب گھر والوں اور بیگم کی دعوت کی۔ تقریباً سارا دن اس کے اہتمام اور تیاری میں صرف ہوگیا۔ مگر رات کو محنت وصول ہوگئی۔ سب لڑکیوں اور باجی نے بے حد پسند کر کے اور خوش ہو ہو کر کھایا اور دس بجے تک زو یا صبا اپنے کلاسیکی ڈانس کا مظاہرہ کرتی رہیں جو وہ سیکھ رہی ہیں۔ صبا ابھی مشکل سے سات برس کی ہے مگر اس میں قدرتی صلاحیت اس فن کی معلوم ہوتی ہے۔

شبو کو خط لکھا۔ عابد صاحب کا خط خیریت کا کل آیا تھا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ذاکر[1] صاحب کو تمھارے نہ آنے کا اس قدر افسوس ہے کہ میرے آنے کی خوشی بھی اُسے دور نہ کرسکی۔

بھابی جان نے لکھا ہے کہ شبو کی بچی تندرست اور خوب موٹی ہے۔ آج شا کا ڈراما Condida پڑھنا شروع کیا ہے۔

رات بہت برا خواب دیکھا۔ اگرچہ خواب ہی میں یہ بھی دیکھ لیا کہ یہ خواب جھوٹا ہے اور جس کے بارے میں دیکھا تھا اندر محض سو رہا تھا! مگر خواب ہی میں اس قدر روئی اتنی روئی کہ ہلکان ہوگئی اور پھر اُس عالم میں اس قدر شکر و مسرت کا عالم ہوا یہ معلوم کر کے کہ یہ خواب ہے۔ اور پھر جب سے جاگی ہوں جی پریشان ہے۔ جانتی ہوں کہ خواب کی کوئی حقیقت نہیں مگر خدا سمجھے اس دل سے جس کو یقین سے وہم کا مرض ہے۔ جس کو عابد میرا تخیل کہہ کر مذاق اڑاتے ہیں۔

---

[1] ذاکر صاحب بہار کے گورنر تھے

۲۸ر جنوری

صبح سے بادل تھا جو بڑھتا گیا۔ دن بھر خوب بارش ہوئی۔ اولے بھی پڑے۔ تیز سرد ہوا چلتی رہی اور اب بھی طوفانی ہوا چل رہی ہے۔ سردی سخت ہوگئی ہے۔ گیارہ بجے تک کچھ لکھنے کا کام کیا مگر اس کے بعد ہمت نے جواب دے دیا اور تقریباً سارا دن شا کا ڈرامہ Dandida پڑھتے گزارا اور شام تک ختم کرلیا۔ اس میں ہیروئن کا کردار بہت خوب دکھایا ہے۔ شاعر سے مصنف کو ہمدردی معلوم ہوتی ہے اور اسی کو زیادہ مضبوط بھی دکھایا ہے۔ مگر مجھے شوہر کا کردار زیادہ پسند آیا۔ ڈراما بہت دلچسپ ہے۔ لیکن کوئی خاص مقصد اس کے سوا نظر نہیں آتا کہ نئے دور کی (شا کے دور کی یورپ میں اور ہند میں اس دور کی) عورت کا مضبوط کیرکٹر پیش کیا ہے جو خاصا دلکش بھی ہے۔

سارا دن اداس گزرا۔ کوئی ملنے بھی نہیں آیا۔ لڑکیاں بک بک البتہ کرتی رہیں جس سے کسی حد تک دل بہلا۔ عابد کے بغیر یہ ایک ہفتہ مصیبت سے کٹا ہے۔ کل صبح ان کی انشاء اللہ آمد ہے۔ اب تو ایک ایک منٹ گن گن کر کٹ رہا ہے اور اگر یہ مبالغہ ہو تو ایک ایک گھنٹہ تو ضرور ہی گن رہی ہوں۔

۲۹ر جنوری

آج دو پہر تک آسمان کھل گیا اور چمکیلی دھوپ نکل آئی جس سے ذرا بدن میں جان آئی۔ عابد صاحب گیارہ بجے کے قریب بخیریت پٹنے سے واپس آگئے۔ شکر ہے خدا کا۔

باقر مرحوم کے بیسویں کی مجلس ساجدہ کے مکان پر تھی۔ قدسیہ زیدی موجود نہیں تھیں۔ سیر کے لیے آگرہ چلی گئیں۔ ان کا آج عین مجلس کے دن جانا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوا۔ باجی نے انیس کا شاہکار مرثیہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' بہت عمدہ پڑھا۔ ان کا تلفظ، طرزِ ادا

سبھی بہت اچھا ہوتا ہے۔ ان کی یہ کمزوری ہے کہ اس قدر طویل پڑھتی ہیں کہ لوگ سنتے سنتے اور روتے روتے پریشان ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ مرثیہ ذرا چھوٹا پڑھا کریں اور بیانیہ حصہ کو بھی بہت طول نہ دیں تو ان سے بہتر پڑھنے والی عورت بہت کم کوئی نکل سکتی ہے۔

آج گاندھی جی کی شہادت کا دن تھا مگر گھر کے کاموں میں ایسی پھنسی کہ گیارہ بجے تک ہوش ہی نہ رہا۔ نہ ریڈیو پروگرام سنا اور نہ خاموشی کا سائرن۔ ایک اور خبر جس کا مجھے اور مجھ سے زیادہ عابد صاحب کو قلق ہے وہ یہ کہ یوسف حسین خاں کے ہاں آج ریڈی صاحب کا ایٹ ہوم تھا۔ ہم لوگوں کا بھی بلاوا تھا۔ میرا تو پہلے جانے کا خیال نہ تھا جب بلاوا آیا تھا اس لیے کہ ۳۰ر کو انھوں نے ایٹ ہوم رکھا ہی کیوں؟ افسوس اپنی بھول اور حماقت پر ہے کہ پھر خیال نہ رہا اور شام کو ہم لوگ بھی چلے گئے۔ علی گڑھ کے تقریباً سبھی لوگ مدعو تھے۔ ان کو تو شاید خیال بھی نہ آیا ہو کہ آج کا دن اس قسم کی تقریبیں کرنا یا شامل ہونا نہیں چاہیے۔ عابد کو بہت ہی صدمہ اور غصہ ہے کہ ایسی بھول کیوں ہوئی کہنے لگے مصداق یہی تو میں کہتا ہوں کہ زیادہ دن میں یہاں رہوں تو شاید یہاں کے لوگوں کی بے حسی کا اثر مجھ پر بھی پڑ جائے خیر خدا نہ خواستہ ہمارے خیالات اور عقیدوں پر متعصب لوگوں کا اثر کیا پڑ سکتا ہے مگر ہاں یہ بھول ہوئی۔

۳۱ر جنوری

لاکھ کوشش کروں کہ جلدی سے صبح کو گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر لکھنے کا کام شروع کر دوں مگر ساڑھے نو اور دس سے پہلے کبھی فرصت نہیں ملتی اور ذرا دیر بھی اطمینان سے کام کر نہیں پاتی۔ کوئی نہ کوئی آنا شروع ہو جاتا ہے۔ چپراسی آیا۔ خانساماں آیا، ڈاکیہ آیا، بیگم آ گئیں یا باجی کی کوئی لڑکی یا پھر مونس[1] بھی آ گئے اور بجائے اپنا دفتر میں کام کرنے کے اِدھر آ کر گپیں کرنے لگے۔

---

[1] پروفیسر مونس رضا

ظاہر ہے کہ اس طرح کیسے کوئی کام انسان کر سکتا ہے۔ اب آج سے یہ شروع کیا ہے کہ صبح کو چھ بجے سے سات ساڑھے سات تک کام کروں گی۔ تھوڑا بہت تو ہو ہی جائے گا۔ رات کو بھی کرنے کے لیے سوچا تھا مگر کل سے عابد صاحب نے اپنی سوانح حیات کے لیے کچھ نوٹ لکھوانے شروع کیے ہیں، نو بجے رات سے۔ بہت دن سے ان کا یہ خیال تھا مگر کام شیئر کرنے سے ہچکچاتے تھے اب میں نے تجویز کی کہ وہ پہلے نوٹ لکھوائیں۔ پھر کتاب لکھنی آسان ہوگی۔

آج صبح اور دوپہر میں حضرت علی پر مضمون پورا کیا۔ یہ مضمون کئی سال ہوئے لکھا گیا تھا۔ اب اسے دوبارہ لکھا ہے۔

شام کو اردوئے معلیٰ میں ریڈی صاحب کے اعزاز میں مشاعرہ تھا۔ راہی اور جذبی نے دو بہت اچھی چیزیں سنائیں۔ سات بجے وی۔ ایم ہال میں دو ڈرامے ان کے اعزاز میں کیے گئے۔ مالک مکان ایک انگریزی ڈراما کا اڈپٹیشن ہے۔ نئی زندگی ...... راہی کا لکھا ہوا ڈرامہ ہے اور اچھا خاصا ہے۔ اگر چہ اٹھان جتنی عمدہ تھی آخر تک اتنی اچھی طرح نبا ہا نہیں جا سکا۔

یکم فروری

صالحہ[1] بہن کے ہاں جا کر دوپہر کو کونڈے کھائے اور تب سے طبیعت بھاری ہوگئی۔ افسر مہدی کی ماں کے ہاں سے بلاوا آیا مگر نہیں جا سکی۔ شا کو جا کر نرجس کو نمائش دکھائی اور دہلی کی سب لڑکیوں کے لیے چوڑیاں خرید کر لائی۔ جناب سیدہ والے مضمون پر نظر ثانی اور اس کی نقل شروع کر دی ہے۔

۲ر فروری

'بانو'[2] میں ایک نہایت نامعقول مضمون 'اے عورت تیرا نام......' کے عنوان کسی گمنام مرد

---

[1] صالحہ زیدی [2] 'بانو' عورتوں کا میگزین

نے لکھا ہے جسے پڑھ کر سخت افسوس ہوا کہ اب تک بعض مَردوں کی یہ ذہنیت باقی ہے۔ آج صبح کے سارے وقت میں اس کے جواب میں ایک چھوٹا سا مضمون لکھا ہے مگر ابھی اسے صاف کرنا اور نظر ثانی کرنا باقی ہے۔

شام کو کابلی والا فلم صغرا اور بیگم کو دکھا کر لائی ہے تو بنگلہ زبان میں اور کہیں کہیں ٹوٹی پھوٹی اردو بھی ہے۔ پھر بھی ٹیگور کی اس مشہور اور پر اثر کہانی کا اتنا بڑا فلم اس خوبی سے بنایا گیا ہے کہ کہیں جھول نہیں معلوم ہوتا۔ کاش پوری طرح اس کے مکالمے وغیرہ سمجھ میں آتے تو پورا لطف آتا۔ صغرا نے تو رو رو کر برا حال کر لیا۔

پرسوں دلّی جانے کا ارادہ ہے، مگر کل کا سارا دن ہنگامہ رہے گا۔ دوپہر کو چندے کا میلاد میرے گھر پر کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد افسر مہدی کے ہاں بتلار ہے۔ ان کی ماں یونہی خفا ہیں کہ میں کونڈوں میں ان کے ہاں نہیں گئی۔ حالانکہ عابد صاحب گئے تھے مگر وہی ''چھوٹے بڑے آدمی'' ہونے کا طعنہ جو عورتوں کو بہت دل پسند ہے۔ رات کو باجی کے ہاں دعوت ہے۔ کیسے پرسوں اتنے سویرے جایا جا سکے گا؟ جب کہ طبیعت یوں بھی ٹھیک نہیں۔

۳ر فروری

سارا دن سخت مصروفیت کا کٹا۔ دوپہر کو چندے کا میلا میرے گھر پر کیا گیا اس کی تیاری پھر مہمانوں کا استقبال اور اس کے بعد پڑھنا، وہ ختم ہوا تو افسر مہدی کی اماں کی ہاں میلاد اور ان کی ناراضگی کا فون۔ چنانچہ ان کی ہاں بھی گئی اور پڑھا۔ آٹھ بجے باجی کے ہاں آئی۔ رات کا کھانا ہم سب نے وہیں کھایا جو اور مزے کا تھا۔ دس بجے کے قریب گھر واپس آئے۔ ظاہر ہے کہ کل صبح کا جانا ٹل گیا ہے۔ ہو سکا تو کل دوپہر جاؤں گی۔

جنابِ امیر والا مضمون اپنے گھر کے میلاد میں اور سیدۃ النساء کا افسر مہدی کے ہاں پڑھا اور خواتین نے دونوں مضمون ہی بے حد پسند کیے۔

۴؍فروری

دہلی۔ افوہ! آج خدا ہی نے جان بچالی۔ صبح سے یہاں آنے کی تیاری اور گھر کا انتظام کرتے کرتے بارہ بج گئے۔ ایک بجے کی گاڑی سے روانگی تھی جو پونے دو گھنٹے لیٹ یعنی تین کے بھی بعد چلی۔ طرہ یہ کہ بیگم اور انجم کو بھی قیصر نے ساتھ کر دیا بجائے ساڑھے پانچ کے سات پر دہلی پہنچے۔ شاہدرہ پر ریل میں ایک آدمی مرگیا اس کی وجہ سے اور دیر ہوئی۔ پل پر چڑھنے لگے تو مسافروں کا، دو براتوں کا اور ہزاروں دودھ والوں کا دس دس کنستر فی دودھ والا وہ ہجوم وہ ہجوم کہ خدا کی پناہ۔ بچی بچاری کا برا حال اور بیگم کا اس سے بھی زیادہ تباہ۔ اندیشہ یہ کہ بچی پس جائے گی اور بیگم بے ہوش! دونوں ہاتھوں کے حلقے میں ان کو لیے کس مصیبت سے یہ سو دو سو قدم کا فاصلہ طے ہوا کہ بتایا نہیں جا سکتا۔ ان دونوں کو بچانے میں اتنی چوٹیں کھائیں میں نے کہ سارا بدن دُکھ رہا ہے۔ بارے خدا نے خیر کی اور صحیح سلامت اس ہجوم سے نکل ہی آئے۔ اب بیگم کو بیری والے باغ بھیجنے کا مسئلہ تھا۔ بہت دور پر جا کر تانگہ مل سکا۔ اس میں بٹھا کر اور تانگے والے کو منہ مانگی مزدوری کا وعدہ کر کے روانہ کیا اور خود نرجس کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر یہاں آئی۔ بھائی جان خدا کے فضل سے اب اچھے ہیں۔ نزلہ کھانسی بہت کم ہے مگر تھکے ہوئے اور کمزور لگ رہے ہیں۔

۵؍فروری

صبح بہت سویرے آنکھ کھل گئی تھی۔ مگر کچھ سردی، کچھ کاہلی، کچھ چائے کا نہ ہونا اس لیے پڑی رہی۔ سوا سات پر بھابی جان بچاری نے لا کر چائے دی اس کے بعد اٹھی۔

سیادت اور نسیم[۱] کو فون کیا۔ ریڈیو اسٹیشن فون کیا۔ پھر بھابی جان کے ساتھ پہلے نظام الدین جہاں انھوں نے ایرانی سفارت خانہ کے ایک شخص سے بالکل نیا ریفریجریٹر خریدا۔ پہلے وہ

---

۱ نسیم مخموری

دو ہزار میں دے رہا تھا۔ پھر خدا جانے کیا ہوا کہ اصل قیمت صرف پندرہ سو پر دے دیا تھا۔ جرمنی سے جب عابد صاحب آئے تھے تو بھابی جان کے لیے ایک فریج لائے تھے۔ ساڑھے بارہ سو میں اپنے لیے اس لیے نہ لا سکے کہ صرف ایک لانے کی اجازت تھی۔ وعدہ بھابی جان سے میں نے لے لیا تھا کہ جب وہ اسے الگ کریں گے تو پہلا حق میرا ہوگا۔ چنانچہ اب وہ مجھے دینے پر تیار ہیں۔ پانچ سال وہ اسے استعمال کر چکی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ چھ سو میں انھیں دینا چاہیے۔ اتنے روپے تو کہیں سے انتظام کر کے میں دے ہی دوں گی۔ عابد صاحب کی بڑی خواہش ہے کہ گھر میں فریج ہو اور ٹھنڈا پانی اور پھل وغیرہ مل سکیں۔

ریڈیو اسٹیشن پر آج پھر پریشانی ہوئی۔ میری تقریر کو خیر سے کھو دیا گیا تھا۔ وہ تو میں احتیاطاً اس کا مسودہ ساتھ لیتی آئی تھی۔ جب گھنٹہ بھر تلاش کے بعد نہ ملا تو آخر اسی کٹے چھٹے کو پڑھا اور ریکارڈ کرایا۔ بدانتظامی اور بے پروائی اس محکمہ پر ختم ہے یا اور سرکاری محکموں سے میرا کوئی واسطہ نہیں پڑتا۔ شاید سب جگہ یہی حال ہو۔

۹ رفروری

علی گڑھ میں نمائش کا زور شور ہے۔ تقریباً سارا علی گڑھ اس کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے۔ آج اور کل میں گئی تھی۔ عابد صاحب کے لیے ایک دہری شال اور ایک جوتا خریدا۔ اپنے لیے بھی دو ساڑیاں اور شال خریدیں۔ صغرا، حسن احمد، قیصر وغیرہ کو پیسے دیے کہ اپنے لیے کچھ لے لیں۔ چیزیں تو ہزاروں ہیں اور عمدہ عمدہ۔ یہاں کی خواتین تو معلوم ہوتا ہے جیسے سال بھر اسی کے لیے پیسہ جمع کرتی رہی ہیں۔ درجنوں ساڑیاں اور شالیں اور جانے کیا کیا خریدے ڈال رہی ہیں۔ لڑکوں کو زیادہ تر سیر تماشے کرنے اور کباب پراٹھے کھانے اور لڑکیوں کے پیچھے پھرنے کا شوق لے جاتا ہے اور لڑکیوں کو چوڑیاں خریدنے، جلوہ دکھانے کا شوق۔ غرض عجب حال ہے۔ خدا خدا کر کے آج نمائش ختم ہوئی ہے مگر غیر سرکاری طور پر ابھی دو دن اور رہے گی۔

۱۱ر فروری

ناظر کاکوروی صاحب کا ایک اور خط ملا۔ محبت واحترام، عزت وتعریف سے شروع سے آخر تک لبریز۔ یادگارِ حالی کی حد سے زیادہ تعریف کی ہے اور بقول خود اسے پڑھ کر بے حد روئے ہیں۔ ساتھ ہی بعض اعتراض بھی کیے ہیں ایک یہ کہ حالی کی بیوی کے بارے میں کہ آخر میں دماغ خراب ہوگیا تھا۔ نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ یہ اعتراض تو مجھے بھی مناسب معلوم ہوا۔ اس جملے کو دوسری طرح بھی لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن حالی کی زبان سے اگر کوئی جملہ ایسا ادا ہوا اور کسی نے اُسے نقل کیا تو اس میں کیا برائی ہے۔ کیوں ہم اپنے شاعروں اور ادیبوں کو بھی مقدس مذہبی شخصیت بتا کر پوجنا چاہتے ہیں۔ حالی کی عظمت اور حالی کی بلند اخلاقی مسلم لیکن اگر وہ بھی معمولی آدمیوں کے سے روزمرہ کا استعمال بھی کر لیتے تھے تو کیا اس سے ان کی عظمت میں کوئی فرق آتا ہے؟ میرا تو یہ خیال نہیں۔ بہر حال بچارے مجھ پر بہت ہی مہربان اور مداح ہیں۔ اتنے کہ شک مجھے اپنی بے کمالی میں نہیں ان کی نقد و پرکھ میں ہوگیا ہے۔

شائستہ اکرام اللہ اور وہ ایک ہی قسم کے خط لکھتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ شائستہ دوستوں کی طرح برتاؤ کرتی ہیں اور ناظر صاحب سے صرف کتابوں اور خطوں سے تعارف ہے۔

۱۲ر فروری

بڑی مشکل سے دو دن سے اتنا وقت نکال رہی ہوں کہ ''سلکِ گہر'' کے مضامین کی نظرِ ثانی کر سکوں۔ تین چار صفحے لکھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ دیکھنا ہے کہ کتاب کب تک مرتب ہو سکتی ہے۔

۱۳ر فروری

آج بھائی جان اور بھابی دہلی سے آئے ہیں۔ دو دن ٹھہریں گے۔ بھائی جان کی کل اور

پرسوں میٹنگ ہے۔ بھائی جان[1] بہت مرجھائے ہوئے اور پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ شری مالی[2] نے انھیں بہت پریشان کیا ہے۔ جس شخص نے سالہا سال مولانا آزاد جیسے عالی ظرف اور قدردان افسر کے ساتھ کام کیا ہو اور اس سے پہلے بھی جتنے افسر ملے ہوں وہ ان کے کام کی قدر اور ان کی شخصیت کی عظمت سے واقف اور مداح ہوں۔ آج انھیں ایک ایسے کم ظرف اور کم علم اور شکّی آدمی کے ساتھ کام کرنا پڑ رہا ہے جو ہر شخص کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتا اور ہر معاملے میں اپنی ٹانگ اڑاتا ہے۔ مجھے تو بس یہ فکر ہے کہ اس کا اثر ان کی صحت پر اچھا نہیں پڑ رہا ہے۔ مرد کے لیے سب سے زیادہ پریشان کن اور مضر چیز یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے کام سے مطمئن نہ ہو یا یہ سمجھتا ہو کہ اس کا کام بہترین ہے۔ لیکن دوسرے اس کو سمجھ نہیں پاتے۔ خدا جانے کس دن بھائی جان پریشان ہو کر استعفیٰ دے بیٹھیں۔[3]

۱۴ ؍فروری

آج دوپہر زیدی صاحب کے ہاں ہم سب کی دعوت تھی۔ رات کو باجی کے یہاں سب کا کھانا تھا۔ گیارہ بجے وہیں سے واپسی ہوئی۔

تھائی جان سے ملنے دن بھر لوگ آتے رہے۔

۱۵ ؍فروری

شام سات بجے بھائی جان اور بھابی دہلی سدھارے اور عابد صاحب بھی دہلی گئے۔ وہاں سے کل بڑودہ یونیورسٹی جنرل ایجوکیشن دیکھنے زیدی صاحب کے ساتھ روانہ ہوں گے اور بڑودہ سے بمبئی جائیں گے۔ جنابِ امیر کی تصانیف کی اشاعت کے سلسلے میں سید ابوطاہر (چانسلر مسلم

۱۔ خواجہ غلام السیدین ایجوکیشن منسٹری میں سکریٹری تھے ۲۔ ایجوکیشن منسٹر
۳۔ انھوں نے استعفیٰ دے دیا تھا۔

یونیورسٹی اور امام بوہرہ) نے ایک کمیٹی بنائی ہے۔ عابد اور زیدی صاحب اس کے ممبر ہیں۔ اس کے جلسے میں بمبئی گئے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد گھر اور دل دونوں سونے ہو جاتے ہیں۔ جوں جوں عمر بڑھتی جا رہی ہے جدائی اور بھی زیادہ کھلنے لگی ہے۔ پہلے مہینے بیس دن کو الگ ہو جاتے تھے، اب تو دو دن ہی میں طبیعت پریشان ہو جاتی ہے۔ برے برے وہم آتے ہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے کچھ کرنے کو رہا نہیں۔ حالانکہ وہ کہیں سدھار جاتے ہیں تو لکھنے وغیرہ کا کام زیادہ ہوتا ہے۔

صفیہ[1]، میری عزیز ترین دوست جس نے اپنی بے مثال اور حسین شخصیت کو جاں نثار جیسے نااہل اور نالائق انسان پر نچھاور کر دیا جو بے وقت محبت کی آگ میں سلگ سلگ کرنا قدرا اور بے محبت وخود غرض شوہر کے عشق میں اپنے کو گھلا گھلا کر عین جوانی میں موت کی آغوش میں چلی گئی۔ آہ صفیہ! تمھارا خیال آتا ہے تو دل پر آرے چلتے ہیں۔ آہ عورت کا دل! اس کی وفا آج بھی ہندی عورتوں میں صفیہ جیسی ستی بیویاں موجود ہیں جو جاں نثار[2] جیسے بے درد کے لیے جان دے دیتی ہیں۔ پہلے بھی جانثار نے اس کے خطوط چھپوائے تھے۔ اب دوسرا مجموعہ شادی سے پہلے اور ۱۹۴۶ء تک کے خطوط کا چھپوایا ہے۔ زندگی بھر وہ کماتی اور مصیبت بھرتی اور اس کے قدموں میں اپنا روپیہ ہی نہیں اپنی جان و دل سب کچھ نچھاور کرتی رہی اور جدائی کی آگ میں جھلستی رہی۔ اب اس کی وفات کے بعد اس کے خطوں اور مضمونوں سے روپیہ کما رہا ہے۔ صفیہ کی بے پایاں محبت کے جذبۂ ایثار اور جاں نثاری کی لگن اور وفا کی نادر مثال سے متاثر ہو کر رونے لگتے ہیں۔ اور پھر میں جو کم سنی سے اس کی ساتھی اور دوست رہی جو اس کی ساری خوبیوں اور صلاحیتوں سے آگاہ تھی، میرے دل پر جو تھی نہ گزرے۔ ساتھ ہی جو ان خطوں کو پڑھتا ہے اس کے شوہر کی سنگ دلی، خود غرضی اور خود پرستی پر حیرت کرتا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ بیسویں صدی کی اس ستی بیوی نے سوائے تعریف، پرستش اور عقیدت و محبت کے کوئی حرف اس کی شان میں اپنے قلم سے نہیں

[1] صفیہ اختر [2] جاں نثار اختر

نکالا۔

آہ صفیہ۔ تم کتنی بلند تھیں۔ اور کتنی بدنصیب!

۱۶؍فروری

آج صبح کو تین گھنٹے لکھنے کا موقع ملا۔ ''سلک گہر[۱]'' کا ایک مضمون نظرثانی کے بعد نقل کر کے تیار کر لیا۔ شائستہ، ببّن اور ظہیر کو خط بھی لکھے۔ شام کو معلوم ہوا کہ زاہدہ کی سائیکل کی ٹکّر ہوگئی اور اس کے بہت چوٹ آئی ہے۔ وہاں گئی۔ باجی اور صابرہ بہت پریشان تھیں اور خود زاہدہ بھی۔ چہرے اور ہاتھوں پر خاصی چوٹ لگی ہے مگر خدا نے خیر کی کہ نہ گوشت پھٹا اور نہ ہڈی پر خدا نہ خواستہ ضرب آئی۔ ڈریسنگ وغیرہ کر کے ڈاکٹر نے انجکشن لگا دیا تھا۔ میں نے ذرا سب کو جا کر سمجھایا، ہنسایا ذرا انداق وغیرہ اڑایا۔ باجی کو پہلے برا بھی لگا مگر پھر خود بھی بہل گئیں۔ البتہ زاہدہ بہت خوش ہوئی۔

آج پھر حشمت کی ساس اور بیوی پہنچی تھیں۔ وہی جھگڑا قصہ۔ اور تم ضامن بنو، ثالث بنو اور صلح کرادو۔ مگر صلح اپنی شرطوں پر چاہتی ہیں۔ بہت دیر سمجھایا۔ حشمت میرے کہنے پر کئی بار وہاں گیا بھی۔ اس سے زیادہ دباؤ میں کیسے اس پر ڈال سکتی ہوں۔ اس زمانے میں اپنا بھائی اور بیٹا تک تو بات مانتے اور سنتے نہیں، وہ بچارا تو ایک آدمی ہے اور نوکری کی سی حیثیت رکھنے والا۔ پھر بھی اتنا لحاظ کرتا ہے۔ آج پھر اسے سمجھاتی رہی کہ ایک بار اور نباہ کی کوشش کر کے دیکھو۔ اس کی بیوی ذرا تیز مزاج بھی ہے اور مغرور بھی ساتھ ہی الھڑ اور ناتجربہ کار ہے اور یہ حضرت خود بڑے نازک مزاج ہیں۔ طرہ یہ کہ دونوں کی مائیں بدماغ ہیں۔

۱۷؍فروری

---

[۱] مذہبی مضامین کا مجموعہ

رات نزلہ کی تکلیف رہی۔ صبح سے تیسرے پہر تک بستر ہی میں لیٹی اور بیٹھی لکھتی اور پڑھتی رہی۔ شام کو ویمنس کالج کے مشاعرے میں گئی۔ اسٹاف ممبرز نے یہ مشاعرہ کیا تھا۔ مدعو شعرا میں وامق، سرور، منیب الرحمٰن، راہی، شہاب جعفری اور اختر انصاری آئے تھے۔ بیگم کاظمی خدا جانے مدعو شاعرہ تھیں یا ناخواندہ۔ زاہدہ اور طاہرہ کاظمی بھی شاعر ہیں اور ایک لڑکی عذرا ادھمی نے بھی اپنے شعر سنائے۔ زیادہ تر شعرا نے وہی پرانی چیزیں دس دس بیس بیس بار کی سنی سنائی ہوئی پڑھیں۔ ان میں بعض اچھی بھی تھیں مگر سنتے سنتے جی بھر گیا ہے۔ البتہ وامق کی کافی پرانی نظم 'تحریک' عرصہ بعد سنی تو نئی سی لگی اور اچھی بھی۔ سرور صاحب نے البتہ دو غزلیں نئی سنائیں۔ ان کے بارے میں علی گڑھ کے منچلے کہتے ہیں کہ وہ دن میں دو غزلیں کہہ لیتے ہیں۔ یہ گو شاعر تو ضرور ہیں اور ان کے شعروں میں علم و عقل، خرد اور جنوں، صنعت و مرصع کاری، استادی وغیرہ وغیرہ سبھی کچھ ہوتی ہے۔ الفاظ اور خیالات کا چناؤ بھی خوب ہوتا ہے۔ بس۔ ذرا شعریت ہی کم نظر آتی ہے۔ باقی سب خیریت ہے۔ البتہ طاہرہ کاظمی نے ایک چھوٹی سی غزل سنائی جو بہت پیاری تھی۔ الفاظ کا انتخاب، لہجے کی شیرینی اور سریلا پن، خیالات کی تازگی اور انداز کی دلکشی سبھی پائی جاتی تھی۔ ابھی نوجوان ہے اور نومشق لیکن پھر بھی اتنی اچھی چیز کہہ سکتی ہے۔ زیادہ مشق کرے تو بہت اچھی شاعر نکلے گی۔

۱۹ر فروری

'حسین کے گھرانے کی باہمت بی بیاں' پرانا مضمون تھا۔ اُسے نئے سرے سے لکھا۔ آج پورا ہوگیا۔ اتفاق سے دو تین دن سے ذرا لکھنے کا وقت اطمینان سے مل رہا ہے۔ خدا کرے کچھ دن اور ذرا فرصت مل جائے تو کم سے کم سلکِ گہر تو مکمل ہو جائے گی۔ آج امن اور بھابھی جان اور زبیر صدیقی کو خط لکھے۔

۱۹؍فروری

صبح تھوڑا سا کام ہی کر پائی تھی کہ جمیلہ مجیب آگئیں۔ ''بھئی مصداق میرا جی اکیلے بیٹھے گھبرا رہا تھا۔ سوچا تمھارے پاس چلوں۔'' چونکہ قدسیہ[1] یہاں موجود نہیں اس لیے بچاری کا جی گھبرایا ہوگا۔ ماشاء اللہ پورے دو گھنٹے بیٹھیں۔ دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ بارہ بجے واپس گئیں اور میرے کام کا سارا وقت نذر لے گئیں۔ بارہ سے ایک تک نرجس اور پروین کو پڑھاتی ہوں!

بال برادری کی والدین سبھا قسم کی جو ہے مجھے اس کا صدر بنایا گیا ہے۔ شام کو اس کے جلسے میں گئی۔ سکریٹری صاحب مع کاغذات کے غائب تھے۔ نائب سکریٹری صاحبہ سو رہی تھیں بمشکل اٹھا کر بلائی گئیں۔ بچوں کے کلب کے لیے زمین یونیورسٹی سے لینا چاہتے ہیں وہ جا کر دیکھی۔ جلسے میں طے ہوا کہ باقاعدہ ایک درخواست مجلس منتظمہ کے دستخطوں سے وائس چانسلر صاحب کو جلد سے جلد بھیجی جائے اور بچوں کے کلب کے لیے کوئی کمرہ محلہ میں ڈھونڈنا ڈاکٹر حفیظ کے سپرد کیا گیا۔

کچھ دیر کے لیے خورشید[2] کے ہاں گئی۔ ان کی بیوی مجھے بہت پسند ہیں۔ پسند تو وہ بھی ہیں مگر کاش وہ اپنی ذہانت قابلیت اور یکتائی کا ذکر اور اظہار ذرا کم کیا کریں تو بہت اچھے آدمی ہیں۔

عابد صاحب کا خط آج بھی نہیں آیا۔

۲۰؍فروری

صبح تین گھنٹے تک جناب زینب پر مضمون لکھتی رہی مگر آج بھی مکمل نہ ہو سکا۔ دوپہر کو مبین[3] نے اپنے موجودہ یونین کے بارے میں کچھ باتیں بے ایمانی اور غلط حساب بنانے وغیرہ کے بارے میں بتائیں۔ بچارہ رو رہا تھا کہ عجیب مصیبت میں جان ہے۔ کہنا نہ مانوں تو مشکل اور مانو تو کیسے؟ میں نے مشورہ دیا کہ ڈرو نہیں عابد صاحب کے سامنے صورتِ حال رکھ کر مشورہ کرو۔

---

[1] قدسیہ زیدی [2] خورشید الاسلام [3] عابد صاحب کے دفتر کا کلرک

بعض وقت یہاں کی حالت دیکھ کر اس قدر افسوس اور مایوسی ہوتی ہے اور بعض وقت غصہ آتا ہے۔ بہت غریب اور مصیبت چھوٹی چھوٹی بے ایمانیاں کرے تو سمجھ نہیں آتا ہے۔ اچھا خاصا چھے سات سو روپے کمانے والا بھی یہ حرکتیں کرے تو کیا جواز پیش کر سکتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بے ایمانی کا جواز تو کوئی بھی پیش نہیں کر سکتا۔ یہاں اخلاقی حالت واقعی قابلِ افسوس ہے۔

آج صغرا اور نرجس کے ساتھ بندش فلم دیکھنے گئی۔ فلم پرانی ہے اور پہلے دیکھ چکی ہوں مگر اچھی فلم ہے۔ اور بری نئی فلم سے پرانی اچھی فلم دیکھنا کہیں بہتر ہے۔ طبیعت بہت اداس اور بور تھی اس لیے چلی گئی۔

شام سید حامد علی (لڈوہ) کی بیوی سے ملنے گئی۔ وہ ہماری بہت پرانی ملنے والی ہیں یعنی ۲۶۔۲۷ء کی۔ اب برسہا برس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ان کے شوہر نے بیوی بہنوں کو اس زمانے میں بے پردہ کیا تھا جب علی گڑھ بھر میں شریف اور شیخ عبداللہ کے ہاں کے سوا کوئی بے پردگی کا خیال بھی نہ کر سکتا تھا۔ لطف یہ کہ اب سخت پردے کے حامی ہیں۔ دوبارہ بیوی کو پردے میں بٹھا دیا ہے۔ بیٹیاں وغیرہ بھی سخت پردہ کرتی ہیں اور بے پردگی کو بہت برا سمجھنے لگے ہیں۔ زمانہ الٹی چال اکثر چل پڑتا ہے۔

۲۲رفروری

جناب زینب پر مضمون آج پورا کر لیا۔ کافی طویل ہو گیا ہے۔ کچھ چھوٹا کرنا پڑے گا۔

عابد صاحب بمبئی سے بخیریت واپس آ گئے۔ امن بھی ان کے ساتھ آئی ہیں اور شاہین[۱] کو بھی لائی ہیں۔ نرجس بے حد برہم تھیں۔ پہلے کہ اچھی اماں نے خواہ مخواہ مجھے ستانے کے لیے لکھ دیا باجی نہیں آئیں گی۔ اب آ گئی تو شرم تو خیر کیا آتی یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ خواہ مخواہ میں کتنی بدگمانی اور بدتمیزی بزرگوں کی شان میں کرتی ہوں۔

---

۱ بھانجا

۲۴رفروری

پندرہ شعبان کو ''انجمن خواتین علی گڑھ'' کی طرف سے امام صاحب العصر کی پیدائش کا مولود تھا۔ مجھ سے مضمون پڑھنے کی فرمائش تھی مگر ان پر میرا کوئی مضمون نہیں اور نہ ان کی سوانح حیات کے زیادہ واقعات ہی یاد ہیں جو زبانی تقریر کرسکتی۔ مجبوراً ایک روایات کی کتاب میں سے کچھ پڑھا جس کی عبارت اور بیان دونوں مخصوص خطابت کے رنگ میں تھا۔ نہ خود مجھے پسند آیا اور نہ غالبًا سننے والیوں کو۔ اگر چہ نعرہ ہائے درد حسبِ عادت بلند ہوتے رہے۔ والدہ افسر مہدی نے اپنے خاص انداز میں عاشقانہ نعتیں گا گا کر اور ہاتھ چلا چلا کر، گلا پھاڑ کر دل بھر کر پڑھیں اور بچاری سیدھی سادی خواتین سے داد و تحسین اور لڑکیوں سے ہنسی اور فقرے حاصل کرتی رہیں۔ باجی کا قصیدہ البتہ اچھا تھا۔ امن بھی میرے ساتھ میلاد میں گئی تھیں۔ میرا آج روزہ تھا۔ سارا دن تو اچھا کٹا مگر شام ہوتے طبیعت بہت ست ہوگئی۔ پھر بھی روزہ کھولنے کے بعد مولانا آزاد کی یاد میں جو جلسہ یونین میں ہونے والا تھا اس میں گئی۔ جس یونیورسٹی کی زندگی ۴۷ء کے بعد تمام تر مولانا آزاد کی ذات گرامی کا صدقہ ہے اس میں کیے گئے جلسہ میں سو آدمی بھی نہ تھے۔ کچھ بلانے والوں کی غیر ذمہ داری اور اعلان اچھی طرح نہ کر سکنے کی وجہ اور کچھ لوگوں کی بے حسی اور بے عملی۔ علی گڑھ کی حالت دیکھ دیکھ کر بعض وقت بہت ہی دکھ ہوتا ہے۔ میرا بہت جی چاہ رہا تھا کہ مولانا پر تقریر کروں مگر یہاں آج تک کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ تقریر کراتا۔ سرور صاحب اچھا خاصا بولے اور بس باقی اللہ کا نام تھا۔

۲۵رفروری

آج امن نے انور[۱] کی صحت کی مجلس کی۔ تین بجے کا بلاوا تھا۔ ساڑھے تین پر بمشکل شروع

---

[۱] انور عباس صالحہ عابد حسین کے بھتیجے

کراسکی اور پانچ کے لگ بھگ ختم ہوئی۔ میرا حضرت زینب پر مضمون خواتین نے بہت پسند کیا اور بے حد متاثر ہوئیں۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ روز بروز خواتین کا رجحان واقعاتی اور بیانیہ مضامین کی پسند کی طرف بڑھ رہا ہے۔ بہ نسبت بین و بکا والے مرثیوں کے۔ روتی تو اُسی پر زیادہ ہیں لیکن متاثر اس پر زیادہ ہوتی ہیں۔

چھے بجے تک خواتین واپس گئیں۔ میں بہت زیادہ تھک گئی پھر بھی باجی کے ہاں امن کی دعوت تھی وہاں جانا ہی پڑا۔ نواب رام پور اور ان کے داماد نور الحسن کے ہاں آج رات کے کھانے کا بلاوا تھا۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ عابد صاحب مجبوراً گئے۔ وہاں جا کر مجھے سخت کوفت ہوتی ہے۔ عابد صاحب بتا رہے تھے کہ علی گڑھ کے ایک خاصے سنجیدہ اور معقول پروفیسر صاحب نے ان سے کہا نواب صاحب! آپ سے مل کر روحانی مسرت ہوتی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خدا ایسی خوشامد پسندی سے بچائے...... مگر کیا معلوم جیسی روح ویسے فرشتے۔ انھیں ہوتی ہی ہو روحانی مسرت!!

☆☆☆

1960

یکم جنوری (جمعہ ۲ / رجب)

راج بھون

آج پٹنہ آئے دس دن ہو گئے ۔ نیا سال شروع ہو گیا۔ پچھلا سال ساتھ چھوڑ گیا اپنی بہت سی تلخ یادوں کے ساتھ ۔ اس سال میں میری عزیز ترین پیاری بہن مجی نے داغِ مفارقت دیا اور خاندان میں ایسی جگہ خالی کر گئی جو کبھی نہیں بھر سکتی ۔ عابد کی سخت بیماری اور آپریشن کی وجہ سے بہت سخت پریشانیاں اٹھانی پڑیں ۔ لیکن خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ انھوں نے صحت پائی ۔ اس سال مجھے دو انعام ملے ۔ میری ناول ''قطرے سے گہر ہونے تک'' میری تیسری ناول اور بچوں کی کتاب ''سنہرے بالوں والے بچوں کا دیس'' پر وزارتِ تعلیم سے پانچ سو کا انعام ملا اور ناول پر یوپی اکیڈمی نے پانچ سو کا انعام دیا۔

تحریری کام بھی ہوتا رہا۔ کئی مضامین لکھے، ریڈیو کی تقریریں لکھیں ۔ دو سال ہوئے ایک نیا ناول شروع کیا تھا۔ اب اسے پھر لکھنا شروع کیا ہے اور پٹنہ کے قیام میں بہت کچھ کام ہو گیا۔ اس لحاظ سے میرا یہاں آنا کارآمد ہو گیا۔ میری تین کتابیں اس سال شائع ہوئیں ۔ ایک مذہبی مضامین کی ''سلکِ گہر''، ایک افسانوی مجموعہ ''خونگے'' اور ایک تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''ادبی جھلکیاں''۔ اگر چہ آخر الذکر کتابوں میں کتابت کی غلطیاں ہیں اور طباعت کی بھی خامیاں ہیں۔

اس سال ذہن میں جو ادبی پروگرام ہے وہ یہ کہ اس ناول کو مکمل کروں گی ۔ سفرنامے پر نظر

ثانی کرنا ہے اور ایک بچوں کی کتاب لکھنا ہے۔ تنقیدی اور سنجیدہ کتابوں کے ساتھ اردو اور انگریزی کے ناولوں کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کروں گی جس کی ابتداء کردی ہے۔ کے شا کے تین ڈرامے، کلیم الدین احمد کی کتاب اردو تنقید پر ایک نظر، ہنس راج رہبر کی پریم چند۔ آج مولانا آزاد کا 'مضامین کا مجموعہ' پڑھنا شروع کیا۔ آج یہاں راشٹر پتی[1] آنے والے ہیں۔ ذاکر صاحب تین دن سے انھیں لینے گئے ہوئے تھے۔ راج بھون میں ایک ہفتے سے تیاریاں تھیں کہ جیسے کسی بھاری برات کی۔ ان کے ساتھ 34 آدمی آئے ہیں۔ پوری اسپیشل ٹرین بھری ہوئی۔ اس وقت اوپر کے ڈرائنگ روم میں ذاکر صاحب سے ملنے آئے ہوئے ہیں اور باتیں کر رہے ہیں۔ ایک نظر میں نے بھی ڈالی۔

۲رجنوری

چھ بجے راشٹر پتی واپس گئے، چوبیس پچیس گھنٹے اندر باہر ہنگامہ رہا۔ لنچ پر سب مرد ہی مرد تھے۔ میں نے لنچ پر باہر جانے سے انکار کردیا۔ ممدوح کے بارے میں کچھ غلط باتیں مشہور ہیں۔ جب سے ان کی بدنامی ہورہی ہے، جانے کیا بات ہے جب ایسی کوئی بات سنتی ہوں تو دل کو بڑا دھکا لگتا ہے۔ خدا کرے یہ محض لوگوں کی بدگمانی ہو۔ مگر جب انسان اتنی بڑی پوزیشن، قوم کا سردار ہو تو اس وقت اس کو زبانِ خلق کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ پاکستان کے مرحوم صدر کے لیے کچھ باتیں مشہور تھیں تو ہم فخر سے سوچا کرتے تھے ہمارے کم سے کم چند بڑے لیڈر اور حاکم اعلیٰ اخلاق کے حامل ہیں۔ مگر ہائے انسانی کمزوریاں اور خود پسندی!!

۳رجنوری

صبح سے سفر کی تیاری تھی دو تین گھنٹے ذاکر صاحب سے بات چیت رہی۔ ایک بجے پٹنہ سے روانہ ہوئے۔ یہ دس دن اطمینان اور آرام سے گزرے۔ مجھے اور عابد صاحب دونوں کو ڈاکٹر

[1] ڈاکٹر راجندر پرشاد

عبدالحیٔ نے دیکھا۔ مجھے اور عابد صاحب دونوں کو کچھ جگر کی خرابی تشخیص ہوئی۔ کچھ دوائیں بھی ایک ہیں۔ سنا تھا کہ بڑھاپے میں میاں بیوی کے امراض بھی ایک سے ہو جاتے ہیں۔

۴؍جنوری

گاڑی نو بجے علی گڑھ پہنچی۔ حشمت، صغرا اور مبین اسٹیشن پر موجود تھے۔ سارا دن رکھا اٹھائی میں گزرا۔ سردی یہاں خوب ہے۔ سنا ہے دو دن پہلے اس سے زیادہ تھی۔ اپنا گھر بڑی نعمت ہے۔ کسی دوسری جگہ کتنا ہی عیش و آرام ہو گھر آ کر جو مسرّت ہوتی ہے وہ بہت بڑی دولت ہے۔ گھر میں تین چار مہمان ہیں، نوکر ٹھیک کام نہیں کر رہے ہیں مگر گھر پھر بھی گھر ہے۔

۵؍جنوری

آج صبح سے لوگ ملنے آتے رہے۔ مونس آئے، زیدی صاحب آئے، عترت حامدہ اور حبیبہ دہلی سے آئی ہوئی ہیں۔ ان کے ساتھ اخلاق[۱] کی بیوی اور بہنیں بھی آئیں۔ یوسف صاحب اور ان کی بیوی بھی آئیں۔

آج بلونت سنگھ کا ناول ''ایک معمولی لڑکی'' ریل میں شروع کیا تھا۔ زبان تو اچھی لکھنی نہیں آتی پلاٹ میں بھی خامیاں ہیں۔ مگر کردار نگاری اچھی ہے۔ پاکستان میں ظفر برادرس نے میرا ناول 'عذرا' بغیر میری اجازت کے شائع کر دی۔ آئینہ ادب نے ان پر اور مجھ پر مقدمہ کیا ہے کہ میں نے اجازت انھیں دی تھی مگر چھاپ انھوں نے لی۔

۶؍جنوری

گھر کا کام اور حساب کتاب۔ بینک کے حساب میں ایک سو روپے کی غلطی نکلی۔ غالباً بینک

---

[۱] اخلاق الرحمٰن قدوائی

والے بھول گئے یا کسی نے جعلی دستخط سے روپے نکلوا لیے۔ یہاں یہ بھی ہوتا ہے، دیکھو معلوم کروں گی۔ عابد صاحب کی پاس بک غائب ہے۔ بہت احتیاط سے رکھتی ہوں مگر انکم ٹیکس کے لیے مانگی جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ عابد صاحب کے بینک میں صرف اتنا روپیہ ہے کہ انشورنس کی قسط ادا ہو جائے۔ باقی اللہ بس باقی ہوس۔

۷ر جنوری

شام کو باجی اور صابرہ ملنے آئیں۔ صابرہ تو کچھ دیر بیٹھیں پھر چلی گئیں۔ میں نے باجی سے اجازت لی اور ٹہلنے نکل گئی۔ راستے میں مولانا علی نقی ملے۔ میں جلدی سے راستہ کاٹ کر دوسری طرف مڑ گئی۔ مجھے تو ظاہر ہے کوئی اعتراض نہیں مگر مولانا پر نہ جانے کیا گزر جاتی۔ لہٰذا ان کا پاس کرنا پڑا۔ نماز پڑھنے جا رہی تھی۔ ساڑھے چھ بجے وامق آ گئے۔ بہن اور صغرا کے اصرار پر انھوں نے اپنی کئی پرانی غزلیں اور نظمیں اور چند شعر سنائے۔ ان کے پرانے شعروں میں جات، تڑپ اور آمد ہوتی ہے اور نئے اشعار میں کاوش محنت اور آورد محسوس ہوتی ہے۔ علی گڑھ آ کر نہ جانے لوگوں کے تخلیق کے سوتے خشک ہونے لگتے ہیں۔ مجھے تو ان کی نظم 'رقصِ بسمل' ہی شاہکار لگتی ہے۔ آج پھر ان کے منہ سے سن کر بہت لطف آیا۔ وامق بہت مخلص دوست ہیں۔

صبح کا وقت آج بھی کاغذات کی دیکھ بھال میں گزرا۔ چاہ رہی ہوں اس سال سب چیزیں باقاعدگی سے رکھوں تاکہ گڑبڑ نہ ہو۔

۱۲ر جنوری

گھر کے کاموں سے تھک کر رات کو مطالعہ میں اتنی کھو جاتی ہوں کہ روزنامچہ لکھنے کا خیال ہی نہیں رہتا ہے۔ مہمان اب سب رخصت ہو چکے ہیں۔ اب شاید کچھ دن کام کرنے کا موقعہ ملے اگرچہ ذہن کی وہ روانی جو پٹنہ میں تھی اب کند سی پڑتی معلوم ہوتی ہے۔

ہفتہ کی شام کو بھائی جان آئے تھے، اتوار کو بارہ بیٹی کالج کا کانوکیشن تھا ایڈریس دینے۔ کانووکیشن کی ساری کارروائی ٹھیٹھ بلکہ بھونڈی ہندی میں تھی۔ مگر آخر میں سیدین صاحب کے پُر اثر دلکش اور سبق آموز خطبہ نے ساری کوفت دور کردی۔ ہم لوگوں کے علاوہ سارے استاد، طالب علم اور شہر کے دوسرے لوگ جو وہاں آئے ہوئے تھے بہت متاثر تھے۔ بلکہ کئی لوگوں کے آنکھوں میں آنسو تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔

کل شام علی گڈھ کے طلباء کی طرف سے یوم علی کا جلسہ تھا۔ سیدین اس میں بھی مدعو تھے۔ انھوں نے اتنے شارٹ نوٹس پر آنے سے انکار کردیا۔ ہم لوگ گئے۔ مولانا کلب عباس کے بیٹے مولانا کلب عابد نے بہت اچھی تقریر کی۔ مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ سوائے مولانا علی نقی کے یہ سب لوگ رٹی ہوئی تقریر کرتے ہیں۔ اس کے بعد مولانا سعید احمد اکبر آبادی (ڈین سنّی دینیات علی گڑھ) نے جناب امیر کی شان میں تقریر کی۔ فن خطابت سے زیادہ واقف نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اس میں عقیدت بھی تھی اور خلوص بھی۔

جلسے کے درمیان ایک منتظم حضرت میرے پاس آئے کہ آپ بھی تقریر کیجیے۔ عرض کیا تقریر کرنا میرا میدان نہیں۔ انھوں نے فرمایا یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ تو خوب بولتی ہیں۔ عذر کیا کہ عالموں کے مجمع میں بغیر تیاری کے بولنا مناسب نہیں ہے۔ وہ بھی جناب مرتضٰی جیسی جامع شخصیت پر، آپ مجھ سے پہلے کہتے تو ضرور بولتی۔ شاعروں نے اپنا کلام سنایا۔ تھوڑی دیر بعد ہم لوگ آگئے تھے۔ بھیگتے ہوئے رکشا میں واپس زیدی صاحب کی گاڑی میں آئے۔

کل شہوار (رانی دلہن) کی لڑکی کی شادی ہے۔ اس سوچ میں ہوں کہ کیا تحفہ دیا جائے۔

۱۳ر جنوری

آج شہوار کی شادی میں شرکت کی۔ حسب دستور بہت مہمان تھے۔ تین سو صرف عورتیں ہی تھیں۔ انتظام اچھا تھا، کھانا بھی اچھا تھا۔ چھ بجے شام کو پہنچے، ساڑھے آٹھ بجے آئے۔ جہیز

بہت بھاری تھا۔ ممتاز[1] آپا کہنے لگیں "سمجھ میں نہیں آتا علی گڑھ میں لوگ اتنی بھاری شادیاں کیسے کرتے ہیں؟ کیا ڈاکہ ڈالتے ہیں؟" میں نے کہا کہ "ان لوگوں کو تو چھوڑیے ان کے یہاں تو صدیوں سے غریبوں کے پیٹ پر ڈاکہ ڈالا جاتا رہا ہے۔ مگر آپ کے یہاں کے ریڈر لیکچرر اور پروفیسر بھاری بھاری شادیاں کیسے کرتے ہیں۔" کہنے لگیں "بھئی میں تو اپنے لڑکے اور لڑکی کی شادی میں بس چند عزیزوں دوستوں کو اطلاعی خط بھیج دوں گی اور بس۔" میں نے کہا "کاش آپ ایسا کریں!"

میں نے شہوار کو اپنی کتابیں تحفے میں دیں۔

۱۴ر جنوری

عابد صاحب نے قاضی عبدالودود کی دعوت کی۔ ان کے مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور حکیم عبداللطیف کو بھی مدعو کیا۔ صبح سے جو کاموں کا چکّر چلا تو اب ساڑھے نو بجے فرصت ملی۔ پہلے سارے برتن نکالے، دھوئے، پونچھے، سلاد بنائی، قورمہ پکایا۔ آلو پالک، میٹھے ٹکڑے، دال، کباب اور مچھلی خانساماں نے پکائی۔ احمد نور منشی اور گوہر کام میں لگے رہے۔ صغرا بھی پانچ بجے کالج سے آکر کام میں لگ گئی۔ بیگم شمع اور قیصر بھی آگئے۔ ان کو بھی کھانے پر روک لیا۔ سب نے کھانا خوش ہو کر کھایا۔ ساری محنت وصول ہوگئی۔ لوگوں کے گھر تو سارے کام نوکر کرتے ہیں، ہمارے تو ہماری مدد کرتے ہیں۔

☆☆☆

---

[1] ممتاز جہاں پرنسپل گرلز کالج علی گڑھ

1963

یکم جنوری

کل رات پونے گیارہ بجے ہوائی جہاز سے بمبئی پہنچی۔ چھوٹے بھائی جان، امن بیناوانور اور فاروقی ایروڈروم پر لینے کے لیے موجود تھے۔ رات کو آدھی رات تک ہنگامہ رہا۔ سب جاگتے رہے۔ مجھے حسب عادت شور وشر کی وجہ سے نیند نہیں آئی اس لیے کہ نئے سال کی خوشی میں ساری رات لوگ جوہو پر سیر کے لیے آتے رہے۔

بھائی امن، بچے بہت خوش تھے میرے آنے سے۔

آج گھر میں بڑا ہنگامہ تھا۔ بینا اور ایک اور لڑکی گیتا نے آس پاس کی بیس بچوں کو تیار کر کے ایک پیارا سادو گھنٹے کا کلچرل پروگرام نیشنل ڈفنس فنڈ کے لیے کیا۔ خود ہی ٹکٹ بیچے، خود ہی پروگرام تیار کیا اور خود ہی پیش کیا۔ بینا چودہ کی اور سب سے چھوٹا بچہ تین سال کا تھا۔ ڈھائی سو روپے سے زیادہ جمع ہوئے۔ دوسو سے زیادہ دیکھنے کے لیے آئے۔ مشہور ایکٹر بلراج ساہنی بھی موجود تھے اور انھوں نے بہت تعریف کی اور بھی لوگوں نے بہت پسند کیا۔ بینا اور سب بچے بہت ہی خوش اور جوش میں تھے۔ پروگرام کے دو گانے ''حملہ آور خبر دار، ہم ہندوستانی ہیں تیار'' اور ''آواز دو ہم ایک ہیں'' سب سے زیادہ پسند کیے گئے۔

مجھے ہوائی جہاز کے کھانے سے نقصان ہوا۔ دن بھر طبیعت خراب رہی۔ بہت کمزوری ہوئی۔

۲رجنوری

چھادی، سلطانہ زیدی، امن کی ایک دوست زرینہ وارثی وغیرہ کے ہاں جا کر ملی۔ سلطانہ گھر پر موجود نہ تھی۔ طیب سے ملاقات ہوئی۔ طبیعت ابھی صاف نہیں۔

کیفی کی بیوی موتی سے گھر پر ہی ملاقات ہوئی۔ دلی ہی میں پاکستان سے آئی ہیں اور بے حد گن گا رہی تھیں پاکستان کے۔ میں نے ذرا تھوڑی سی خبر لی مگر وہ بچاری اس قدر تنگ نظر اور تنگ ذہنیت رکھتی ہیں کہ اس سے بحث کرنا بیکار ہی تھا۔

بھائی جان کو آج خط لکھا۔ عابد کو ایک کل لکھا تھا ایک آج لکھا۔

۳رجنوری

آج چھوٹے[۱] نے ہم سب کو 'پریم پتر' دکھائی۔ یہاں سے بمبئی تک کا بس اور ریلوں کا سفر تکلیف دہ تھا۔ خاص کر اس لیے کہ اونچے اونچے پل چڑھنا پڑا اور ریلوں میں بے حد رش تھا۔ مگر پکچر بہت اچھی تھی۔ کہانی تو خاصی کمزور تھی مگر سادھنا کی ایکٹنگ کمال کی تھی اور ششی کپور نے بھی عمدہ کام کیا تھا۔

عابد صاحب اور گوہر[۲] کا خط ملا۔ بھابی جان کی طرف سے اطمینان نہیں ہوا۔ طبیعت کا وہی حال ہے۔ بھائی جان کی شدید پریشانی اور بھابی کی بیماری نے دماغ اتنا پریشان کر رکھا ہے کہ کہا نہیں جا سکتا۔ راتیں جاگتے گزر جاتی ہیں۔

۴رجنوری

سردار جعفری اور با چھو نے مل کر ایک پکچر ''گیارہ ہزار لڑکیاں'' بنائی ہے جس میں بمبئی کی

---

۱ چھوٹے بھائی جان ۲ حکیم حسن مہدی کی بڑی لڑکی

ورکنگ گرلز کے پرابلم کو لیا ہے۔ ابھی وہ ریلیز نہیں ہوئی مگر میرے دکھانے کے لیے سردار اور باچھو نے خاص انتظام کیا۔ اگر چہ رات کو سانس کی تکلیف رہی مگر صبح ۹ بجے ہی جانا پڑا۔ دس بجے پہنچے ٹیکسی سے۔ گیارہ میل پکچر حسب توقع بہت اچھی ہے۔ اگر چہ فلمی پچ دینے کی خاطر گانے بہت لمبے لمبے ہیں اور ناچ بھی کئی ہیں لیکن قابل برداشت۔ مالا سنہا اور بھارت بھوشن نے بہت عمدہ ایکٹنگ کی ہے۔ کہانی احمد عباس کا خاص رنگ لیے ہوئے ہے۔ ایک بجے تک گھر واپس آئے۔

۶ رجنوری

آج صبح مسز کریم بھائی، نذر سجاد حیدر سے ملنے اور قبرستان جانے کا پروگرام تھا۔ مسز کریم بھائی کے ہاں کھانا بھی کھایا۔ وہ بھی بھابی جان کی طرف سے بہت پریشان ہیں اور کہتی ہیں کہ زہرا کو ہی جانا چاہیے ضرور اور جلد۔ ایسی محبت والی، ایسی پر خلوص، ایسی شریف عورت دنیا میں بہت کم ہوسکتی ہے۔ باقی خاندان تو بس عجیب سا ہے۔ شوہر بچارے کا دماغ کاروبار فیل ہونے اور جوان بیٹے کے مرنے نے کچھ خراب سا کر دیا ہے مگر کس کیرکٹر اور ضبط کی عورت ہیں یہ زرینہ بہن کہ ان کے ایمان میں فرق آیا نہ کارکردگی میں۔

نذر سجاد حیدر کو دیکھ کر عبرت ہوتی ہے۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتی ہیں۔ چالیس برس سے پلنگ پر پڑی ہیں۔ مگر نہ غریب اِدھر ہوتی ہیں نہ اُدھر۔ باتوں کی عادت اور بڑھ گئی ہے۔ سنگار کا شوق اب تک موجود ہے۔ عینی[1] کی فکر اور بچاری کو مارے دیتی ہے۔

عینی اس قدر دبلی اور بیمار نظر آئی کہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ امن سے جو باتیں معلوم ہوئیں اس کو سن کر مجھے سخت رنج و افسوس ہوا۔ مجی کے ختم ہونے کے بعد باچھو صاحب نے عینی سے بہت پینگ بڑھائے۔ مداح پہلے ہی سے تھے اب دوستی بہت بڑھ گئی۔ اس کے ساتھ سیلون گئے۔ لندن گئے، اس کو ہندوستان کی نیشنلٹی دلوائی۔ وہ بمبئی آ گئی۔ بعد میں اس کی ماں بھی آ گئیں۔ ہم

---

[1] قرۃ العین حیدر

سب کا یہ خیال تھا کہ دونوں کی شادی ہو جائے گی۔ پھر سنا کہ عینی نے انکار کر دیا۔ ہم لوگوں کو بہت افسوس بھی ہوا مگر سمجھے کہ ٹھیک ہوگا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ تو باچھو کی بے اعتنائی و بے وفائی کے غم میں گھل رہی ہے۔ ۲۵ پونڈ وزن کم ہو گیا۔ پاکستان چھٹا، وطن چھوٹا، عزیز چھوٹے، یہاں پردیس میں بے سہارا رہ گئی۔ باچھو اب بات بھی نہیں کرتے۔ نہ آتے جاتے ہیں نہ بلاتے ہیں۔ اس کے ناول کا فلم بنانے والے تھے وہ بھی ختم ہوا۔ ان کی اس منہ بولی بہن شام[۱] نے خدا جانے کس کس طرح باچھو کو بدگمان کیا ہے، کیا کیا اس غریب لڑکی کی طرف سے کہا ہے کہ ان کو اس سے چڑ ہو گئی اور اس عورت کی محبت بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ میرا بھائی میرا بھائی وہ رٹتی رہی ہے مگر خود اس کے دل میں کیا ہے یہ خدا ہی جانے۔ امن، اظہر، عینی سب کو اس کی صورت سے نفرت ہے۔ مجھے تو اس کا افسوس ہوا کہ عینی جیسی ذہین قابل باشعور لڑکی (۳۵ سال کی عمر) کی اس طرح ہتک کی جائے اور اس کی محبت کو ٹھکرا دیا جائے۔ ممکن ہے ان باتوں میں کچھ مبالغہ بھی ہو مگر کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہے ورنہ اس کا رنج میں یہ حال نہ ہو جاتا۔ افسوس مرد کتنا خود غرض ہوتا ہے۔ بھائی میرا سہی مگر خود پرستی اور برخود غلط ہونا کتنی بڑی لعنت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بقول امن کے مجی[۲] بھی اُسے بھگت گئی مگر اپنی انمول جان قربان کر دی اس کی بے اصولیوں پر۔

قبرستان مجی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئی۔ امن اور شکیلہ ساتھ تھیں۔ چند منٹ کے لیے تو شدتِ غم نے بدحواس کر دیا۔ روتے روتے برا حال ہو گیا۔ کیسی بے مثل صفات، کیسی حسین و دلکش شخصیت خاک میں مل گئی۔ سارے ارمان دل کے دل ہی میں لے گئی غریب۔ شمع کی طرح فانوس گھل گھل کر یوں جان دی کہ دوسروں کو روشنی پہنچائی اور خود فنا ہو گئی:

شمع کی طرح وہ جی بزم گہہ عالم میں
خود جلی دیدۂ اغیار کو کر کے بینا[۳]

---

۱ مسز اندر آنند ۲ مسز احمد عباس

۳ اقبال کے شعر میں تحریف کی ہے۔ شعر ہے: شام کی طرح رہیں بزم گہہ عالم میں خود جلیں خود دیدۂ اغیار کو بنا کر دیں

(نوٹ: قرۃ العین حیدر اور احمد عباس دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے تھے مگر کچھ غلط فہمیوں کی وجہ سے شادی نہیں ہوسکی۔ مگر عباس صاحب کی شرافت، نیکی، اصول پرستی کا اعتراف قرۃ العین حیدر اپنے قریبی دوستوں سے کیا۔ سیلون میں شادی کرنا چاہتے تھے مگر عینی کی ماں نے اس طرح شادی کرنے کی مخالفت کی اور ہندوستان میں شادی کرنے پر زور دیا۔ بمبئی آکر شادی ہونے والی تھی مگر نہیں ہوسکی۔ قرۃ العین حیدر اپنی طبیعت کے عین مطابق ان سب واقعات کو عام نہیں کرنا چاہتی تھیں اور عباس صاحب نے بھی ان کی اس عادت یا خواہش کا احترام کیا۔ قرۃ العین حیدر نے خود راقم الحروف کو یہ بتایا کہ عباس صاحب نے اپنی آپ بیتی جو انھوں نے انگریزی میں لکھی ہے "I am not an Island" میں انھوں نے وہ باب ان کو دیکھنے کو بھیجا تھا جو ان کے اور اپنے بارے میں تھا، مگر عینی نے اسے رکھ لیا اور سختی سے اسے شائع کرنے کو منع کردیا۔ مرتب)

۸رفروری

دوپہر کو چھادی کے ہاں دعوت تھی۔ شام کو خود چھادی، بچے منیش[۱] کے یہاں آگئے اور کھانا کھا کر رات کے ساڑھے گیارہ بجے گئے۔ منیش اور بھائی دونوں کو تاش کا شوق ہے کھیلتے رہے۔

مکتبہ کے شاہد صاحب نے فون کیا کہ دلی سے خط آیا ہے کہ آپ کو سو روپے دے دوں۔ میں نے عابد صاحب کو لکھا تھا۔ یہاں ذکی رضا سے کچھ ملنے کی امید نہیں۔ ان کے بھائی نقی رضا جو اطہر صاحب کے داماد ہیں کہا تھا کہ کسی طرح کچھ روپے دلوا دیجیے۔ رات ان بچارے کا فون آیا۔ بہت شرمندگی کا اظہار کیا کہ مجھے بڑی ذلت محسوس ہوتی ہے۔ مگر ذکی ہمارے قابو کے نہیں پھر بھی کوشش کر رہا ہوں۔ ان کی والدہ صاحبہ سے کہلوایا تھا مگر وہ جاہل ماں نکلیں۔ اپنے بڑے بیٹے سے جھگڑ پڑیں کہ وہ کیا کرے جب اس کے پاس روپے نہیں۔ تبھی تو بیٹا ایسا نکلا ہے۔ اور

[۱] منیش سکسینہ

نسبت ہوئی غریب بی اے پاس لڑکی کی اس جاہل اور بے ایمان آدمی سے۔

آج عصمت کا نیا ناول 'معصومہ' پڑھا۔ پاکستان سے ٹائپ میں چھپی ہے۔ نہایت عمدہ گٹ اپ۔ فلمی دنیا کی خرابیاں اور کمینگیاں دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ افسوس کہ ان کی ذہنیت تو ہمیشہ سے خراب تھی اب فن بھی گر گیا۔ ٹیڑھی لکیر کی (ان ہی بہت سی خامیوں کے باوجود) زبان، انداز بیان، ظرافت کی چاشنی اور کردار نگاری میں کمال کی ہے۔ لیکن اس میں زبان بمبئی کی فلمی دنیا اور داداؤں کی بدترین زبان ہے جس میں ہر صفحے میں دو چار فحش گالیاں عریانی سے بڑھ کر انتہائی فحش باتیں بن گئی ہے۔ کردار نگاری صفر۔ ظرافت کے معنی گالی گلوچ۔ جذبات نگاری کا فقدان۔ بہت ہی افسوس ہوا۔ یہ ہے کہ کرشن، عصمت وغیرہ سب پرانی شہرت کے بل پر زندہ ہیں لیکن ان کا فن بالکل مر چکا ہے۔

۹ر جنوری

آج صبح انور سدھار گیا۔ شام کو سلطانہ، طیب اور شاہد صاحب ملنے کے لیے آئے۔ ان لوگوں کی وجہ سے بازار جانے کا پروگرام ملتوی کرنا پڑا۔ رات کو بیچ پر گئے۔ بارہویں شب تھی مگر ہلکا ہلکا بادل ہونے کی وجہ سے چاندنی وہ نہیں تھی جو ہوا کرتی ہے۔ سمندر بڑھ رہا تھا مگر بالکل کنارے تک تو دس گیارہ بجے تک کہیں آئے گا۔ بچوں کو بھیل پوری کھلائی۔ طیب کافی دیر بیٹھے رہے اور بھائی صاحب[۱] مرحوم کا تذکرہ رہا۔ ان کی بے مثل شخصیت، ان کا صبر وضبط، ان کے ایک ان کی قوت، ان کا احساسِ ظرافت وذوق ادب شاذ ونادر کسی ایک شخصیت میں اتنی صفائی اتنی مکمل صورت میں پائی جاتی ہیں۔ اور ان کی موت نے خاندان کا شیرازہ جس طرح بکھیرا اور خاندانی قدریں جس طرح تباہ ہوئیں اس کے خیال ہی سے تکلیف ہوتی ہے۔

---

۱ سید مستحسن زیدی صالحہ عابد حسین کے بہنوئی

۱۰رجنوری

صبح شاپنگ کی۔ گھر کے لیے کچھ برتن، شیر[1] کے بچوں کے لیے چیزیں، عابد کے لیے کھجوریں وغیرہ لیں۔ شام کو بہت دور تک میں وامن اور بھائی جوہو پر ریت پر ٹہلتے رہے۔ غروب آفتاب کا منظر نہایت حسین ورنگین تھا اور بعد میں تقریباً ایک گھنٹے تک آسمان کی شفق کے عکس نے گیلی ریت پر زمین پر بھی شفق کھلا رکھی تھی۔

اب سفر سر پر سوار ہے۔ نیند رات بھی بہت کم آئی۔ آج رات دیکھیں کیسی کٹتی ہے۔ کل تو ریل ہی میں گزرے گی۔ اور سفر میں تو کبھی نیند آتی ہی نہیں۔ ہ حالانکہ عابد صاحب کے اصرار پر سیٹ فرسٹ ہی میں کرائی ہے۔ شکیلہ اس کی بھاوج اور فاروقی بہت دیر تک بیٹھے رہے۔

۱۲رفروری

حسب توقع نیند رات بھر نہ آئی مگر سردی زیادہ تھی۔ نرجس اور ساتھ کی خواتین بے خبر سوتی رہیں۔ ایک لڑکی تو صبح اتر گئی دوسری ہمارے ساتھ نئی دہلی تک آئی۔ کوئی ساؤتھ کی خاتون تھیں اور پہلی بار دہلی جا رہی تھیں۔ اسٹیشن پر عابد صاجب، انور، غفران اور زہرا موجود تھے۔ زہرا کی کتابوں کا بکس جو بہت بھاری تھا، لے کر آئی تھی۔ وہ ان کے سپرد کیا۔ پتا چلا کہ کل فون آیا تھا بھابی جان کا۔ دماغ کا کوئی آپریشن چھوٹا سا کیا گیا ہے۔ دماغ کا آپریشن!! اس خیال ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کتنا ہی چھوٹا ہو مگر کتنا سخت تکلیف دہ ہوگا۔ وہ بھی محض ٹسٹ کے لیے۔ خدا میری بھابی کو اس مصیبت سے جان کی سلامتی میں نکالے اور بھائی جان کو اطمینان دے۔ اسٹیشن پر یہ خبر سنی اور اب دل کی عجیب حالت ہے۔ ہاتھ پیر میں سنسنی ہے۔ کل زہرا، ذکیہ وغیرہ آئیں گی تو مشورہ ہوگا کہ اب کون جائے بلقیس تو چند دن میں آنے والی ہے۔

---

[1] ڈرائیور

۱۳/ جنوری

کل ذکی[1] کی بارات جائے گی۔ صبح کو نبیلہ[2] بہن کے ہاں گئی۔ عورتیں جمع تھیں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی آئی۔ شام کو ابٹن کا بلاوا دے رہی تھیں مگر میں نے معذرت کر دی۔

چار بجے کے قریب زہرا، ذکیہ اور مہدی[3] آئے۔ وہی امریکہ جانے کا مسئلہ در پیش تھا۔ کون جائے؟ میری رائے ہے کہ زہرا جائے۔ مگر ذکیہ جانے پر زیادہ کین معلوم ہوتی ہے۔ زہرا کی ملازمت کا معاملہ ہے۔ اندیشہ ہے کہ اس وقت گئی تو استعفا دینا پڑے گا۔ روپیہ کا مسئلہ بھی تھا کہ کہاں سے آئے؟ میں نے بتایا کہ تین یا ساڑھے تین ہزار روپیہ پانی پت کی جائیداد کی فروخت کا اظہر کے پاس آیا ہے۔ میں ان کو لکھتی ہوں اس وقت وہ تمھیں بھیج دیں۔ ہے تو ہم چاروں بہن کا مگر یہ سب بعد میں دیکھا جائے گا۔ ایک ہزار میں دے سکوں گی۔ کچھ ذکیہ کے پاس ہے۔ اس طرح چھے ہزار کا واپسی کا ٹکٹ آ سکے گا۔ بچیاں دونوں پریشان تھیں۔ باجی[4] بیگم بھی آ گئی ہیں۔ ان کا مرض بہت بڑھ گیا ہے۔ بھابی جان کی بچاری کی خبر نے بچاری کو اور نیم مردہ کر دیا ہے۔ غریب کا دنیا میں سوا اس کے اور ہے بھی کون؟ آج عابد صاحب وگ[5] سے بات کر کے ان کو اسپتال میں داخل کرانے کا انتظام کریں گے۔ میں بھی دیکھنے جانا چاہتی ہوں مگر کل سے نزلہ کھانسی کی پھر شدت ہوگئی ہے۔ آج ڈاکٹر کو حال بتا کر دوا منگوائی ہے۔ سردی بھی تو بلا کی پڑ رہی ہے۔ رات کو صفر ٹمپریچر اور دن میں بھی سخت سردی۔

۱۶/ جنوری

آج ذکی کی دلہن کو جا کر دیکھا۔ اچھی خاصی شکل وصورت کی لڑکی ہے۔ جہیز وغیرہ بھی کافی لائی ہے۔ نبیلہ بہن جیسی لڑکی چاہتی تھیں ویسی ہی ہے۔ سنا ہے کہ پیام بڑی بہن کو دیا مگر صورت

[1] خواجہ نبی احمد کے بیٹے [2] مسز نبی احمد [3] مہدی عباس حسینی [4] مسز سیدین کی والدہ [5] ڈاکٹر

چھوٹی بہن کی پسند آئی۔ لہٰذا اصرار کیا کہ ہم تو اس سے کریں گے۔ اور مسلمانوں میں لڑکوں کا کال اور ماں باپ کی بے بسی کہ اپنی لڑکی کی یہ ہتک گوارا کرلی اور دوسری کو کر دیا۔ شام کو ایٹ ہوم تھا۔ اندر اور باہر ملا کر پانچ سو کے قریب لوگ تھے۔ کل چار سو کا کھانا ہو چکا ہے۔ لنگوٹی میں پھاگ کھیلنا اسی کو کہتے ہیں۔ یہ جنگ کا زمانہ، حکومت کہہ رہی ہے خرچ کم کرو، پیسہ بچاؤ، سونا نہ خریدو۔ غذا کی کفایت کرو۔ مگر شادی کرنے والے ہر بات کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ امیر ہوں یا غریب ہوں یا متوسط حیثیت کے۔

نرجس کل صبح سدھار رہی ہے۔ انور نہیں آیا جس کی وجہ سے رنجیدہ و ناراض تھی مگر ان صاحبزادے کو اپنی دلچسپیوں سے اتنی فرصت کہاں؟

۱۷ جنوری

صبح نرجس سدھار گئی۔ ٹیکسی بہت مشکل سے اور دیر میں آئی۔ بہرحال گاڑی اسے مل گئی اور اسٹیشن پر انو بھی آ گیا تھا۔

صغرا آج اپنی ہیڈ مسٹرس اور لڑکیوں و استانیوں کے ساتھ پنڈت نہرو کے ہاں ڈفنس کے لیے جمع کیے روپے دینے گئی تھیں۔ بہت خوش اور اکسائیٹڈ تھیں۔ ڈیڑھ بجے مع مسز نبی اپنی ایک دوست کے واپس آئیں۔ تین بجے کے بعد تک وہ خاتون رہیں۔ آج گھر کے بہت سے بکھرے کام سمیٹے اور صفائی وغیرہ کرنے میں بہت تھک گئی تھی مگر ان کی وجہ سے لیٹنے کو بھی نہیں ملا۔

عابد صاحب آج انڈو پاکستان فرینڈ شپ کے سلسلے میں جے پرکاش کی بلائی میٹنگ میں گئے تھے۔ چھ بجے واپس آئے مجیب صاحب بھی مدت بعد ملنے آئے۔ دیر تک بیٹھے رہے۔ طے ہوا کہ عابد صاحب کل سے مجیب صاحب کے ہاں جا کر کام کیا کریں گے۔ یہاں آنے جانے والے کام نہیں کرنے دیتے۔ اور مجیب صاحب چاہیں تو یہاں کام کریں مگر وہ تو شہر جاتے ہیں کام کرنے۔

۱۸ر جنوری

آج سے عابد صاحب نے مجیب صاحب کے ہاں جا کر کام کرنا شروع کیا ہے۔ پھر بھی دو تین آدمیوں کو بھیجنا ہی پڑا۔

منیر[1] صاحب کی بہن کی بھی آج شادی تھی۔ میں تو نہ جا سکی۔ عابد صاحب گئے تھے۔ دو پہر قیصر نقوی علی گڑھ سے آئے ہیں۔ بیگم بھی آئی ہیں۔ ریڈیو پر عورتوں کا مشاعرہ ہے۔ اس میں نظم پڑھنی ہے۔ یہاں پرسوں آئے گی۔

۱۹ر جنوری

مشاعرہ بہت اچھا رہا۔ ۳۰ کو جو مردانہ مشاعرہ ہوا تھا کم سے کم اس سے بہت اچھا تھا۔ چار شاعرات اردو کی (اور بقول اناؤنسر صاحبہ کے)، چار کویتریاں (بروزن کبوتریاں) ہندی کی۔ ایک ہندی شاعرہ زہرا نے دو چھوٹی چھوٹی خوبصورت نظمیں سنائیں۔ ممتاز مرزا اور ذکیہ ساغر کی غزلیں جو موجودہ حالات پر تھیں بہت خوبصورت بھی۔ اور سیدہ فرحت کی نظم بہت پر جوش۔ ریڈی نے اس کی دادیوں دی کہ ''آپ کی نظم تو سونے پر سہاگہ تھی'' بچارا با محاورہ زبان بولنے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔

۲۰ر جنوری

صبح باچھو کو فون کرنے گئی تو معلوم ہوا بلقیس آگئی۔ مگر سخت پریشان و رنجیدہ ہے۔ غفران نے جو حال بھابی کا بتایا وہ بالکل دل توڑ دینے والا تھا۔ آج بھائی[2] صاحب کی برسی کی مجلس تھی اس لیے اس وقت نہ جا سکی۔ سارا دن رونے میں گزرا۔ شام کو بچیوں کے پاس گئی۔ بھائی جان تو ہمیں

---

[1] منیر الحسن جامعہ کے استاد   [2] سید علی مہدی عابد صاحب کے بہنوئی

تسلی دیتے رہے مگر بھابھی جان کی حالت ذرا بھی امید افزا نہیں اور خود بھائی جان پر جو سخت اسٹرین ہے جو دل کی حالت ہے وہ بلقیس کہتی ہے کہ بتائی بھی نہیں جاسکتی۔ زہرا، ذکیہ اور بلقیس تینوں کا برا حال ہے۔ روتے روتے تھک جاتی ہیں تو ذکر کرنے لگتی ہیں پھر رونے لگتی ہیں۔ اب تک تو یہ خیال تھا کہ زہرا یا ذکیہ جائے مگر آج عابد صاحب نے طے کرلیا کہ جیسے بھی ہوگا وہ خود ہی جائیں گے۔ واپسی میں زیدی صاحب سے مل کر بات بھی کریں گے ویزا وغیرہ کی، وہ کل ہی کوشش کرائیں گے۔ بچیوں کے پاس تھی تو انتہائی ضبط کی کوشش کی، موٹر میں بھی سنبھالے رہی مگر گھر آکر نماز پڑھتے پڑھتے بالکل بے قابو ہوگئی۔ بے ہوشی کی سی حالت ہوئی۔ بڑی کوشش سے کسی نہ کسی طرح اپنے کو سنبھالا۔ لاکھ سمجھاتی ہوں کہ دل کو کہ رونے سے کچھ ہوتا ہے، نہ بین کرنے سے مگر دل کمبخت سنبھلے بھی تو۔ تیس برس کی محبت ہے اور کیسی محبت؟ ماں سے، بہن سے، بھائی سے، دوست سے اور سب سے ملاکر جیسی محبت ہوتی ہے شاید اس سے بھی زیادہ۔ الٰہی! تیری کیا مصلحت ہے، میری بھابی جان جیسی فرشتہ صفت کو یہ تکلیف بھائی جان جیسے انسان کے لیے یہ سخت آزمائش یہ کرب۔ مولا تیری باتیں تو ہی جانے۔

۲۱ رجنوری

عابد صاحب صبح کے گئے رات کو واپس آئے اور قریب قریب سب کام مکمل کر لیے۔ ۲۶ کے جہاز میں سیٹ مل جائے گی۔ روپیہ کا مسئلہ سب سے سخت ہے۔ ان کو ریڈیو[1] سے چھٹی تو ملے گی مگر بلا تنخواہ کی۔ اس لیے سوال یہاں کے اخراجات کا بھی ہے۔ بنک میں مشکل سے ڈیڑھ ہزار روپیہ ہوگا۔ چار ہزار تو چھوٹے سے منگائے ہیں جو پانی پت کی جائیداد کے آئے ہیں۔ ہیں تو چاروں کے مگر اس وقت ہم لیے لے رہے ہیں۔ دو ہزار زیدی صاحب سے یا کسی سے قرض لیے جائیں گے۔ مگر ادا کیسے ہوں گے؟ یہ خدا ہی جانے۔ بہر حال۔ اس وقت تو بھائی جان کی فکر اور

---

[1] عابد صاحب ساہتیہ صلاح کار کے طور پر کام کرتے تھے

بھابی کی محبت کوئی بات سوچنے نہیں دیتی۔ عابد کہتے ہیں میں کچھ نہ کرسکوں بھائی جان کو تو کسی طرح بہلاؤں گا اور ہوسکا تو بھابھی کو یہاں لے آؤں گا۔ اگر وہاں ڈاکٹر علاج سے بالکل مایوسی ظاہر کردیں۔ مگر بھائی جان ان کی جدائی کیسے گوارا کریں گے۔ خدایا! میرے بھائی جان اور بھابی کو اس آزمائش سے صحت وسلامتی کے ساتھ نکال۔ تو نے فرمایا ہے کہ میری رحمت سے مایوس نہ ہونا۔ اور تیری اس آیت کے بل پر دل و دماغ سلامت اور امید زندہ ہے۔ تو خاک کی چٹکی میں شفا دینے والا ہے۔ ہم گنہگار سوا دعا کے اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔

عابد صاحب کے لیے گرم کپڑوں کی فکر ہے۔ قمیص، نائٹ سوٹ وغیرہ خریدنے ہیں۔ کل ڈاکٹروں سے مل کر بھابی جان کو لانے کے سلسلے میں مشورہ کرنا ہے۔ باجی بیگم کو دیکھنا ہے جو یہاں داخل ہیں۔ ان کا مرض پھر بڑھ گیا ہے۔ کل اچانک آپا شیری بھی آگئیں۔ ان کو باجی بیگم کے پاس پہنچانا ہے۔

۲۲/جنوری

صبح باجی بیگم کو دیکھنے گئی۔ حالت اچھی نہیں۔ کینسر بہت پھیل گیا ہے۔ دیکھنا ہے کب تک بچاری مصیبت کاٹتی ہیں۔ بھابھی جان کی پریشانی نے اور حالت تباہ کردی ہے۔

ڈاکٹر وگ سے بھابی جان کے بارے میں تفصیل سے گفتگو ہوئی اور ان کی باتوں سے تسلی ہونے کی جگہ پریشانی میں اور اضافہ ہوگیا۔ بعض وقت محسوس ہوتا ہے جیسے خدانخواستہ ساری امیدیں قطع ہوچکی ہیں۔ رات سخت پریشانی میں کلامِ پاک پڑھ رہی تھی۔ اس میں فال دیکھنے کا خیال آیا۔ یوں فال، استخارے کسی چیز کی قائل نہیں لیکن کبھی کبھی سخت پریشانی کے عالم میں صرف کلام پاک میں فال دیکھا کرتی ہوں۔ فال دیکھی تو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے دل پر ہاتھ رکھ دیا۔ دعاؤں کے مستجاب ہونے کا مژدہ اور رحمت الٰہی سے کبھی مایوس نہ ہونے کی تلقین اور مومنوں و نیک کرداروں کو ان کے کاموں کا اجر ملنے کا ذکر۔؟؟؟؟ ایسا ہی ہو اور میری بھابھی بھائی جان سلامتی کے ساتھ پھر ہم سب سے ملیں۔ آمین۔

عابد صاحب کو رزرو بنک سے پرمٹ نہ مل سکا۔ کہتے ہیں ''برادر اِن لا'' کا رشتہ کوئی ایسا رشتہ نہیں کہ پریشان ہو کر جایا جا سکے۔ آہ! وہ لوگ کیا کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا کہ ہم دونوں کا ان دونوں سے کیا کیا رشتہ ہے۔ محبت و دوستی کا وہ اٹوٹ رشتہ جس کو صرف ان لوگوں کے دل ہی سمجھ سکتے ہیں جن کے درمیان یہ بندھن ہو اور کوئی نہیں۔

۲۸ر جنوری

تین دن کرب میں گزرے اور پھر۔ پھر زہرِ غم کا پیالہ ابل گیا۔ بھابھی جان خدا کو پیاری ہوگئیں۔ رضا بقضائه و تسليما لامره

زہرا، ذکیہ، بلقیس تینوں انتہائی صبر سے کام لے رہی ہیں مگر ایسی حالت ہے کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ کیسے سنبھالوں ان بے ماں کی بے سہارا بچیوں کو؟

۳۰ر جنوری

دن، وقت، تاریخ ہر چیز کا احساس جیسے مٹ گیا ہے۔ دن تو جیسے تیسے کٹ جاتا۔ پر کیسے یہ خدا ہی جانتا ہے۔ مگر رات آہ! قبر کی رات شاید اتنی بھاری نہ ہوتی ہو جیسے آج تین دن سے کٹ رہی ہے۔ بھائی جان پر وہاں کیا گزر رہی ہوگی۔ سیدہ کا کیا حال ہوگا۔ یہ دونوں زندہ سلامت تندرست کیسے رہیں گے؟ بھائی جان کی ویران و تباہ زندگی کیسے گزرے گی؟ بھابی جان کو کیسے، ہائے کیسے بے جان دیکھوں گی۔ کیسے ان کی آخری خدمت انجام دوں گی۔ خدایا! مگر دوں گی ضرور دوں گی۔ ان کو غیروں کے ہاتھ میں نہ ڈالوں گی۔ چاہے میرا کلیجہ پھٹ جائے، چاہے میرا ہارٹ فیل ہو جائے پر اپنی ماں سے زیادہ چاہنے والی، بہن سے زیادہ پیاری، سب سے پیاری، سب سے گہری، سب سے زیادہ قدردان دوست کی آخری خدمت انھیں منحوس ہاتھوں سے انجام دوں گی جن سے ۳۲ برس پہلے دلہن بن کر لائی اور بھائی جان کا اجڑا گھر اور زخمی دل بسایا

تھا۔ مولا کیوں؟ کیوں تو نے انھیں اتنی جلدی بلایا؟

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی
چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یہ شعر آج کل ہم لوگوں کے کتنا حسب حال ہے۔

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور صبح کو جوں توں شام کیا

۳۱ / جنوری

آنکھ پر بس ہے کہ آنسو نہیں نکلتی، زبان پر بس ہے کہ بین نہیں کرتی۔ کھاتی پیتی بھی ہوں۔ باتیں بھی کرتی ہوں۔ مگر دل اور دماغ پر بس نہیں۔ دماغ ایک غم کے لیے کچھ اور نہیں سوچتا اور دل آہ! جانے کیا ہوتا جارہا ہے اُسے کہ اس نے زبردستی پلنگ پر لٹا دیا۔ بچیوں کے پاس صبح ہی چلی جاتی تھی نہ جاسکی۔ ڈاکٹر نے دوا دی۔ سینہ میں درد، دل میں درد، پہلو میں درد، سر میں درد، مگر کس درد کی دوا ہے ان بے دواؤں کے پاس بھلا؟ دنیا کے سات بہترین ڈاکٹر مل کر اپنی پوری کوششوں کے باوجود بھابی جان کے مرض کی تشخیص تک نہ کرسکے۔ وہ شمع کی طرح پگھل گئیں اور وہ ہاتھ ملتے رہ گئے۔ سب بیکار اور فضول ہے۔ اس کا جب جہاں بلاوا آئے، تیار رہنا چاہیے۔

کل اور آج برابر جامعہ کے لوگ اظہار افسوس کے لیے یہاں آتے رہے۔ وہاں ذکیہ کے ہاں بچیوں کے پاس سیکڑوں آدمی آرہے ہیں جن سے انھیں اور زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ ہم کیا کریں کہ دنیا کا یہ دستور ٹھہرا۔ مگر ہائے یہ مصیبت تو کسی پر نہ پڑی تھی پہلے کہ دن پر دن انتظار میں گزر رہے ہیں اور کچھ کر نہیں سکتے۔ آج اس شعر کے معنی جیسے دل و روح میں اترے جارہے ہیں۔

رگ و پے میں اترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے

ابھی تو بھائی جان کا سامنا کرنا ہے۔ ابھی تو بے ماں کی بچی کو جو اس شدید ترین مصیبت سے دوچار ہوئی ہے، چھاتی سے لگانا ہے۔ ابھی تو بھابھی جان کو نہلا اور کپڑا پہنا کر رخصت کرنا ہے۔ مولا اتنی طاقتِ برداشت بھی دے اور جسم کو طاقت کہ یہ خدمتیں انجام دے لوں ورنہ بھائی جان اور عابد صاحب کے لیے ایک اور مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ عابد صاحب کو بھائی جان اور بھابھی جان سے جو محبت ہے اس کا ثبوت آج پورا پورا مل رہا ہے۔ غم نے کمر ہی توڑ دی ہے مگر کسی طرح وہ سب سہار رہے ہیں۔

یکم فروری

یہ دن بھی کسی طرح بیت گیا۔ دن بھر عورتیں اور مرد تعزیت کے لیے آتے رہے۔ بچیاں بھی ملنے آئیں۔ بھائی جان کا تار بھی آ گیا۔ پرسوں صبح وہ اپنی عزیز ترین ہستی کو لے کر آ رہے ہیں۔ آخری بار۔

۲رفروری

آج کا دن اور بھی قیامت کا کٹا۔ کھانسی کی شدت بڑھ گئی ہے۔ نیند باوجود نیند کی دوا کے ہرگز نہیں آئی۔ باجی آج آ گئی ہیں۔ صبح لوگ ایرپورٹ پر لینے جا رہے ہیں۔ مجھے ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے کہ ہرگز نہ جائیں۔ مگر میں ضرور جاؤں گی۔ عابد صاحب سے میں نے کہہ دیا کہ میں بھی کسی بات میں ضد نہیں کرتی مگر اس وقت مجھے مجبور نہ کریں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بھائی جان بھابھی جان کہیں چھوٹے سے چھوٹے سفر پر سدھارے یا واپس آئے ہوں اور میں ریل یا ہوائی جہاز پر انھیں لینے اور پہنچانے نہ گئی ہوں۔ تو اب، اس وقت میری پیاری بھابھی جان امریکہ سے واپس آ رہی ہیں۔ آخری زیارت کرنے، آخری بار ملنے اور میں انھیں لینے نہ جاؤں۔ جان پر بن جائے مگر ضرور جاؤں گی۔

۳؍فروری

پانچ بجے روانہ ہوئے۔ ایرپورٹ پر بہت اخفا کے باوجود عزیزوں اور دوستوں میں چالیس پچاس کے لگ بھگ آدمی تھے۔ جہاز کچھ لیٹ تھا۔ کوئی ایک دوسرے کی طرف دیکھتا یا بات نہ کرتا تھا کہ برداشت کی قوت ختم نہ ہو جائے۔ میں دوا ساتھ لے گئی تھی۔ سب بچوں کو کھلاتی رہی۔ جہاز پر لڑکیاں غفران اور انور پہنچ گئے۔ چھدو اور بھائی جان کو لے کر لڑکیاں کسٹم میں آگئیں۔ چالیس منٹ سے زیادہ یہاں لگے۔ باہر ہم سب پتھر کے بت بنے کھڑے رہے۔ دوسرے لوگ کسی کو ریسیو کرنے آئے تھے۔ ہار پھول، ہنسی مذاق، قہقہے۔ یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ بیس پچیس لوگ غم کا مجسمہ بنے کھڑے ہیں ان کو کوئی احساس نہ تھا۔ ہمارے ہاں احساس اور کلچر کی ابھی کتنی کمی ہے۔ بھائی جان باہر آئے۔ اللہ رے ان کا صبر وضبط۔ سب سے ملتے، پیار کرتے۔ میں تو ان کی طرف دیکھ بھی نہ سکی۔ آنسوؤں کا سیلاب تھا کہ مچل رہا تھا۔ باہر نکلے تو ٹرک پر غفران اور انو صندوق رکھے ملے۔ کلیجہ تڑپا، دل مسلا، چیخیں نکلنے کو ہوئیں مگر انھیں گھوٹ دیا۔ بھائی جان خود ٹرک پر اپنی پیاری عزیز کے پاس ہی بیٹھے اور چاروں لڑکیاں، غفران، مہدی، انور، ساجدہ، شاہدہ، بیا، انو، چھوٹے بھائی جان اور باچھو۔ عابد صاحب نے مجھے نہیں بیٹھنے دیا۔ میں، صابرہ اور چھادی پیچھے موٹر میں، ہمارے پیچھے ایک اور موٹر۔ دھیرے دھیرے یہ جلوس چلتا ہوا گھنٹا بھر میں جامعہ نگر پہنچا۔ یہاں سب استقبال کے لیے باہر کھڑے رو رہے تھے۔ لمبا چوڑا بھاری صندوق، قناتیں لگے برآمدے میں لا کر رکھ دیا گیا۔ سب گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ چیخیں کم نکل رہی تھیں کہ بھائی جان کو سنائی نہ دیں۔ آنسوؤں کی بارش تھی۔ اندر اور باہر سیکڑوں روتی عورتوں کا مجمع بڑھ رہا تھا۔ سب سامان پہلے ہی سے تیار کر لیا گیا تھا۔ میں نے تو پہلے سے کلیجہ پتھر کر لیا تھا کہ اپنی پیاری بھابھی کی آخری خدمت اپنے ہاتھ سے کرنی ہے۔ قیصر[۱] کی اماں کو امروہے سے اس کے لیے بلایا تھا کہ وہ ہاتھ بٹائیں گی۔

---

[۱] قیصر نقوی

۵رفروری

چھادی بمبئی سے اپنی پیاری بھابھی جان سے ملنے آئی ہے۔ تین برس پہلے جان سے زیادہ پیاری بہن مجی سے جدا ہوچکی ہے۔ اب وہ بھابھی جنھوں نے ماں کی طرح برسوں پاس رکھا تھا رخصت ہوگئی ہیں۔ بت بنی بیٹھی ہے۔ ایسی بت وہ مجی کی رخصتی کے وقت بھی بن گئی تھی۔ چھوٹے بھائی جان کھڑے بلک رہے ہیں۔ چھوٹا دیور، پیارا دیور جسے ہمیشہ بیٹا کہا اور سمجھا بھائی اور بہن کی محبت کا مکمل نمونہ تھے یہ دونوں۔ یہ عابد صاحب ہیں، چہرے پر رنج وغم کی پرچھائیاں، ماتھے پر شکنیں، ہونٹوں پر صبر وضبط کا بندھن اور دل میں اپنی عزیز ترین دوست، بھائی اور بہن کے غم کے سیلاب۔ کبھی کبھی آہِ سرد کے ساتھ صرف مجھ سے اتنا کہا ہے گھر پر جو صدمہ گزر رہا ہے وہ کس سے کہوں۔ تم جانتی ہو کہ عورتوں میں میری جتنی دوستی اور محبت ان سے تھی کسی سے نہ تھی۔ اور وہ میرے بھائی جان بیٹھے ہیں جن کی تینتیس برس کی ساتھی، دوست، غم گسار، ہمدرد عاشق زار محبوبہ ان کا دل ویران کر کے منھ موڑ کر خاک کے نیچے سو رہی ہیں۔ جن کی صورت رنج وغم کا ایسا مرقع ہے کہ دیکھنے والے کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ آنکھوں سے جوئے خون رواں ہو رہی ہے اور منہ سے آہ بھی نہیں نکلتی۔ بتایئے بتایئے بھابی جان۔ آپ کی یہ بدنصیب مصداق کس کس کو سنبھالے، کس کس کو تسلی دے؟

۶رفروری

وقت گزر رہا ہے مگر زخم نہیں بھرتا۔ ناسور بنتا جا رہا ہے۔ بھائی جان اور بچیاں روز آتے ہیں۔ قبر پر جا کر فاتحہ پڑھتے ہیں پھر میرے پاس آتے ہیں۔ میرا ڈاکٹر وگ کا علاج شروع ہوا ہے۔ ان کا خیال ہے مجھے ۳۰ کو نمونیہ یا فلو کا بخار تھا جس کی پروا نہ کر کے میں چلتی پھرتی رہی۔ اب بالکل لٹا دیا ہے۔ کئی دن سے بھائی جان کے پاس نہیں جا سکی۔ دواؤں کی بہتات ہے۔ کھانسی میں کچھ کمی ہے مگر دل کے درد میں! کمی کیسے ہوگی خدایا!

۷رفروری

اک یارِ غم گسار نے چھوڑا ہمارا ساتھ
اک پیکرِ وفا نے اٹھایا وفا سے ہاتھ
اک جانِ آرزو نے کیا آرزو کا خوں

۸رفروری

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گی کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

۹رفروری

آج جامعہ میں بلکہ کہنا چاہیے اوکھلے میں ایک اور حادثہ ہوگیا۔ ندیم صاحب کی جوان بہن جس کے دو چھوٹے بچے تھے، انتقال کرگئی۔ گھر والوں پر قیامت گزر گئی ہوگی۔

ڈیڑھ مہینے میں یہ چوتھی موت ہے۔ مجتبیٰ صاحب کی والدہ فوت ہوئیں۔ بھابھی جان سدھاریں، ارشاد صاحب[۱] کی بیوی کا انتقال ہوا اور آج اس نوجوان لڑکی کی حسرت ناک موت کی خبر ملی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ رضا بقضائہ و تسلیما الامرہ۔

دیکھو تو اپنا غم پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔ کتنا نا قابلِ سہار پہاڑ۔ سوچو تو دوسروں پر جو پہاڑ گرتے ہیں وہ ان سے بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ اسی کا نام دنیا ہے۔

آئی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

---

[۱] ارشاد الحق صاحب

۱۰رفروری

آج کا دن بھائی جان اور لڑکیوں کے پاس گزارا۔ تقریباً نو گھنٹے۔ لیکن نو منٹ بھی بھائی جان کے پاس اکیلی نہ بیٹھ سکی۔ دو چار منٹ ملے بھی تو بات نہ کر سکی۔ ان کے سامنے زبان بند ہو جاتی ہے۔ نہ کچھ پوچھتے بنتا ہے نہ کہتے بنتا ہے۔ اور نہ وہ مجھ سے کچھ کہتے ہیں۔ بس آنکھوں سے آنسو ٹپک جاتے ہیں۔ سنا ہے کہ بھائی جان چہلم کے بعد پھر امریکہ سدھار جائیں گے۔ اس کو سن کر تو بس جیسے دم ہی پر بنی جا رہی ہے۔ یا اللہ! کیا کروں؟ ان کی اس بار کی جدائی کیسے سہاروں گی۔

رات کو گھر واپس آئی۔ بھائی جان ساتھ تھے۔ قبرستان میں فاتحہ پڑھتے ہوئے ذرا دیر کو میرے ہاں بھی آئے۔

یہاں آکر سنا تقی رضا[۱] کے ہاں بچہ ہوا تھا۔ ہوتے ہی مر گیا۔ ایک اور کلی مرجھا گئی۔ ایک اور زندگی موت کی آغوش میں سو گئی۔ ایک اور دل میں ناسور پڑ گیا۔

۱۱رفروری

دن بھر کچھ کام کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر دل کسی میں نہیں لگتا۔ شام کو بھابی جان کے پاس گئی۔ گلاب کے پھولوں کی پتیاں ان کی آرام گاہ پر بکھیر دیں اور جلتے ہوئے آنسوؤں کو آنکھوں میں دبائے واپس آ گئی۔

عابد صاحب آج کل کرکٹ کمنٹری اور جاسوسی ناولوں میں کسی طرح اپنے غم کو بھلا رہے ہیں۔ مگر مجھ سے پڑھا بھی نہیں جاتا۔ ریڈیو سننے سے بھی دل گھبراتا ہے۔ بس تسلی ہوتی ہے بھائی جان کے پاس رہ کر اور وہ ممکن نہیں۔ آج وہ نہیں آ سکے۔ رات کو ان کو فون کیا۔ فون پر ایک منٹ کی

[۱] جامعہ کے استاد

بات میں بھی بھابی ہی کا ذکر کرتے رہے۔

12 فروری

آج پہلے بٹیا اور زاہدہ کے ہاں اور پھر بھائی جان سے ملنے سجان سنگھ پارک گئی۔ صبح بھائی جان خود ڈاکٹر صاحب کے یہاں سے آئے تھے۔ گھنٹہ بھر رہ کر واپس چلے گئے۔ ان کے گھر پر تو چند منٹ کو بھی ملاقات نہ ہوئی تھی اکیلے میں۔ برابر لوگ آتے رہے۔

16 فروری

رات بھر سخت کمزوری اور تکلیف رہی۔ بارے صبح کو مرض میں کمی ہوئی۔ شام کو ڈاکٹر خادم حسین کو دیکھنے بلایا۔ بڑی دیر دیکھتے رہے، وہ اُدھر گئے اِدھر فون آیا۔ جی ڈر ہی رہا تھا۔ کل رات بھائی جان عابد صاحب کو دیکھنے آئے تھے (جو دو تین دن سے حرارت، نزلہ کھانسی میں مبتلا ہیں) بتایا تھا کہ باجی بیگم کی حالت اچھی نہیں۔ آپا شیری پرسوں سے ان کے پاس تھیں۔ عابد صاحب آئے کہا حالت خراب ہے۔ پھر اطلاع آئی کہ باجی بیگم نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی اور اپنی پیاری ببو بی[1] کے پاس سدھار گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

بھائی جان، زہرا اور غفران اسپتال سے یہاں آئے۔ صدمہ سے بھائی جان اور زہرا کانپ رہے تھے۔ ایک اور چرکا تازہ زخم پر لگا۔ سب بیٹھے باجی بیگم کی خوبیوں، خدمت اور محبت کا تذکرہ کرتے رہے۔

صبح کو لاش یہیں لائی جائے گی۔ ابھی سے انتظامات شروع کرنے ہیں مگر تیز بارش ہو رہی ہے۔ دیکھئے کل کیا ہوتا ہے۔

---

[1] بیگم سیدین کی عرفیت

17 فروری

صبح جیسے تیسے اٹھی۔ باہر اور اندر کے انتظامات شروع ہوئے۔ گیارہ بجے لاش آئی۔ تین بجے تدفین ہوئی۔ بھابھی جان کی پیاری باجی بیگم کو بھی میرے گھر ہی سے رخصت ہونا تھا۔ ساری خدمتیں یہیں انجام پائیں۔ جامعہ کے لوگ ایسے وقتوں پر جتنی ہمدردی اور انسانیت دکھاتے ہیں بہت کم کہیں اور نظر آتی ہے۔ خاص کر کاظم[1] بھائی اور قیصر کی والدہ کا احسان تو عمر بھر نہیں بھول سکتی۔ دونوں بار یہ لوگ نہ ہوتے تو ہم کچھ بھی نہ کر سکتے۔

18 فروری

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

سیدہ کو بخار آگیا ہے، جی پریشان ہے۔ اس کا دکھ سب سے زیادہ ہے۔ صدمہ سخت ہے۔ خدمت اور کام بھی مسلسل تین مہینے سے زیادہ کیا اور پھر کیا کچھ نہ جھیلا اور سہا اس غریب بچی نے۔ خدا اُسے تندرست کرے اور صبر کی طاقت دے۔

کل باجی بیگم کے سوئم کا سارا انتظام بھی کرنا ہے۔ لڑکیاں دیکھنا ہے آ بھی سکتی ہیں یا نہیں۔ میرے پاس ملازم نہیں۔ کل تو صبح صغرا بھی نہیں ہوگی۔ ایک گو ہر ایک آپا شیری کیا کیا کریں۔

19 فروری

چھدو[2] کے چکن پاکس نکل آئی ہے۔ تیز بخار ہے۔ جی سخت پریشان ہے۔ بھائی جان اور وہ خود کتنے پریشان ہوں گے۔ میں آج دن بھر باجی بیگم کے سوئم کے کاموں میں رہی۔ صبح قرآن

[1] کاظم زیدی [2] سیدہ سیدین حمید

نوانی اور مجلس تھی۔ محمودہ اور ذکیہ دس بجے کے بجائے ساڑھے گیارہ آئیں۔ تبرک آنے میں دیر تھی، اس لیے دیر ہوئی۔ یہاں مجھے خواتین سے شرمندگی اور سخت پریشانی۔ بارے مجلس ختم ہونے کے پہلے وہ اور تبرک آ گیا۔ ایک گھنٹے بعد لڑکیاں واپس چلی گئیں۔ محمودہ بھی نہ ٹھہریں۔ فاتحہ کا سارا کھانا پکانا بچاری شیری کے سر رہا۔ رات کو سب جگہ اللہ نام کا کھانا بھجوایا۔ ویسے تو اس وقت میں ہی عورتوں میں بزرگ ہوں۔ مجھی کو کرنا چاہیے مگر ان لڑکیوں کو بھی تو کچھ ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے۔ ورنہ ہمیشہ ذمہ داری کے موقع پر پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔ مجھے یاد ہے سب سے پہلے بھائی جان کی شادی میں جب میری عمر سولہ برس کی بھی نہ تھی، ایک دم سے سارا بار مجھ پر پڑ گیا تھا۔ اماں اور چھوٹی باجی خدا کو پیاری ہو گئی تھیں اور باجی اپنی بچیوں میں مبتلا اور یوں بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شاید انھوں نے کہیں بھی کوئی ذمہ داری نہیں اٹھائی ہوگی۔ آہ! کیا زمانہ تھا۔ اماں اور چھوٹی باجی کی جدائی کا غم تھا تو بھائی جان کی شادی کی مسرت تھی اور بھابی ملنے کی کتنی خوشی تھی۔ آج وہی بھابی ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئیں اور ان دونوں زخموں سے بھی زیادہ گہرا زخم سینے میں ڈال گئیں۔

۲۰ر فروری

بھابی جان کے لیے بھائی جان نے فال دیکھی تھی جس کا ترجمہ ذیل ہے۔ میری بھابی کی صفات سچی مومنہ کی صفات تھیں۔ اس سچے کلام نے ان کے درجے جو خدا کی بارگاہ میں ہوں گے ان کا کیسا صحیح نقشہ کھینچا ہے کتنا دلکش:

> ''یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ کے ساتھ اپنا عہد (عبودیت) پورا کرتے ہیں۔ اپنا قول وفعل توڑنے والے نہیں۔
>
> یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے جن رشتوں کے جوڑنے کا حکم دیا، انھیں جوڑے رکھتے ہیں، اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں، حساب کی سختی کے خیال سے اندیشہ ناک رہتے ہیں۔

اور یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ سے محبت کرتے ہوئے (ہر طرح کی ناگواریوں اور سختیوں میں) صبر کیا، نماز قائم کی۔ جو کچھ روزی انھیں دے رکھی اس میں خرچ کرتے رہے، پوشیدگی میں بھی اور کھلے طور پر بھی۔ انھوں نے برائی کے مقابلہ میں برائی نہیں کی۔ جب پیش آئے اچھائی ہی سے پیش آئے تو (بلاشبہ) یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے عاقبت کا گھر ہے۔ ہمیشگی کے باغ ہیں جن میں وہ خود بھی داخل ہوں گے اور ان کے آبا و اجداد، بیویوں اور اولاد میں سے جو نیک کردار ہوں گے وہ بھی جگہ پائیں گے اور (وہاں کی زندگی ایسی ہوگی کہ) ہر دروازہ سے فرشتے ان پر آئیں گے اور کہیں گے "یہ جو تم نے (دنیا کی زندگی میں) صبر کیا تو اس کی وجہ سے (آج) تم پر سلامتی ہو۔" پھر کیا ہی اچھا عاقبت کا ٹھکانہ ہے جو ان لوگوں کے حصہ میں آیا۔" (سورہ رعد۔ نواں رکوع)

۲۳ر فروری

آج دن بھائی جان کے ہاں گزرا۔ باجی بھی آگئی ہیں۔ ساجدہ، بیا، زاہدہ بھی آئی تھیں۔ بمبئی سے مسز سایانی آئی ہوئی ہیں۔ تعزیت کے لیے آئی تھیں۔ شام کو لاج[۱] اور ساجدہ آئیں۔ کشمیر میں ساجدہ سے کئی بار ملاقات ہوئی تھی۔ بھابی جان کو یاد کر کے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ دن بھر بھائی جان کے پاس یا لوگ آتے رہتے ہیں یا خط آتے رہتے ہیں اور اگر چند منٹ خالی ملتے ہیں تب بھی وہی ذکر، وہی یاد۔ کسی کا بھی تو دل نہیں چاہتا کہ اس محبوب یاد، اس دلکش ذکر اس پیاری ہستی کو دم بھر کے لیے بھلایا جائے۔ کم سے کم میرا اور بھائی جان کا تو نہیں چاہتا۔ لوگ کچھ اور باتیں کر رہے ہوں۔ ہنسنے کی کوشش کر رہے ہیں (اس لیے کہ آج کل واقعی لوگوں کو ہنسنے یا اور باتیں کرنے کے لیے کوشش کرنی پڑتی ہے) تو دل پر عجیب تکلیف سی ہوتی ہے۔

رات کو بھائی جان ہمارے ساتھ ہمیں پہنچانے آئے۔ ہمارے غفران جب میں وہاں جاتی

---

[۱] مسز یونس خاں

ہوں شام یا رات کو خود پہنچا کر جاتے ہیں۔حسب دستور پہلے قبرستان گئے۔دیکھا تو وہاں روشنی ہو رہی ہے دل دھک سے ہو گیا۔معلوم ہوا بچارے بڈھے خلیفہ جی مر گئے۔اس مہینے میں جامعہ نگر میں چھٹی موت ہے۔خدا رحم کرے اور ساتھ خیریت کے باقی سب کی سلامتی میں یہ مہینہ گزر جائے۔

۲۴رفروری

سارے دن ذکیہ، امن وغیرہ کا انتظار کیا مگر وہ نہیں آئیں۔صغرا اور گوہر صبح تاباں صاحب کی بہو کو ریسیو کر کے اسٹیشن چلی گئی تھیں۔بارہ بجے کے بعد واپس آئیں۔شام کو ۴ بجے ہی عابد صاحب ذاکر صاحب کی افطار پارٹی میں چلے گئے جہاں تقریباً سو آدمیوں کی دعوت تھی۔بھائی جان کو بھی عابد صاحب اصرار کے ساتھ لے گئے تھے۔یہاں یوں تو سارا دن میں پریشان رہی۔کسی کا کسی بات میں جی نہیں لگتا۔کلام پاک کے دو پارے رہ گئے تھے۔آج وہ بھی ختم کیے۔پھر کئی دن سے ایک انگریزی ناول شروع کر رکھا تھا، دوپہر میں اسے بھی ختم کر ڈالا مگر شام قیامت ہو گئی۔وقت کٹنے ہی میں نہ آیا تھا۔ٹہلی، پھری، اِدھر اُدھر گھر میں گھومی، کچھ دیر روتی رہی، پھر باہر ٹہلتی رہی۔پھر مغرب کی نماز پڑھی اور ایک گھنٹے تک آنسو بہتے رہے۔گوہر اور مینا آئیں۔سمجھیں سو رہی ہوں۔ان کی وجہ سے جیسے تیسے سنبھلی۔جانماز تہہ کی باہر صحن میں نکل گئی۔مگر سردی تھی، واپس آنا پڑا۔بارے ساڑھے آٹھ بجے عابد صاحب واپس آگئے۔غلام حیدر بھی آگئے تھے۔اِدھر اُدھر کی باتوں میں کچھ وقت کٹا۔

۲۶رفروری (یکم شوال عید)

صبح آٹھ بجے ہی بھائی جان کے ہاں چلی گئی۔زہرا اور سیدہ کے علاوہ سب لوگ جاگے ہوئے تھے۔امّن، شیری اور باجی مجھ سے مل کر رونے لگیں۔بھائی جان اور ذکیہ کے منہ ذرا ذرا

سے نکلے ہوئے تھے۔ ناشتہ کی میز سے ذکیہ بہانا بنا کر گئی۔ جا کر دیکھا تو ایک پلنگ پر لیٹی سسک سسک کر رو رہی تھی۔ جانے کتنی دیر وہ روتی رہی۔ بڑی مشکل سے اُسے سنبھالا۔ بلقیس کے ہاں گئی۔ وہ اپنے نئے گھر کی صفائی وغیرہ کر رہی تھی۔ مسز سایانی اور زیدی صاحب ملنے آئے۔ مسز سایانی بہت ہی متاثر تھیں۔ کہنے لگیں بھابی تو بھائی جان کی بلا لے کر گئی ہیں۔

شام کو پہلے غفران، امن، شیری، گوہر وغیرہ کو گھر پر لے کر آئے پھر میں اور بھائی جان، بلقیس اور زہرا کو، رحمٰن صاحب[1] کو ساتھ لائے تا کہ وہ قبر کا نقشہ بنائیں۔ دیکھا تو وہاں عابد صاحب گلاب کے بہت سے پھولوں سے دونوں قبریں سجا رہے تھے اور زہرا کا چپکے سے وہ کہنا ''پھوپی جان! اب ہماری بھی عید ہوگئی۔ ان کی قبر پھولوں سے سج گئی۔'' صبح کہہ رہی تھی ''خواب میں دیکھتے دیکھتے جاگتی ہوں۔ پھوپی جان تو سینہ میں گولی سی لگتی ہے کہ امی نہیں ہیں!'' لیکن باپ اور بہنوں کی وجہ سے نہ کسی کے سامنے کچھ کہتی ہے نہ روتی ہے۔ لیکن راتوں میں تنہائی میں کتنا جاگتی۔ کتنی روتی ہے۔ کون جانے! اور یہی حال بھائی جان کا ہے، تینوں دوسری لڑکیوں کا ہے، میرا ہے۔ صبر! وہ تو خدا ہی دے گا۔

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

....

شمع بھی، گل بھی ہے، بلبل بھی ہے، پروانہ بھی
رات کی رات یہ سب کچھ ہے یہ کچھ بھی نہیں
نیستی کی ہے مجھے کوچہ ہستی میں تلاش
سیر کرتا ہوں اُدھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں

---

[1] آرکی ٹیکٹ

یکم اپریل

جامعہ میں آج کچھ شاعروں کو بلایا گیا تھا۔ ایک بجے کھانے کا اور دو بجے مشاعرہ کے بلاوا تھا مگر کھانا دو کے قریب ختم ہوا اور مشاعرہ تین بجے شروع ہو سکا۔ فراق، وجد، آزاد، قتیل شفائی، حفیظ، سردار جعفری اور چند اور شاعر تھے۔ صدارت بھائی جان نے کی۔ مجھے تو مشاعرہ زیادہ پسند نہیں آیا۔ فراق کی پرانی گھسی پٹی چیزیں۔ حفیظ پہلے ہی کون سا اچھا کہتے تھے اب تو گویا ختم ہی ہو چکے۔ اقبال صفی پوری کی ایک غزل اچھی تھی اور سردار[1] کی غزل پرانی مگر خوب تھی۔ تاباں کی بھی اچھی خاصی تھی۔ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ انڈو پاک مشاعرہ سے کہیں بہتر نشست تھی۔ اور ہر سال ہی ہمارے ہاں شاعر اچھی اچھی چیزیں دل سے سناتے ہیں اور داد پاتے ہیں۔

بہت مشکل سے بھائی جان کو سب نے مل کر آج فلم دیکھنے پر آمادہ کیا۔ ایک انگریزی فلم ان کے ساتھ جا کر دیکھی۔ لڑکیاں بھی سب سوائے بلقیس کے، ساتھ تھیں اور مہدی[2] بھی۔ مجھے تو ذرا بھی پسند نہیں آئی۔ وہی امریکن فلموں کا خاص انداز۔ سخت بور ہوئی۔ بھائی جان نے بھی ذرا لطف نہیں لیا۔ اداس و خاموش بیٹھے رہے۔ عابد صاحب کو البتہ کافی پسند آیا۔

آج مشاعرہ میں سجاد ظہیر سے ملاقات ہوئی تھی ہم کو انھیں کھانے پر بلایا ہے۔

۲/اپریل

ظفر پیامی کے ہاں آج شام دعوت تھی۔ حفیظ اور دیگر شعرا کی اور دوپہر میں حمیدہ سلطان کے ہاں۔ میں نے دونوں جگہ انکار کر دیا۔ البتہ عابد صاحب ظفر پیامی کے ہاں گئے اور رات کو واپس آئے۔ کہتے تھے وہاں حفیظ نے بہتر چیزیں سنائیں اور بجائے احساسِ کمتری کے مظاہرے کے خاصے نارمل رہے۔ ان قدر دان اور ہم وطن وہاں جمع تھے اس سے وہ خوش نظر آتے تھے۔

---

[1] علی سردار جعفری [2] مہدی عباس حسینی

میرے ہاں چار دن سے سفیدی ہو رہی ہے اور پورا گھر الٹ پلٹ کرنا پڑ رہا ہے۔ صبح سے شام تک سخت مصروفیت اور محنت میں گزرتا ہے۔

۴/اپریل

رضیہ کے ساتھ سجاد ظہیر کو بھی کھانے پر بلایا تھا اور مجیب اور مسز مجیب و خورشید، سعیدہ، تاباں و مسز تاباں، بھائی جان اور ذکیہ کو بھی۔ صبح چھ بجے سے شام تک پکاتے گزرا۔ دو چیزیں میں نے پکائیں۔ ساڑھے پانچ بجے P.W.A. کی ایک نشست کرائی تھی جس میں رضیہ نے دو کہانیاں سنائیں اور ایک میں نے۔ رضیہ کی کہانی 'ہمدردی کی قیمت' جسے خاکہ کہنا چاہیے مزاحیہ اور دلچسپ تھی جو بہت پسند کی گئی اور دوسری خاصی پر اثر تھی۔ وہ خاکہ اور چھوٹے افسانے خوب لکھتی ہیں اور اس سے بھی اچھا پڑھتی ہیں۔ ناول لکھنا ان کے بس کا نہیں۔ ممکن ہے آگے چل کر کوئی عمدہ ناول لکھ لیں۔

انھیں دوسری جگہ جانا تھا اس لیے کھانا ۸ بجے ہی کھلا دیا گیا اور وہ لوگ بھائی جان کے ساتھ چلے گئے۔ باقی لوگ دیر تک رہے۔ میں تھک کر اتنی چور ہو چکی ہوں کہ پلنگ پر لیٹنے کے خیال سے بھی جی گھبرا رہا ہے۔ نیند کی دوا کھا کر سوؤں گی۔

۷/اپریل

آج ۷/اپریل ہے اور ہماری شادی کی سالگرہ۔ تیس سال ہوئے ہیں جب آج ہی کے دن ہم دونوں محبت اور دوستی کے مقدس بندھن میں باندھے گئے تھے اور یہ بندھن ہر سال اور زیادہ اور زیادہ مضبوط ہوتا گیا۔ بڑے بڑے کٹھن وقت آئے۔ بیماریاں، پریشانیاں، تنگ دستی، خانہ ویرانی، پارٹیشن، فسادات، اور کیا اور کیا۔ لیکن کس زبان سے خدا کا شکر احسان ادا کیا جائے کہ ہر مصیبت وہ راحت نے ہماری دوستی کو اور استوار کیا، ہمیں ایک دوسرے کو اور زیادہ سمجھنے کا موقع

دیا۔ ایک دوسرے کے لیے اور زیادہ دکھ اٹھانے کی صلاحیت عطا کی۔ آج سے تیس برس پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ ہماری شادی اتنی کامیاب ہوگی۔ شاید خاندان بھر کا خیال تھا کہ ایسی بے جوڑ شادی اب تک نہ ہوئی تھی۔ اب شاید ہی کوئی ہو جو زبان سے نہ سہی دل میں ہماری خوش نصیبی پر رشک نہ کرتا ہو۔ ہاں جو لوگ صرف دولت، دنیاوی جاہ حشمت اور اولاد کی نعمت ہی کو زندگی کی مسرت کی بنیاد سمجھتے ہیں وہ ہمیں کم نصیب سمجھ سکتے ہیں۔

پچھلے سال آج کے دن میں کراچی میں تھی۔ اس کے پچھلے سال بھی کچھ واقعہ ایسا ہوا تھا کہ سالگرہ نہ ہو سکی تھی۔ خیال تھا کہ تیسویں سالگرہ خوب دھوم سے منائیں گے۔ مگر قسمت کے چکر کہ اب تو کوئی خوشی خوشی نہیں لگتی۔ سالگرہ کی تقریب منانا یا فلم وغیرہ جا کر دل خوش کرنا تو الگ رہا۔ تقریباً سارا دن میرا رونے میں کٹا۔ رہ رہ کر بھابی جان کی یاد آتی رہی۔

۲۱ رمئی

تھرڈ کلاس کے سفر کی زحمت اٹھاتے رات کو ڈھائی بجے کانپور پہنچے۔ ابوالحسن[۱] موجود تھے۔ ان سے ٹکٹ منگایا۔ پانچ بجے ارول کی گاڑی روانہ ہوئی۔ سات بجے ارول پہنچے اور وہاں یکے میں بیٹھ کر تین میل دور اپنے گھر دائی پور۔ یہاں بچے میرے اور صغرا کے آنے سے بہت خوش ہیں۔ ننھے چچا، نذیر، انیس سبھی بہت خاطر کر رہے ہیں۔ مگر ان لوگوں کو یہ فکر ہے کہ یہاں مجھے گرمی کی سخت تکلیف ہوگی اس لیے کہ پرانے کا کچّا مکان ہے (کوئی چار سو برس پہلے کی طرز تعمیر) اور بجلی ہے نہیں۔

دن سخت گزرا۔ شام کو ننھے چچا کی اجازت سے سب لڑکیوں کو لے کر گنگا کنارے گئی۔ کوئی دو تین فرلانگ گرم ریت پر چل کر تب گنگا تک پہنچے۔ لیٹے بیٹھے۔ منہ ہاتھ پاؤں دھوئے۔ شعر پڑھے اور سنے اور واپس آگئے۔ ویسے کسی کو نکلنے کی اجازت نہیں۔ میری خاطر برقعہ اڑھا کر

---

۱ عابد صاحب کی کزن کے شوہر

لڑکیوں کو بھیج دیا گیا۔ میں ظاہر ہے بے برقعہ گئی۔ مگر جھٹپٹے کا وقت تھا۔ کوئی ملا نہیں۔

۲۲ رمئی

کل رات اچھی خوشگوار گزری۔ گنگا کے کنارے ہونے کی وجہ سے راتیں اچھی ہوتی ہیں۔ مگر نیچے صحن میں بہت سے لوگوں کے ساتھ ساتھ جانوروں کی بھی قیام گاہ ہے۔ مرغ بانگ دیتے رہے جس سے میری مریض نیند خراب ہوتی رہی۔ آج اوپر سوؤں گی۔ دن آج بھی سخت گزرا۔ ریاض[۱] بہن کی طبیعت صاف نہیں۔ کھجلی کی شکایت ہے اور شفاعت[۲] بہن گرمی میں کچھ اور زیادہ جھکّی اور بدمزاج ہو جاتی ہیں۔ سارے دن کسی نہ کسی پر بکتی رہتی ہیں۔ بڑے بابا کچھ عمر کے تقاضے کچھ مزاج کی اپج کی وجہ سے سب پر چیخا چلایا کرتے ہیں۔

۲۳ رمئی

رات اچھی گزری۔ دن تکلیف دہ۔ بعض وقت خیال آتا ہے کیسے یہ باقی دن کٹیں گے۔ پھر سوچتی ہوں یہ لوگ بچارے جو ساری گرمی یہیں بتاتے ہیں، آخر یہ کیسے کاٹتے ہیں؟ سب سے بڑی تکلیف یہ ہے کہ اندر زنانے میں جو کمرہ تھا، وہ کئی سال ہوئے گر گیا۔ اس میں ہوا بھی آتی تھی، پکا بھی تھا۔ گھر والوں اور مہمانوں دونوں ہی کے لیے آرام دہ تھا۔ مگر کھیت وغیرہ سے ننھے چچا کی بس اتنی ہی آمدنی ہوتی ہے کہ خاندان کے ضروری خرچ چلالیں اور ہر سال اندر باہر کے جو دو ایک چھپر اُڑ جاتے ہیں، وہ نئے سرے سے ڈلوائیں۔ مہنگائی کے اس دور میں چھ سات سو ہر سال اسی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ یا تو اس مکان میں پانچ سات ہزار روپے لگائے جائیں یا پھر رفتہ رفتہ الگ چھوٹی چھوٹی کرا کر رہنے کے قابل بنا لیا جائے۔ مگر کرے کون؟ میرن صاحب کی آمدنی تین سو زائد نہیں۔ عابد صاحب کی آٹھ سو ہے مگر خرچ اس سے بھی زیادہ۔

---

۱ عابد صاحب کی کزن ریاضت فاطمہ ۲ عابد صاحب کی پہلی بیوی

خاندانی ذمہ داریوں کا بوجھ اتنا ہے کہ بچت کا کیا سوال؟ پوری ہی نہیں پڑتی۔ لڑکے ابھی پڑھ ہی رہے ہیں۔ ننھے چچا بچارے کے اپنے اولاد نہیں۔ وہ بھی دوسروں کے بچوں پر خرچ کرتے اور دوسروں کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔

۲۶ر مئی

کل مختار[۱] بھی دہلی سے پہنچ گئے۔ عابد صاحب کا خط اور دوسرے کچھ خطوط لائے۔ عابد صاحب ۲۴ کو مسوری چلے گئے ہوں گے۔ نواب مہدی نواز جنگ نے مجھے، ان کو اور بھائی جان کو ماؤنٹ آبو آنے کے لیے مدعو کیا ہے۔ اس پہاڑ کی بلندی صرف چار ہزار ہے جو بھائی جان کے لیے مناسب ہے۔ ممکن ہے اب پروگرام وہیں جانے کا بنے۔ ایک بنّن کا خط آیا۔ معلوم ہوا قمر سخت بیمار ہوگئی تھی۔ اب بھی ٹھیک نہیں۔ لڑکی بے حد پریشان ہے۔ اس کو خط لکھا۔ ظہیر کے پاس میرے جو روپے ہیں ان کو لکھا ہے کہ تم منگا لو۔ گھر میں سب قمر کی بیماری سے پریشان ہیں۔ شفاعت بہن کو بتایا نہیں ورنہ وہ ہنگامہ کرتیں۔ خود بھی روتیں، خفا ہوتیں اور دوسروں کے لیے بھی مصیبت کرتیں۔ بنّن ان کی بیٹی بنی ہوئی تھی۔ اب وہ پاکستان ہے اور برسوں سے نہیں ملی۔ اس لیے قدرتی طور پر ان کو اس کا صدمہ ہے۔ حالات پر تو قابو نہیں۔ لوگوں کو پریشان کرتیں اور خفا ہوا کرتی ہیں۔

عابد صاحب نے لکھا ہے تم ابھی علی گڑھ چلی جاؤ ورنہ بیمار پڑ جاؤ گی۔ مگر مجھے یہ گوارا نہیں کہ سب کا دل دُکھا کر چلی جاؤں۔ ۸ر محرم کو میرا جانے کا پروگرام ہے۔ اس وقت جاؤں گی۔ دو دن سے دوپہر جو کاٹے نہیں کٹتی تھی، اس کے گزارنے کی صورت یہ نکالی ہے کہ اے آر خاتون کا نیا ناول گھر والوں کو پڑھ کر سناتی ہوں۔ بچے اور بڑے سب کتنے شوق سے سنتے ہیں۔

---

[۱] ظفر مہدی عابد صاحب کے جواں مرگ بھانجے

۲۸ مئی

مجلسیں اچھی ہو رہی ہیں۔ مجمع کم ہوتا ہے مگر اثر و خلوص زیادہ نظر آتا ہے۔ مجھے تو جن مجالس میں نمائش شو ہنگامہ نظر آئے وہ پسند نہیں آتیں۔ اس لیے میں علی گڑھ کی جگہ یہاں آئی۔ مگر اب باجی کے اصرار پر دو تین دن علی گڑھ بھی رہنا ہی ہوگا۔

دو رات سے آندھی آ رہی ہے۔ بستر اور سامان لے کر اوپر سے نیچے آنا پڑتا ہے۔ بہت اونچی سیڑھیاں ہیں۔ بڑی مشکل ہوتی ہے۔ کہتے ہیں شیر شاہ کے زمانے میں (جب اس خاندان کے بزرگ سے وہ ارادت وعقیدت کا اظہار کرنے آیا تھا) یہ گھر بنا تھا۔ اسی دوران میں کئی بار جلا اور گرا۔ اب پچیس سال سے اس کی لیپا پوتی کی جا رہی ہے۔ لیکن اتنا بے ڈھنگا اور بوسیدہ مکان ہے کہ اس کو ٹھیک کرنا بیکار درد۔ ایک ایک آثار گز بھر کا ہے۔ یہ بستی جو کبھی سیکڑوں گھروں اور حویلیوں پر مشتمل تھی، اب سارے علاقے میں صرف یہ مکان، اس کے پشت کی چھوٹی سی مسجد رہ گئی ہے اور کافی دور درگاہ جو خاندان کے بزرگ تھے اور جن کی وجہ سے یہ قصبہ داعی پور کے نام سے مشہور تھا۔ ہاں اب نچلے طبقے کے جن لوگوں کی آبادی رہ گئی تھی وہ پنپ رہے ہیں۔ ممکن ہے دس بیس سال میں وہ پھر اسے ایک آباد گاؤں بنالیں۔ ہمارے ہاں تو کوئی اس قابل نظر نہیں آتا کہ ننھے چچا کے بعد اس کو آباد رکھ سکے گا۔[1]

۳۱ مئی

آج دن بھر روانگی کی تیاری رہی۔ بچے بڑے سب میرے جانے سے رنجیدہ ہیں۔ لیکن میری مجبوری دیکھتے ہوئے راضی ہو گئے کہ میں بیچ محرم میں چلی جاؤں۔

رات کو نو بجے ارول سے روانہ ہوئے۔ گھر سے اسٹیشن تک نذیر اور میرا ایک پرانا ملازم

---

[1] عابد صاحب کا آبائی گھر جو داعی پور ضلع فرخ آباد میں ہے۔

جمال پہنچانے آیا۔ کانپور تک مختار کو ساتھ لائی۔ کانپور میں جنتا پکڑنے کے لیے بڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑی۔ بمشکل زنانہ درجہ تلاش کر کے اس میں سوار ہوئی۔ ٹکٹ چیکر سے ٹکٹ بنانے کو کہا۔ سامان اوپر کی سیٹ پر رکھ کر ایک سیٹ پر بیٹھ گئی اور سیٹوں پر خواتین اور بچے دراز تھے۔

بارہ بجے گاڑی روانہ ہوئی۔ مختار کو واپس دائی پور بھیج دیا ہے۔ تین بجے ایک خاتون اتریں تو ان کی سیٹ لیٹنے کو ملی۔ کل چھ بجے علی گڑھ پہنچ جاؤں گی۔

یکم جون

باجی کے ہاں پہنچی تو سوا باجی کے کوئی نہ تھا۔ صابرہ اور زاہدہ میرٹھ اپنے بھائی کے پاس گئی ہوئی ہیں۔ رات بھر کے جاگنے اور سفر سے بہت تھک گئی تھی۔ دوپہر کو سونا چاہا مگر سخت گرمی ہے۔ نیند نہ آئی۔ شام کو رانی دلہن کے ہاں مجلس میں گئی۔ آج ۸ کو حضرت عباس کا تابوت اور علم اٹھتا ہے اور بڑا مجمع ہوتا ہے۔ گھنٹوں ماتم کیا جاتا ہے۔ مرثیہ اصرار کر کے مجھ سے پڑھوایا اور اس قدر رقّت ہوئی کہ پڑھنا محال ہوگیا۔ اس کے بعد گھنٹے بھر سے زیادہ نوحے اور ماتم ہوتا رہا۔ تابوت اندر امام باڑے میں لاکر رکھ دیا گیا۔ میں بہت کم تابوت وغیرہ کے پاس جاتی ہوں۔ منت ونت تو خیر کہیں بھی اور کبھی بھی نہیں مانی مگر آج تابوت کے قریب جا کر اس پر سر رکھ کر دیر تک نیم بے ہوشی کی سی حالت میں رہی۔ آنسوؤں کا سیلاب تھا جو بہا جا رہا تھا۔ جانے کیسے اپنے کو بعد میں سنبھالا۔

شام کو بیگم کے ہاں چلی گئی۔ قیصر اور ان کے دوست صابر سے دیر تک بات چیت رہی۔ رات کو پیدل باجی کے ہاں واپس آئی۔

عابد صاحب اور بھائی جان کے خط ملے۔ ابھی بھائی جان نے آخری فیصلہ نہیں کیا کہ کب اور کہاں جا رہے ہیں۔ کل ان کو فون کراؤں گی۔

۲؍جون

آج بھی رانی دلہن کے ہاں کی مجلس میں میں نے پڑھا امام حسین علیہ السلام پر اپنا مضمون۔ عورتیں بے حد متاثر تھیں۔ آج بھی تابوت اٹھا اور گھنٹوں ماتم ہوا۔ میں تو جلدی ہی چلی آئی اور رات گئے تک ریڈیو پر مجلس سنتی رہی۔ پشاور سے ذوالفقار بخاری نے انیس کا مرثیہ پڑھا۔ نہایت عمدہ۔ پون گھنٹے تک وہ پڑھتے اور میں محو ہو کر سنتی رہی۔ کتنا پر اثر اور صحیح انداز ہے پڑھنے کا سبحان اللہ۔

آج صابرہ اور زاہدہ میرٹھ سے آگئی ہیں۔ بھائی جان کو ٹرنک کال کیا۔ آبو جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ۹ کی سیٹیں کرائی ہیں۔ ۴ یا ۵ کو میرا روانہ ہونے کا ارادہ ہے۔

آج شب عاشور تھی۔ عام طور پر یہ شب مجلسیں کرتے، پڑھتے اور عبادت کرتے گزاری جاتی ہے۔ مگر یہاں تو تسبیح بھی نہیں ملی۔ انگلیوں پر بارہ بجے تک پڑھتی رہی۔ یوں تو میں نے دو سال پہلے احمد آباد میں بھی شب عاشور گزاری تھی۔ جرمنی تک میں گزاری ہے۔ مگر میں اور عابد دونوں مل کر جہاں بھی ہوں اس کے احترام کے طور پر جاگتے اور پڑھتے رہتے تھے۔ مگر آج کی رات مجھ پر کٹھن گزری۔ لڑکیاں تو مذہب سے بیگانہ ہیں اور باجی بھی ان چیزوں کی اب زیادہ پابندی نہیں کرتیں۔ ہاں مجلسوں کا اور پڑھنے کا شوق اب بھی بہت ہے۔

۳؍جون

عجیب بات ہے ہر جگہ عاشور کے دن مجالس زیادہ ہوتی ہیں مگر علی گڑھ میں زنانہ مجلس ہوتی ہی نہیں۔ اعمال بھی کوئی کوئی کرتا ہے۔ صبح چار بجے کے بعد سے ہی مرثیہ اور تسبیح وغیرہ پڑھتی رہی۔ دس بجے بیگم کے ہاں مجلس میں جانا اور پڑھنا تھا مگر تین بجے سے سخت طوفانی بارش اور آندھی چلنی شروع ہوئی جس کا سلسلہ دیر تک رہا اور کہیں نہ جا سکی۔ ایسا یوم عاشورہ میرا پہلے کبھی نہ

گزرا تھا۔ بہت کوفت ہوئی۔ میں یہ تو نہیں سمجھتی کہ سارے آداب و قاعدوں کی پابندی نہ کی جائے تو گناہ ہوتا ہے۔ مگر ہر مذہب، عقیدے اور معاشرے کے کچھ اصول و آداب ہوتے ہیں جن کی پابندی کرنا اور احترام کرنا ہر مہذب آدمی کا فرض ہونا ہے اور حسینؑ کی شخصیت اور عظمت کی تو دنیا قائل ہے۔ دنیا بھر میں ان کا سوگ کیا جاتا اور ان کی لاثانی قربانی کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس کچھ دیکھوں تو مجھ پر بہت تکلیف گزرتی ہے۔

آج دیر تک بجلی غائب رہی اس لیے ریڈیو پر بھی مجلس بہت کم سنیں۔ نو بجے کے بعد سے البتہ دلّی اور لکھنؤ سے آج کا پروگرام اور شام غریباں کی مجلس سنی۔

☆☆☆

1970

۹ رمئی

بچیوں کے جانے سے گھر سنسان ہو گیا ہے۔ رات کتنی اداس اور خاموش ہے۔ عابد صاحب پڑھ رہے ہیں۔ صغرا پیٹھ موڑے ریڈیو سن رہی ہے اور میں خیالات کے تانے بانے جوڑ رہی ہوں۔

رعنا کتنی پیاری لڑکی ہے۔ ہر کام ہر خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہے۔ سوا نجو کے کسی سے نہیں لڑتی۔ صغرا کی نصیحت، چھیڑ چھاڑ، ڈانٹ سب ایک مسکراہٹ کے ساتھ جھیل جاتی ہے۔ میرا کتنا خیال رکھتی ہے۔ طبیعت میں جلد بازی نہ ہوتی اور اعصابی مزاج نہ ہوتا تو اور اچھا تھا۔ پڑھنے میں بہت جی لگاتی ہے۔ ٹریننگ کر کے خاندان کا بوجھ اٹھانے کا عزم رکھتی ہے۔ خدا اُسے کامیاب کرے۔

نجو لاڈ میں بگاڑی ہوئی لڑکی ہے۔ مگر دو سال میں بہت سدھر گئی ہے۔ پڑھائی میں ابھی تک کمزور ہے۔ ضدی اور خود رائے ہے اس لیے کسی سے پڑھتی نہیں مگر محنت بے حد کرتی ہے۔ میری بات اور نصیحت سن لیتی ہے۔ اپنے کو سدھارنے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر بچپن کی عادتوں کو چھوڑنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ ساتویں کا امتحان دیا ہے۔ دیکھیں کیسی پاس ہوتی ہے۔

آصف کو آج تیز بخار ہے، کچھ اور تکلیفیں بھی ہیں۔ جی پریشان ہے۔ خدا کرے جلد ٹھیک ہو جائے۔ کل یا پرسوں وہ بھی چلا جائے گا۔ اور بھی سناٹا ہو جائے گا۔ لکھنے کا کام بہت پڑا ہوا ہے۔ آج اٹھارہ صفحے ناول کے لکھے۔ باپو کا تھوڑا ترجمہ بھی کیا۔ مضمون ذاکر صاحب ریڈیو سے آیا ہے۔ اس کی نظر ثانی اور نقل کر کے اصل جلد واپس کرنا ہے۔ کستور با گاندھی پر ایک فیچر لکھ کر بھیجنا

ہے۔ تین گھنٹے مسلسل لکھنے کا کام کرتی ہوں تو بہت تھک جاتی ہوں۔ گھر کا تقریباً سارا کام صغرا بچاری نے سنبھال رکھا ہے۔ اس سے مجھے ریسٹ بھی ملتا ہے اور لکھنے کا وقت بھی۔ گرمی دو دن کم رہی۔ آج پھر بڑھ گئی ہے۔ بلقیس ذکیہ کوئی ملنے نہیں آئیں۔ فون کیا اس پر بھی نہیں آئیں۔ خیر وہ جہاں رہیں خوش رہیں۔ مجھے تو بھائی جان کا خیال ہے۔

۲۳ر مئی

اتنے دن سے ڈائری نہیں لکھ پائی۔ دس بارہ دن بہت سخت گرمی پڑی۔ ایسی کہ جون میں بھی کم ہی پڑتی ہے۔ کئی راتیں بس اس حال میں کٹیں کہ جل اٹھتا تھا پہلو تو وہ پہلو بدلتے تھے۔ گزشتہ چار دن سے ایک دم موسم نے پلٹا کھایا۔ آندھیاں آئیں و بارشیں ہوئی اور اب یہ لگ رہا ہے کہ یہ وہ دلّی نہیں جو جہنم کی طرح جھلس رہی تھی بلکہ سری نگر یا نینی تال ہے۔ خدایا تیری کرشمہ سازیاں۔

بلقیس ذکیہ چلتے وقت ملنے آئیں۔ ۱۰ کو وہ دونوں مع بچوں کے ملیشیا چلی گئیں۔ منّی[1] غفران اور منّی کا بچہ بھی آئے۔ نائی وغیرہ کا انتظام کیا اور ان کے صاحبزادے کے مونڈن کا فرض ادا کرایا۔ بعض وقت جب صحت خراب ہو اور پریشانیاں زیادہ تو بڑی الجھن ہوتی ہے تو غصہ آتا ہے کہ کام کے وقت لوگوں کو میں یاد آتی ہوں۔ شادی بیاہ ہو کہ چہلم یا برسی۔ موت ہو یا بیماری، تو خیال آتا ہے کہ اس سے مدد لو اور جب ہم پریشان ہوں، بیمار ہوں، ہم پر کوئی وقت پڑے تو بیشتر لوگ کتنی بے پروائی سے ٹال جاتے ہیں۔ اپنے سے زیادہ صغرا بچاری کا خیال آتا ہے کہ میرے ساتھ وہ بھی اسی آزمائش سے گزرتی رہتی ہے۔ مگر جب یہ وقتی جذبہ ختم ہو جاتا ہے تو دل کو سکون سا ملتا ہے۔ خوشی محسوس ہوتی ہے۔ یہ تو اس کی رحمت اس کا کرم ہے کہ اس نے اس قابل کیا کہ کسی کے تھوڑے بہت کام آسکیں۔ لرز جاتی ہوں یہ سوچ کر کہ خدانخواستہ کوئی ایسا وقت آئے جب اس کا لٹا ہوا جب دوسروں کے رحم و کرم پر رہنا پڑا۔ خدایا۔ ہمیشہ اسی کی توفیق دیجو کہ خوشی سے یہ

[1] کرنل غفران کی بھانجی

فرض یا ذمہ داریاں اٹھا سکوں۔

انیس کی طرف سے دو ہفتے بہت پریشان رہی۔ آج معلوم ہوا کہ اُس کا بڑا آپریشن پیٹ کا ہوا ہے۔ خدا اُسے صحت دے۔ بچیاں کتنی پریشان ہوں گی۔ اقبال پر بے حد بوجھ پڑ رہا ہے۔ مالی، جسمانی، ذہنی ہر قسم کا اس کی فکر الگ پریشان رکھتی ہے۔ عابد صاحب کا اصرار ہے کہ صغرا چند دن کو چلی جائے اس لیے کہ اس کی ماں کی بھی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ مگر وہ اول تو مجھے تنہا چھوڑتے گھبراتی ہے۔ پھر وہاں اتنے لوگ ہیں ان میں ایک اور کا اضافہ اور اس سے بھی زیادہ یہ بات کہ جب جائے تو ان دونوں کی صحت ٹھیک ہونے کے بعد آئے۔ بہر حال کل تک یہ بات طے ہوگی کہ وہ جائے گی یا نہیں۔

تین دن سے طبیعت پھر خراب ہے۔ سر میں درد اور بھاری پن۔ بدن اکڑا ہوا، گلے میں چلتے وقت جو کنگ ہوتی ہے اور سینے میں گھٹن۔ بلڈ پریشر بھی 165 سے زیادہ ہوگیا ہے۔ جو ذرا اطمینان ہوا تھا، وہ ختم ہوگیا۔ کام بھی اب نہیں ہوتا۔ جی چاہتا ہے کہ بس پلنگ سے اٹھوں نہیں اور لیٹا بھی نہیں جاتا۔ جی گھبراتا ہے۔ صغرا اور عابد صاحب کی وجہ سے انتہائی کوشش کرتی ہوں پریشانی کا اظہار نہ ہو جائے۔ مگر تا کجے۔

بھائی جان کا خط آیا۔ بہت سے خط انھوں نے لوگوں کو بھیجے تھے وہ پوسٹ کرائے۔ ان کا فون کا بل ادا کرایا۔ کچھ خطوں کے ان کی طرف سے جواب دیئے۔ ان کو اور زہرا کو خط لکھ دیا ہے۔

عابد صاحب بہت مصروف ہیں۔ پچھلے دنوں شدید گرمی میں بھی کام کرتے رہے جو کبھی نہیں کیا تھا پہلے۔ سری نگر میں کوئی انتظام نہیں ہوا۔ عابد صاحب سے بہت کہتی ہوں کہ وہ دس پندرہ دن کے لیے شملہ یا مسوری چلے جائیں مگر وہ کسی طرح بھی جانے پر تیار نہیں اس لیے کہ میں یہاں رہ جاؤں گی۔ کتنا خیال ہے انہیں میرا۔

۲۴ رجولائی

آج ''اپنی اپنی صلیب[1]'' مکمل ہوگیا۔

صغرا کے جانے کا فیصلہ ابھی تک نہیں ہوا۔ شاید رات کو اقبال کے فون کرنے کے بعد ہو۔

آج کل کے لیے ذاکر صاحب کچھ اور مختصر کر کے مکمل کیا ہے۔ ۲۶ کو 'آج کل' [۲] کی سلور جوبلی کا جلسہ ہے۔ ان لوگوں نے مجھے تقریر کرنے کے لیے مدعو کیا ہے۔ طبیعت ٹھیک رہی تو ضرور جاؤں گی۔ 'آج کل' سے میرا پرانا ناتا ہے۔ پرسوں فخر الدین علی احمد سے ملنے کے لئے گئی تھی۔ عابد صاحب بھی ساتھ تھے۔ پنجاب وقف بورڈ کے سلسلے میں بات کرنی تھی۔ سیدھے سادے، کم گو اور شریف سے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی بیوی البتہ کافی تیز اور شوہر پر حاوی ہیں۔ خدا جانے بات انھوں نے سمجھی یا نہیں۔ بہر حال بحیثیت اس کی ممبر کے یہ میرا فرض تھا کہ ان کو یہ بات سمجھاؤں کہ اس بورڈ کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کریں ورنہ تباہ ہو جائے گا۔

واپسی میں عابد صاحب نے کہا اور ہم ہولی فیملی پر اتر گئے۔ اس طرح ٹیکسی کے مزید تین روپے دینے سے بچ گئے مگر اتنا لمبا چلنے سے طبیعت کچھ اور زیادہ خراب ہو گئی۔

آج کل دلّی میں کتنی تنہائی ہے۔ یعنی کہیں سے بوئے دمساز نہیں آتی۔ جامعہ نگر میں بھی سناٹا ہے۔ بہت سے لوگ چلے گئے ہیں۔

آج بیا علی گڑھ گئی ہے۔ ۲۹ کو مہینے بھر کے لیے بمبئی چلی جائے گی۔ اس کا میاں ماسکو گیا ہوا ہے۔ مسز مجیب ترکی میں ہیں۔ مسز نبی احمد پاکستان۔ مشیر عدّت میں ہیں۔

گھر میں صغرا نہ ہو تو تنہائی دس گنی زیادہ محسوس ہو۔ اگر وہ لکھنؤ چلی گئی؟

۴ر جون

شبو دو دن رہ کر آج واپس چلی گئی۔ برسوں بعد وہ آکر رہی اور لگتا تھا جیسے اس کے ذہن پر جو بادل سا ہے وہ چھٹ گیا۔ اس وقت روتی ہوئی گئی ہے۔ کاش اس کو چند دن اور رکھ سکتی مگر اس کے حالات تو ایسے ہیں کہ خدا دشمن کے بھی نہ کرے۔ مگر بڑی برداشت اور صبر کرنے والی لڑکی

[۱] مصنفہ کا ناول [۲] رسالہ

ہے۔ جانے کب اس کی تپسیا کا پھل خدا دے گا کہ اس دنیا میں وہ جہنم ہی میں جلتی رہے گی؟

کتنی تنہائی ہے۔ جامعہ نگر میں بھی بہت کم لوگ ہیں۔ مگر کل شام کئی خواتین دیکھنے اور مزاج پوچھنے آئیں۔ مگر خدا جانے کیا حالت ہوتی جا رہی ہے۔ دواؤں کا اثر ہے یا عام کمزوری۔ کئی دن سے بس یہ جی چاہتا ہے کہ آنکھیں بند کیے پڑی رہوں نہ کوئی مجھ سے بولے نہ میں کسی سے۔ اپنے کو گھسیٹ کر ٹہلنے جاتی ہوں۔ بمشکل نماز پڑھتی ہوں۔ تلاوت کسی کسی دن ہو سکتی ہے۔ سینے میں کئی دن سے درد کی ٹیس اور سخت گھٹن کی کیفیت تھی۔ پرسوں ڈاکٹر وگ کو دکھانے گئی۔ انھوں نے دوائیں بدلی ہیں۔ ایک دوا بے حد مہنگی ہے اور اس کا اثر بھی تکلیف دہ ہے۔ جیسے کسی کو افیم پلا کر بے جان کر دیا جائے۔ مجھ سے درد سہہ لیا جاتا ہے مگر یہ کیفیت نا قابلِ برداشت محسوس ہوتی ہے۔ آج فون کر کے پوچھوں گی کہ کیا یہ دوا چھوڑ دوں؟

صغرا لکھنؤ نہیں گئی۔ ان کی ماں کی طبیعت بہتر ہے اور انیس کی بھی۔

۱۴؍ جون

رات ’’ہیم کماری‘‘ چھپ کر آ گئی۔

اس کتاب کی بھی عجیب تاریخ ہے۔ سنو فلیک، پال گلیلو کی ایک بہت پیاری کتاب ہے۔ بارہ سال ہوئے بھائی جان نے مجھے پڑھنے کو دی اور کہا تم اس کا ترجمہ کرو۔ ترجمے میں مشکلات بھی تھیں اور الجھنیں بھی۔ میں نے اس کا اڈپٹیشن کیا۔ اُسے بالکل ہندستانی جامہ پہنایا ’ہیم کماری‘ نام رکھا۔ سیدین صاحب اور دوسرے لوگوں نے بہت پسند کیا۔ ایجوکیشن منسٹری کی ایک اسکیم میں اُس کی دو ہزار چھپی ہوئی کاپیاں خریدنے کی تجویز کی گئی جو منظور ہو گئی۔ سیدین صاحب اگرچہ سیکریٹری تھے مگر اس کے پاس ہونے کے وقت انھوں نے رائے نہیں دی۔

میں نے کتاب کی کتابت کرالی۔ چھپوانے کی منزل بعد میں آئی۔ دو تین سال بیت گئے۔

۱؎ جامعہ کے کارکن جو عابد کنبہ سے بہت قریب ہیں

ایجوکیشن منسٹری میں تجویز کھٹائی میں پڑی رہی۔ بار بار لکھا۔ جو بات منظور ہو چکی اس کا آرڈر آنے میں دیر کیوں ہو رہی ہے؟ کچھ نہ پتا چلا۔ آخر کار ایک صاحب نے چپکے سے بتایا کہ شری مالی جو اس وقت اپنی خوش قسمتی اور ہر معقول آدمی کی بدنصیبی سے ایجوکیشن منسٹر بن گئے تھے، محض اس لیے ''ہیم کماری'' کے خلاف ہیں کہ وہ سیدین کی بہن کی کتاب ہے۔ سیدین سے جو انھیں حسد اور تعصب تھا اس کی کوئی حد نہ تھی (آج وہ پھر وائس چانسلر بنارس یونیورسٹی ہو کر سیدین کے قصیدے پڑھنے لگے ہیں) میں نے سوچا بھائی جان پر الزام رکھنے کا اُسے ایک اور بہانہ ملے گا۔ کتاب واپس منگالی۔ مگر مجھے بہت غصہ اور صدمہ تھا۔ سوچا کچھ ہو جائے کتاب چھپے گی ضرور۔ مگر کئی برس ننھی ننھی تصویروں کے لئے مکتبہ کے آرٹسٹ صاحب کے پاس پڑی رہی۔ ہار کر ان سے بھی منگالی اور کتابت شدہ کاپیاں ایک لفافے میں ڈال کر دراز میں رکھ دیں اور بھول بھی گئیں کہ اس کی کاپیاں کہاں ہیں۔ پچھلے دنوں صفائی وغیرہ کرنے کے سلسلے میں کاپیاں ملیں۔ پریس میں دکھوائیں انھوں نے بتایا کچھ زیادہ پیسے لیں گے مگر کتاب چھپ جائے گی۔ عبود زیدی سے ٹائٹل اور تصویریں بنوائیں۔ کئی مہینے پریس والوں نے ڈالے رکھا زبیری[۱] صاحب نے بہت دوڑ دھوپ کی۔ خدا خدا کر کے کل رات کتاب مکمل ہو کر آئی ہے۔ چھ سو کاپیاں چھپی ہیں۔ اب فروخت کا مرحلہ ہے۔ چالیس برس ادب کی خدمت کرنے اور پچیس کتابوں کی مصنفہ ہونے کے بعد بھی ہر کتاب پر فروخت کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے۔ نہ تاجرانہ صلاحیت، نہ خوشامد کی برداشت، نہ دوڑ دھوپ کی طاقت، نہ پروپیگنڈا کرانے اور خود کرنے کا شوق۔ پھر کتاب بکے تو کیسے اور کیوں؟ بہر حال مجھے خوشی ہے کہ 'ہیم کماری' چھپ گئی جو بڑی پیاری کتاب ہے اور شری مالی کے منہ پر ایک طمانچہ پڑ گیا۔ اگر چہ اُسے اس کا احساس بھی نہ ہوگا۔ تو کیا یہ صرف ادیب کی انا کی تسکین ہے۔

☆☆☆

1974

۲۷ مارچ

اس روزنامچہ کو چھوڑے لگ بھگ چار سال ہو گئے اس لیے کہ میں اپنے دل میں آخری سفر کی تیاری کر رہی تھی۔ مگر قسمت کا حال کون جان سکتا ہے کہ مستقبل کے پردے میں کیا کیا کامیابیاں، کیا کیا دُکھ، کیسی کیسی جدائیاں چھپی ہوتی ہیں۔ انسان ان سے کتنا ناواقف ہوتا ہے۔ اس چار سال میں میرے سب پیاروں نے مجھے چھوڑ دیا۔ چھوٹے بھائی جان کے صدمے نے پہلے ہی نیم جان کر دیا تھا۔ پھر یہ قیامت کے حادثے میں نے کیسے جھیلے؟ یہ طاقت کس نے دی؟ بس ایمان اور یقین نے سنبھالے رکھا۔

بھائی جان کا گھر بن گیا۔ وہ امریکہ سے آ کر اس میں بس گئے۔ میرے لیے زندگی میں مسرّت وطمانیت پیدا ہوگئی۔ دن میں نہ جانے کتنی بار ان کے گھر کے چکّر ہوتے، وہ بھی آتے رہتے۔ بلقیس اور بچے بھی مستقل آ گئے۔ بھائی جان سے تبادلۂ خیال ہوتا۔ اپنی ہر تخلیق ان کو دکھاتی۔ ان کی تعریف، ان کی تنقید، مشورے، ہدایتیں میرے لیے بیش بہا ہوتے۔ ان کی بیماری، پریشانی دُکھ دیتیں مگر ان کا قرب ہر حال میں زندگی کی بے بہا دولت تھا۔ ایک آس تھی کہ اب باقی زندگی ان کی قربت نصیب رہے گی۔ مگر 'اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'! ہماری پیاری صابرہ فخرِ خاندان، بے مثال صفات کی حامل ذہانت اور قابلیت میں لاجواب، محبت اور خلوص کا پیکر، جواں سال، جواں بخت صابرہ تو ایک سال پہلے قلب کی بیماری میں مبتلا ہوئی تھی۔ کس صبر، کس حوصلے

اور بہادری سے اس نے اس کو جھیلا۔ کس عزم کے ساتھ روس آپریشن کرانے گئی کہ یا اچھا ہونا ہے یا مر جانا ہے۔ بیچ کی منزل وہ برداشت کرنے پر تیار نہیں تھی۔ خدا نے اس کی تمنا پوری کی اور ۵/اگست ۱۹۶۹ء کو روس میں وہ آپریشن تھیٹر ہی میں ختم ہوگئی۔ اپنے پیروں سے چل کر یوں کوئی موت کی سمت جاتا ہے؟

یہ حادثہ سارے خاندان کے لیے روح فرسا تھا مگر باجی کے لیے جن کی وہ جان تھی، وہ دونوں ایک دوسرے پر قربان تھی۔ ایسی چاہنے والی سعادت مند بیٹی کی جدائی ایک سال دو مہینے انھوں نے اس روح فرسا صدمے کو سہا۔ ہر دن بلکہ ہر گھڑی یہ محسوس ہوتا تھا کہ ابھی ابھی یہ خبر ملی ہے۔ فالج زدہ جسم گھٹتا رہا، دماغ ہر سے اس کا دھیان کرتا رہا، آنکھیں برستی رہیں۔ آخر ۷/اکتوبر ۱۹۷۰ء کو چودہ مہینے کی شبِ فراق کٹ گئی۔ ان صدموں نے ہم دونوں بھائی بہنوں کو توڑ دیا تھا۔ بھائی جان کی طبیعت خراب تھی۔ میں اور عابد صاحب چھپ کر گئے۔ ایک دن خبر ان سے چھپائی۔ آخر ان کو بتانا پڑا۔ میں اگلے ہی دن واپس آگئی۔ اب علی گڑھ جانا اور رہنا باجی کے بعد بے معنی سا لگتا ہے۔ پھر بھائی جان کی فکر واپسی پر انھوں نے مجھے سینے لگا کر آنسوؤں کے دریا بہاتے کہا تھا ''تیرے سوا اب میرا کوئی نہیں۔'' پھر اگلے سوا سال ہلکے ہلکے ان کو ہارٹ کے حملے ہوتے رہے، علاج ہوتا رہا۔ وہ اپنی قوتِ ارادی سے ٹھیک ہو جاتے، کام شروع کر دیتے تھے۔ کانووکیشن ایڈریس، ریڈیو کی تقریریں اور مختلف کمیٹیوں کی میٹنگ میں شریک ہوتے رہے، سفر کرتے رہے۔ ۷۱/اکتوبر کو ہولی فیملی میں داخل ہوئے۔ شدید ہارٹ اٹیک تھا۔ بہت کوششیں کی گئیں مگر ہماری قسمت کا ستارہ تو ڈوب چکا تھا۔ ۱۹/ کی شام کو ۱۹۷۲ء میں دوست کا پیام آگیا۔ ان کا دکھ درد دور ہوگیا۔ اب میں کس سے کہوں کہ ''تیرے سوا میرا اور کوئی نہیں۔'' اب کون ہے چاہنے والا، میرے دکھ درد کو سمجھنے والا، ڈانٹنے اور سمجھانے والا۔ کلیجے سے لگا کر سارے دکھوں کو بھلا دینے والا۔ خدایا میں نے اس ہستی کی جدائی کو کیسے برداشت کیا۔ اتنے دنوں سے انھیں دیکھے بغیر زندہ ہوں۔ سال بھر کی سخت بیماری اور تکلیف، فالج اور کینسر کی بیماری سہہ کر بہن سیادت

بھی خدا کو پیاری ہو گئیں۔ ان کی سب نے خصوصاً اقبال اور صغرا نے جس طرح دن رات خدمت کی اس کی مثال اس زمانے میں مشکل سے ملتی ہے۔ ان کی خدمت اور محبت نے جیسے نئی نسل پر سے اٹھتا عقیدہ پھر سے قائم ہو گیا۔ ان کی آخری خدمت میں نے خود انجام دی۔

آپا شیریں بھی اس سال خدا کے یہاں پہنچ گئیں۔ وہ بھی دو سال فالج میں مبتلا رہیں۔ بڑی عبرت ناک حالت تھی۔ اس حالت میں بھی میری محبت میں دو ایک بار مجھ سے ملنے آئیں۔ خاندان کی محبت اور خلوص کا آخری تار بھی ٹوٹ گیا۔

اسی سال ہمارے قیصر[1] باجی کے داماد جنھوں نے باجی کی خدمت بیٹوں کی طرح کی جو شرافت، نیکی، انسانیت، محبت، خلوص، بے نفسی کا پیکر تھے، چھ ماہ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا رہ کر ۵؍فروری کو خدا کو پیارے ہو گئے۔ انھوں نے بہت دکھ اٹھائے۔ پہاڑ سا آدمی چھ ماہ میں بتاشے کی طرح بیٹھ گیا۔ یہ دکھ جسمانی بھی تھا اور دلی بھی تھا بعض وجوہ سے۔

ہاں چار سال میں میرے سارے پیارے میرا ساتھ چھوڑ گئے اور جو خدا کے فضل سے زندہ سلامت ہیں چھوٹے[2] کے بچے، باچھو، امّن، بھائی جان کی لڑکیاں وہ سب اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔

۳۰؍مارچ

۱۱؍مارچ ۷۴ء کو بنارس کے کاشی وِدّیا پیٹھ نے (جسے اسی سال یونیورسٹی بنایا گیا ہے) قوم کے پانچ منتخب خادموں کو ڈاکٹر آف لیٹرز کی ڈگری پیش کی، جس میں ڈاکٹر عابد حسین بھی تھے۔ ان کے علاوہ رام چندرن، کاکا کلیلکر وغیرہ کو بھی ڈگری دی گئی۔ بیماری سے اٹھنے اور کمزوری کے باوجود میں بھی ساتھ گئی تھی اور صغرا بھی۔ سفر خاصا تکلیف دہ تھا۔ جن لفظوں میں وہاں عابد کا تعارف کرایا گیا اس سے ان کی شخصیت، خدمات اور ادبی مقام پر خوبصورتی سے مختصر طور پر روشنی

[1] پروفیسر قیصر حسین زیدی
[2] اظہر عباس

ڈالی گئی تھی۔ ۷۲ء میں عابد صاحب کی سوسائٹی اسلام اینڈ دی موڈرن ایج کی طرف سے انٹرنیشنل سمینار منعقد ہوا جو بہت کامیاب رہا۔ بہت سے لوگ ملکوں ملکوں سے آئے۔ اچھی تقریریں ہوئیں۔ بہت متاثر ہوئے اور بہت خوش ہوئے۔ اس میں جس ذمہ داری اور محنت بلکہ جاں فشانی سے صغرا نے کام کیا کہ عابد صاحب تک کو اعتراف کرنا پڑا۔

دسمبر ۷۲ء میں بچارے مجیب صاحب پر فالج کا شدید حملہ ہوا۔ سر کا آپریشن ہوا۔ بچ تو گئے مگر کام کرنے کے قابل نہ رہے۔ پڑھنا لکھنا تقریباً بھول گئے۔ کیسی عبرت ناک حالت ہے۔ جس شخص نے پچاس برس سے زیادہ لکھا ہو اور پچاس کے لگ بھگ کتابیں تصنیف کی ہوں، وہ اب پانچ سات برس کے بچے کی طرح الف۔ ب۔ ت سے کچھ ہی آگے بڑھ پا رہا ہے۔ دوسری ساری مصروفیات بھی ختم ہو گئی ہیں۔ بچارے کو دن بھر گھر پر ہی رہنا پڑتا ہے۔ بھابی آصفہ اپنی بیماری بھول گئیں۔ دن رات ان کی خدمت اور دلداری میں لگی رہتی ہیں۔ افسوس میاں کی قربت اور پاس رہنے کی تمنا پوری ہوئی بھی تو کب اور کس حالت میں؟ دونوں کی حالت پر سخت تکلیف ہوتی ہے۔ جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے برائے نام چند ماہ وہ کام (اپنی ضد سے) کرتے رہے۔ سلامت اللہ ایکٹنگ وائس چانسلر کا کام سنبھالے رہے تھے اور انھوں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ وہی مستقبل میں وائس چانسلر ہو جائیں گے۔ گزشتہ پچیس سال میں ایک طرف جامعہ نے بظاہر ترقی کی لیکن اس کے اندر جو خرابیاں پیدا ہوئیں اور نا اہل لوگوں نے مجیب صاحب کو اپنے گھیرے میں لے کر ان کو استعمال کیا اور جامعہ کے مفاد کو پسِ پشت ڈال کر اپنے مفاد کے لیے جد و جہد کرتے رہے۔ اس نے جامعہ کو کھوکھلا سا کر دیا۔ اب ضرورت تھی کہ نیا وائس چانسلر ایسا ہو جو جامعہ کو سنبھال لے اور جو کچھ یہاں ہو رہا ہے اور ہوتا رہا ہے، اس کو سنوارنے کی غیر جانب دارانہ کوشش کرے۔ عابد صاحب نے (رائے تو میری بھی شامل تھی) مسعود حسین خاں کا نام سوچا۔ ان سے مل کر بات کی۔ چانسلر صاحب کو مشورہ دیا۔ مشکل سے مسعود صاحب اس کے لیے تیار ہوئے مگر ان کو جامعہ سے جو تعلق ہے کہ وہ ذاکر صاحب کے بھتیجے ہی نہیں جامعہ کے

طالب علم بھی رہ چکے ہیں۔ اس بنا پر بعض شرطوں کے ساتھ راضی ہو گئے۔

بہر حال چانسلر صاحب نے ایک پینل ملک کے تین اہم لوگوں کا مقرر کیا اور اس نے پہلا نام مسعود حسین خاں کا تجویز کیا اور مسعود صاحب جامعہ میں آگئے اور اب وہ بچارے سالہا سال کے بگڑے کام اور حالات سنوارنے میں لگے ہیں اور عابد صاحب سے روزانہ مدد اور مشورہ مانگتے ہیں۔ لوگ قصے جھگڑے چکانے کے لیے پھر ان کو پکڑنے لگے ہیں۔ عابد صاحب کا وقت بہت صرف ہو جاتا ہے۔ مگر جامعہ سے ان کو جو تعلق ہے اس کی وجہ سے اس میں خود کو پھر سے پھنسالیا ہے۔ دوسری طرف اردو بورڈ کے بہت سے کاموں میں الجھ گئے ہیں۔ کتنا وقت اس میں صرف ہوتا ہے۔ لوگوں نے بہت چاہا کہ وہ اردو بورڈ کے چیئرمین ہو جائیں مگر صاف انکار۔ عبدالعلیم صاحب کو جو علی گڑھ کی وائس چانسلری سے مستعفی ہو گئے ہیں، ڈھائی ہزار تنخواہ پر وہاں رکھوا دیا ہے۔ یہی تو ان کا کیرکٹر ہے۔

مجیب صاحب کی پنشن کے لیے بھی بہت کوشش کر رہے ہیں تا کہ ہزار روپے ماہوار ان کو جامعہ کے لیے جو قربانیاں اور خدمات ان کی ہیں، اس کے بدلے میں ملے کہ وہ بقید زندگی سکون سے گزار سکیں (اور خود آخری دم تک دن رات محنت کرنے اور کم سے کم معاوضہ لینے کا عزم ہے۔ خدا ان کے اس عزم کو ہمیشہ قائم رکھے۔) مجیب صاحب جو پہلے اپنے سبھی مخلص دوستوں سے لڑے اور رکے رہتے تھے اب سنا ہے کہ کہتے ہیں ہمارے بھائی صاحب (نام غریب کو اکثر یاد نہیں رہتا) کے کچھ قائل ہو گئے ہیں۔ خیر بھابی آصفہ تو ہمیشہ سے خلوص اور محبت کرتی تھیں۔ آج بھی کہتی ہیں مجھے سوا عابد صاحب اور زیدی صاحب کے کسی کے اوپر بھروسہ نہیں۔

ادھر سلامت اللہ[1] ہم لوگوں سے خفا ہیں۔ سلام دعا تک بند کر دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عابد صاحب نے (اور مفت میں یہ 'اعزاز' مجھے ہی بخشا جا رہا ہے) مسعود کو شیخ الجامعہ کرا کے ان کا 'حق' مارا ہے۔ سید ین میموریل سوسائٹی کے وہ سیکریٹری تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو کچھ کیا

[1] ڈاکٹر سلامت اللہ

اور جو انداز اختیار کیا اس کا ذکر نہ کرنا ہی بہتر ہے کہ سخت تکلیف ہوتی ہے۔

عابد صاحب کے دوسرے جگری دوست[1] کی صاحبزادی نے عابد صاحب کو جو خط لکھا وہ ان کے ظرف کی نشان دہی کرتا ہے اور عابد صاحب نے جس طرح اُسے برداشت کیا وہ عابد صاحب کے ظرف کی۔ مسعود حسین خاں ذاکر صاحب کے مکان میں (جامعہ ہزار روپیہ کرایہ دیتی ہے) آ کر رہے تھے کہ جب دوسرا انتظام ہو جائے گا تو وہاں چلے جائیں گے۔ ان کی خواہش تھی کہ سیدین صاحب کا مکان جامعہ کرائے پر لے کر ان کو دے دے۔ ذکیہ آئی ہوئی تھی۔ عابد صاحب نے اُن کو اس سے ملا دیا۔ دونوں میں بات چیت ہوگئی۔ طے پایا کہ وہ اس گھر کو جامعہ سے لینے کے لیے کہیں گے۔ موجودہ گھر پہلے ہی سے کسی دوسرے کام کے لیے جامعہ نے لے رکھا تھا۔

لیکن پچھلے مہینے سعیدہ خانم نے عابد صاحب کو ''اماں'' کی طرف سے لکھا کہ انھیں بہت صدمہ ہے کہ ذاکر صاحب کے وہ ساتھی جن کو ان کی دوستی کا دعویٰ تھا اور اب بھی ہے یہ سب کر رہے ہیں اور اصرار کر کے مسعود کو سیدین صاحب کا گھر دلا رہے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ خیر عابد صاحب تو فرشتہ ہیں مگر میں نہیں۔ اس سے پہلے ہر ہر طرح سے ان لوگوں نے میری انسلٹ کی کوشش کی (وہ بچارے میری کیا انسلٹ کر سکتے ہیں!!) مگر عابد صاحب کے ساتھ تمیز داری کا یہ مظاہرہ! کم سے کم میں برداشت نہیں کر سکتی) مسعود صاحب سے میں نے کہہ دیا کہ یہ گھر اب کسی قیمت پر اس خاندان کے کسی فرد کو انشاء اللہ نہیں ملے گا۔ خواہ بے کرایہ کے بھی پڑا رہے۔ سیدین صاحب کی لڑکیاں خدا کے فضل سے فاقے نہیں کریں گی۔ چنانچہ وہ ابھی تک نہیں اٹھا ہے۔ لیکن دیر سویر اٹھ جائے گا۔ ایک سیٹھ نے اُسے تیرہ سو پر لے بھی رکھا تھا۔ ذکیہ نے اسی بنا پر کہ 'کالے روپیہ' کا کرایہ ہمیں نہیں چاہیے اُسے کسی نہ کسی طرح سیٹھ سے خالی کرا لیا۔ خدا کا شکر ہے کہ پیسہ کا ان کو اتنا لالچ نہیں!

اسی سال جنوری میں میری دو سال کی کوشش اور محنت کے بعد میرے پیارے بھائی جان کی

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین

آرام گاہ تیار ہوگئی۔ نقشہ رحمان صاحب نے بڑی محنت سے بنایا اور انھوں نے ہی ٹھیکیداروں کو سمجھا کر ٹھیکہ دیا کہ بہترین کام ہو۔ ساڑھے ۹ ہزار میں مزار تیار ہوا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ پوری دلّی میں اس سے خوبصورت نفیس تربت نہیں۔ ذکیہ آئی تو روپیہ اس نے ادا کر دیا۔ کرایہ وغیرہ کی رقم سے! بس اب بھائی جان کی کتاب چھپ جائے تو ان کے جو دو کام میں نے اپنی زندگی میں کرنے کا عزم کیا تھا وہ پورے ہو جائیں گے۔ ان کی جدائی کو سہارنے کا میرے پاس اور کیا ذریعہ ہے سوا اس کے کہ ان کے کسی کام میں لگے رہوں یا ان کاموں میں جو انھیں پیارے تھے۔

۱۴ر مئی

آج میں نے اپنا وصیت نامہ مکمل کر لیا۔ نہیں جانتی کہ قانونی حیثیت اس کی کچھ ہوگی یا نہیں لیکن اخلاقی طور پر ضرور میرے بچّے اس کی پابندی کریں گے۔ چاہتی تو یہ ہوں کہ یہ سب اپنی زندگی میں خود ہی دے جاؤں مگر ذرا سا خوف آڑے آتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ پھر بالکل خالی ہاتھ رہ جاؤں اور میری یا عابد صاحب کی بیماری یا مجبوری یا آمدنی بند ہو جانے کی صورت میں محتاجگی خدا نخواستہ دامن گیر۔ کلام الٰہی میں آیا ہے تم خیرات کرو۔ لوگوں کو جتنا دے سکتے ہو دو، مگر اتنا نہیں کہ خود بالکل محتاج ہو جاؤ۔ بہر حال میں خود دوں یا میرے بعد ملے، ملنا انھیں لوگوں کو چاہیے۔ سوچتی ہوں اس پر عابد صاحب کے علاوہ ایک کسی اور ذمہ دار آدمی کے دستخط کرا لوں، مگر وہ کون ہو؟ زیدی صاحب خود بوڑھے اور بیمار ہیں۔ جامعہ والوں میں سے کسی سے کرانا نہیں چاہتی کہ خواہ مخواہ ابھی سے چرچے شروع ہو جائیں گے۔ کوئی بالکل غیر متعلق آدمی ہونا چاہیے[1]۔

☆☆☆

[1] نوٹ: ان کی وصیت پر ان کے بچوں نے تو عمل کیا مگر جامعہ نے مقدمہ قائم کر کے ان کو ستا رکھا ہے۔ لیز کی مدت ختم ہونے سے پہلے اس گھر کو لینے پر اصرار ہے۔ جنھیں وہ اپنے بچے کہتی تھیں جو جامعہ میں پلے بڑھے وہ غیر ٹھہرے۔ جامعہ کا کہنا ہے کہ ہم نے ان کے انتقال کے بعد گھر پر قبضہ کر لیا ہے۔ ' کے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں' مگر وکیل بھی کر رہے ہیں منصفی بھی چاہ رہے ہیں۔

1975

۲۹ مئی

ایک سال اور بیت گیا زندگی کی گاڑی دھکیلتے ہوئے۔ زندگی کے اور بہت سے تلخ و شیریں تجربے اس سال میں ہوئے۔

رعنا کی شادی ہوگئی۔ خدا کا شکر ہے کامیاب شادی۔ ہم لوگوں نے اپنی حیثیت کے مطابق (ظاہر ہے بڑا حصہ میرن صاحب وانیس کا تھا) اُسے جہیز وغیرہ دیا۔ اس کا شوہر صغیر بہت پڑھا لکھا نہیں، مالدار نہیں مگر شریف گھرانے کا شریف لڑکا ہے۔ بیوی کو بہت چاہتا اور خیال رکھتا ہے۔ سسرال والوں سے محبت کرتا اور عزت کرتا ہے۔ دونوں کی آمدنی مل کر خوبی سے گزر ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے خاندان کی مدد کرتا ہے۔ رعنا بھی تھوڑی بہت مدد کرتی رہتی ہے۔

☆☆☆

1980

۲۱راگست

آج میں نے اپنی خودنوشت 'سلسلۂ روز و شب' مکمل کر لی۔ الحمدللہ۔ یہ کام جس کے پورا ہونے کی بہت کم امید تھی، جس کی راہ میں ہر رکاوٹ آئی جو آسکتی تھی۔ پندرہ سولہ برس یا شاید بیس برس پہلے اس کو میں نے لکھنا شروع کیا تھا۔ عابد صاحب کہا کرتے تھے کہ سوانح عمری تو آخری عمر میں لکھی جاتی ہے۔ میں جواب دیتی کہ میری عمر کا اور کسی کی بھی عمر کا کیا بھروسہ......؟ لیکن دو چار باب لکھ کر پھر برسوں پڑی رہی۔ پھر کبھی وقت مل گیا تو دس بیس صفحات لکھ لیے، پھر مہینوں سالوں ہاتھ نہ لگایا۔ اس طرح شاید چار سو کے قریب صفحات لکھے گئے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ ابھی تو کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔

پھر مجھ پر قیامتیں ٹوٹتی رہیں۔ بھائی جان دسمبر ۷۲ء میں سدھار گئے تو دین و دنیا تارک تھی۔ ہوش آیا تو ان کے کام کو پورا کرنے میں لگ گئی۔ کبھی کبھار کوئی کہانی کوئی تقریر کوئی مضمون ہو جاتا مگر سوانح عمری جیسی کی تیسی پڑی رہی۔

مگر ان کی نامکمل سوانح حیات کام کرتے وقت مجھے شدت سے یہ احساس تھا کہ میرے خاندان میں کسی کی خودنوشت سوانح مکمل نہیں ہوتی۔ ابا جی کی کاپی پر بس ابتدائی حالات، چچا ابا کی نوٹ بک پر حالی ابا میاں اور چند دوسرے خاندانی حالات اور بس۔ اور اب بھائی جان کے چالیس سال تک کے حالات لکھنے اور پھر فرصت کا انتظار کرتے رہے مگر ان کو ذرا فرصت نہیں۔

جس کے سامنے اتنے بہت سے کام ہوں اسے فرصت کہاں؟ پھر سوانح حیات کا کچھ شروع کیا۔ مگر ۸۴ء سے عابد صاحب کی بیماری، جو شدید سے شدید تر ہوتی گئی اس نے پھر اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ ہاں دوسرے ایسے کام تو کرتی رہی جن سے کچھ روپے ملیں اور خرچ پورا ہو مگر یہ تو مجھے ہی کرنا تھا۔

عابد صاحب نے بھی اُسی زمانے سے اپنی خودنوشت لکھنی شروع کی تھی جب میں نے۔ مگر ان کی بے پناہ مصروفیت، پھر ایسے کام کرنا جس سے آمدنی ہو اور پیٹ بھرے، خرچ چلے۔ کہتے کبھی فراغت ملی تو خودنوشت مکمل کرسکوں گا۔ 'آزادی کی زنجیریں' (ادھورا ناول) کے لیے بھی یہی کہا کرتے تھے۔ مگر فرصت اور انھیں فراغت اسی کے حصے ہیں۔ پھر جب دس گیارہ سال پہلے اسلام اینڈ دی موڈرن ایج سوسائٹی کا کام شروع کیا تو دو سالوں کی واردات، کتابوں کی اشاعت، نظر ثانی، پورے دفتر کا کام، چار آدمی مل کر وہ کام نہ کر سکتے وہ عابد صاحب کر رہے تھے۔ ایسے میں خودنوشت لکھنے کا وقت ملنے کا کیا سوال تھا۔ دوڈھائی سال تو بیماری میں بھی اتنا ہی کام ہوتا رہا۔ جب جب کمزوری بڑھتی اور بیماری تو کام میں کمی ہوئی مگر اب بھی دوسروں سے زیادہ کرتے تھے۔ کئی بار میں نے کہا آپ بولتے جائیے میں یا صغرا یا کوئی اور لکھتا جائے گا۔ اور بعض لوگوں کا اصرار بھی تھا کہ یہ سوانح بے مثال چیز ہوگی۔ مگر اس طرح بول کر وہ نہ لکھوا سکتے تھے اور اس طرح ان کی خودنوشت بھی نامکمل رہ گئی اور میرا یہ احساس شدت پکڑ گیا کہ خودنوشت لکھنا ہمارے گھرانے کو سازگار نہیں۔ پھر احمد عباس کی خودنوشت انگریزی میں آئی تو میں نے اپنا یہ وہم دور کرنے کی کوشش کی اور وہموں پر انسان کا بس کیا ہے۔

پھر ۱۳ دسمبر ۷۸ء کو عابد صاحب مجھے چھوڑ گئے اور دل اور دماغ کی قوتیں اور کچھ کرنے کی امنگ اس وقت تو یہ معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ ہی چلی گئی۔ مگر پھر رفتہ رفتہ، دھیرے دھیرے کچھ خدا اور رسول کے سہارے، کچھ صغرا کی خاطر اور سب سے زیادہ خود اپنے کرب و درد کو بٹانے کے لیے پھر میں نے قلم کا سہارا پکڑا۔ یوں تو اس دوران عابد صاحب پر کئی مضمون لکھے۔ کچھ

ادھورے، بے ربط، کچھ اچھے، ایک عابد حسین سمینار کے لیے، ایک 'آج کل' کے عابد نمبر کے لیے ان کی شاعری پر۔ کچھ کہانیاں بھی لکھیں، مگر میں نے عزم کرلیا اور خدا سے دعا کی کہ وہ میری صحت اس قابل کردے کہ میں اپنی خودنوشت پوری کرسکوں اور گزشتہ ایک سال سے میں اسی میں لگ گئی۔

اب تک وہ کچھ اور نئے انداز سے چل رہی تھی۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ میری زندگی کے مسلسل واقعات سے اول تو دوسروں کو کیا دلچسپی اور دوسرے وہ تو کبھی ختم نہ ہوں گے۔ گزشتہ لکھی بیس پچیس نامکمل ڈائریوں کا سہارا لیا تو وہ اور الجھ گیا۔ پھر میں نے یہ طے کیا کہ اپنی شادی کے بعد کے چند سال کے واقعات کے بعد اب میں موضوعات مقرر کر کے لکھوں گی۔ اس انداز میں دوسری سوانح عمریوں سے مختلف ہوگا۔ نہ اتنا پرانا کہ ''نا قابلِ فراموش'' ہو جائے (یہ اپنی جگہ پر بہت دلچسپ کتاب ہے) نہ اتنا نیا کہ سارے جہاں سے دور دراز بن جائے، نہ اتنا ذاتی اور بے حجابانہ کہ کاغذی پیرہن کا پیرہن اوڑھ یا پہن لے۔ یہ تو سب کا اپنا اپنا مزاج، انداز، صلاحیت، قابلیت اور اپنی زندگی کی تصویر کشی ہے۔ نہ مجھے یہ حق ہے کہ میں کسی پر اعتراض کروں نہ دوسروں کو یہ حق ہے کہ میری سوانح کو ''بیرونی طرز'' کا کہیں۔

ہاں ایک بات میں نے ہمیشہ سے محسوس کی ہے۔ بات کو جتنے سیدھے سادے، رواں اور دل میں اتر جانے والے انداز میں بیان کیا جائے، اتنا ہی اچھا ہے۔ مولانا آزاد نے ایک جگہ لکھا ہے سیدھی سچی بات میں پیچ وخم نہیں ہوتا، الجھن اور پیچیدگیاں نہیں ہوتیں۔ اگر چہ انھوں نے کسی اور سلسلے میں لکھا ہے لیکن غیر شعوری اور شعوری دونوں حیثیت سے میرا مزاج بات کو اسی طرح کہنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔ گزشتہ کئی ہفتے سے یہ پرانے خط دیکھ رہی تھی یعنی عابد صاحب کے نام مشاہیر کے خط جو آتے تھے اس میں سے جو باقی ہیں ان کو مرتب کرنے کے ارادے سے۔ ان میں اکثر خط میرے نام کے ملے یا میرے بارے میں ان کو لکھے ہوئے اور تقریباً سبھی نے میرے اندازِ بیان، زبان وغیرہ کو بہت سراہا ہے۔ بے حد تعریف کی ہے۔ اسی سے مجھے یہ احساس ہوا کہ

میرا یہ خیال غلط نہ تھا کہ جو بات جیسی ہو اور جس طرح کہنے کو جی چاہے یوں ہی کہنا چاہیے۔ بے ساختہ بات دور آمد کی بات ہی اور ہوتی ہے۔

اپنی اس کتاب میں میں نے یوں ہی قلم برداشتہ لکھا ہے۔ مگر حتی المقدور یوں تو انسان میں خطا و نسیان کا پُتلا ہے اور پھر اپنی خامیاں خرابیاں کسی کو پوری طرح نظر آتی ہیں۔ پوری سچائی، دیانت داری کے ساتھ واقعات بیان کیے ہیں یا جن شخصیات وغیرہ پر لکھا ہے ان پر اپنی بے لاگ اور حقیقی رائے دی ہے۔ یا کمزوریوں اور خرابیوں کی کھوج زیادہ نہیں کی۔ بعض جگہ ناروا کو حذف کر دیا ہے بعض تکلیف دہ واقعات کو بیان نہیں کیا، جس سے دوسروں کا پردہ فاش ہوتا ہو۔ موضوعات میں مجھے بات کو سمجھنے میں آسانی ہوگئی، مثلاً دوسروں کی بیماریوں اور تیمارداریوں کا مختصر تذکرہ ایک باب میں۔ اپنے خاندانی تعلقات اور واقعات کو ''میرا گھرانا، میرے بچے'' یا ''معجزہ'' یا پھر ''پنچتنی گروہ'' یا ''میرا ساتھی میرا دوست'' اور ''خلش نامہ'' بابوں میں بیان کیا ہے۔ پھر ایک باب ہے ''آ میرے دوست''[1] ایک باب ہے ''میرے محترم بزرگ'' ایک ''شوق'' اور پھر ایک ہے ''میرے ملازم''۔ اس کے بعد میں نے اپنے فن پر نظر ڈالی۔ ''کتابیں، میری زندگی''، ''ذوق خامہ فرسا'' اس کے بعد خود ''اپنا محاسبہ'' اور ''قدردانی اور ناقدری'' اور آخری بات جو سال بھر پہلے ہی لکھ لیا ہے ''پیا باج پیالہ پیا جائے نا۔''

یہ ایک ہزار صفحے کی کتاب پہلے میں نے مکمل کی اور پھر گزشتہ چھ مہینے میں اس کو نظر ثانی اور نقل کیا اور اسی دوران بہت کم لکھنے کا کوئی اور کام کیا۔ بیماری اور پریشانی اور مہمان داری اور سیکڑوں رکاوٹوں کے باوجود میں اسی میں لگی رہی۔ میری لگن یہ تھی اور دعا بھی یہ تھی کہ میں اسے مکمل کرسکوں۔ خدا نے میری دعا سن لی اور آج میں نے اپنی یہ سب سے ضخیم کتاب جو میری ساری زندگی کا نچوڑ ہے، مکمل کرلی۔ خدا کا شکر و احسان ہے کہ دل کے سخت مرض کے بعد اسی سال پھر مجھ میں اسی نے یہ حوصلہ، یہ لگن، یہ محنت اور کوشش کی طاقت بخشی کہ میں ہر حال میں اسے لکھتی

---

[1] جب ان کی سوانح شائع ہوئی تو یہ باب نکال دیا۔

رہوں۔ ذاکر صاحب نے کہا تھا "کھٹ کھٹ کیے جاؤ، کچھ نہ کچھ ہو جائے گا"۔ کسی اور نے کہا ہے "بوند بوند سمندر ہو جاتا ہے"۔ مسلسل کام نہ کرتی اور ذرا فرصت اور تندرستی اور سکون کے انتظار میں رہتی تو ناممکن کہ یہ پوری ہو سکتی کہ یہ تینوں خدا نے میری قسمت میں نہیں لکھیں۔ ہاں دلِ بے قابو اور شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ دے کر ان کی تلافی کر دی ہے۔

شاہد علی خان[۱] نے چند شرائط پر یہ کتاب مجھ سے کتابت کے لیے لے لی ہے۔ اب جب بھی چھپے میرا اصل کام تو تمام ہوا۔

میری خواہش ہے کہ اس میں میرے چند عزیزوں، چند دوستوں، چند بچوں وغیرہ کی تصویریں بھی ہوں، اس کے لیے مجھے خود خرچ کرنا پڑے گا۔ میں نے اس کا وعدہ کر لیا ہے۔ خدا کا شکر ہے۔

۳ر ستمبر

گزشتہ ایک ہفتے میں دو افسانے نظرِ ثانی کر کے مکمل کیے۔ ایک مضمون ڈاکٹر انصاری پر لکھا اور آج مضمون غلام الحسنین پر مکمل کیا۔ تعمیر ہریانہ کو بھیجنا ہے۔ چاند بی بی پر ایک مضمون پونا کے نصابی کتاب کے لیے شبیر احمد انصاری کے اصرار پر لکھ کر، صاف کر کے بھیج دیا۔ ۵ کو ایک کہانی 'دلدل' لکھی۔

۱۸ر ستمبر

ادھوری تصویر نقل اور نظرِ ثانی، 'دلدل' آج مکمل صاف کر کے بھیجی۔

طبیعت خراب ہو گئی۔ ۱۶ کو عاصمہ[۲] کو دکھایا۔ کل ۱۷ کو ڈاکٹر ماتھر کو انجائنا کا ہلکا حملہ تھا۔ چار دن کا ریسٹ بتایا ہے۔ دوائیاں وہی پرانی۔ ریسٹ نہ میری قسمت میں ہے، نہ دل کو قرار آتا

---

۱ مکتبہ جامعہ کے مینجنگ ڈائرکٹر ۲ ڈاکٹر عاصمہ حسین: جامعہ کی ڈاکٹر

ہے۔ سواری کی قلت نے بالکل مجبور کردیا ہے۔ لکھنے کا کام تھوڑا تھوڑا۔ پرسوں سے بادل[1] صاحب کو رکھا ہے وہ روزرات کو آکر خط نقل کررہے ہیں۔

۲۴ر ستمبر

ہندستان ٹائمز کے ایک مضمون انٹرمیرج پڑھ کر ایک خط ہندستان ٹائمز میں بھیجنے کے لیے لکھا۔ آصف وغیرہ اس کا ترجمہ کر کے بھیجیں گے۔

ایک مضمون اس موضوع پر اردو میں لکھ رہی ہوں، اردو اخباروں کے لیے۔

''ادھوری تصویر'' صاف کر کے اشاعت کے لیے مکمل۔

''انٹرمیرج اور انٹرگریشن'' ایک مضمون لکھ کر قومی آواز کو برائے اشاعت ارسال کیا۔

۲۶ر ستمبر

''اچھوتی''[2] صاف کرلی۔ اشاعت کے لیے مکمل۔

۲۹ر ستمبر

۲۷، ۲۸، ۲۹ شمیم[3] صاحب کی بہن کی شادی کا ہنگامہ رہا۔ میں بھی تھک گئی خواہ مخواہ۔

۲۷ کو رضا، صغرا کے اصرار سے بلکہ مجبور کرنے سے جا کر 'سیاں بھئے کوتوال' ایک ڈرامہ دیکھا۔ علاوہ اس کے کہ سخت تھکن ہوگئی۔ بیٹھنے کے لیے زمین پر گدے پڑے تھے۔ بیس تیس روپے خرچ ہوئے اور نہایت مہمل اور بکواس ڈراما دیکھنے کو ملا۔ یہی نیشنل اسکول آف ڈراما کتنے عمدہ ڈرامے کرتا تھا۔ تین یا چار مرتبہ میں اور عابد صاحب دیکھ کر آئے اور خوش ہوئے۔ اب تو کرنے والوں کا، دیکھنے والوں کا، سیکھنے والوں کا ذوق اتنی گر گیا ہے کہ جس کو جھیلنا کرب ناک

---

[1] بادل عباسی جامعہ کے ریسرچ اسکالر [2] کہانی کا عنوان ہے [3] شمیم حنفی

ہے۔اس سے تو ٹی وی کے ڈرامے غنیمت ہوتے ہیں۔

۳۰/ستمبر

آج میرا دل بہت اداس ہے۔زندگی کبھی اتنی بوجھ نہ لگتی تھی۔عابد صاحب......آپ کے بغیر ذہنی، دلی، جذباتی ہر قسم کا جو خلا ہے وہ تو پُر نہیں ہو سکتا نہ ہوگا۔ہاں ایک آپ کی یاد ہے جو مجھے کسی طرح سنبھالے ہوئے ہے۔

☆☆☆

1984

۵/جنوری

آج صغرا کو ڈاکٹر ماتھر کو دکھایا۔انھوں نے بہت اطمینان دلایا مگر دوائیں کافی دی ہیں۔ پندرہ دن میں بلایا ہے۔

مجھے دیکھا۔ بلڈ پریشر بہت ہائی نکلا۔پیچش کے لیے دواؤں کا کورس دیا ہے۔آج سے دوا شروع کی ہے۔

آج رضا حبیب میرا بھتیجہ ملنے آیا۔ وہ پاکستان سے آیا ہوا ہے اور آج ہی واپس جا رہا ہے۔ پاکستان میں گئی تھی تو وہ ہم سب سے خفا تھا، مگر آج بہت ہی محبت سے ملا۔اس کو دیکھ کر بھائی حبیب[1] اور کبرا[2] کی یاد بہت آئی۔ دونوں ماں باپ سے بیک وقت بہت ملتا ہے۔اس نے اب تک شادی نہیں کی۔اس کی پسند کی لڑکی سے ننہال والوں نے ہونے نہیں دی اور اب وہ ضد میں کسی اور سے نہیں کرتا۔

آج بھی شمیمہ[3] کا پتہ نہ چلا۔اس کی ماں کہتی ہے کہ اُسے یہ بیماری ہے کہ وہ غائب ہوجاتی ہے۔ پھر آجاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ایسا تھا تو اُسے بتانا چاہیے تھا۔

۶/جنوری

اکبر حیدری کے خط کا جواب دیا کہ میں ان کو رجسٹری بھیج چکی ہوں۔کل سعید[4] صاحب کو

[1] خواجہ حبیب علی [2] مسز حبیب علی [3] گھر کی ملازمہ [4] جامعہ کے اہم کارکن سعید انصاری

دیکھنے گئی تھی۔ ان کی حالت اچھی نہیں ہے، خدا رحم کرے۔

آج احمد سعید[1] ملنے کے لیے آیا۔ بڑی دیر تک بیٹھا۔ بیچارا امریکہ سے باپ کو دیکھنے دوڑا آیا ہے۔ تین مہینے پہلے بھی آچکا تھا۔ اس وقت وہ بالکل ٹھیک تھے۔ شام کو شکیل اختر[2] ملنے کے لیے آیا۔ بہت عرصے بعد، بہت محبت سے ملا۔ اس کو پچھلے دنوں ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا۔ اب ٹھیک ہے۔ خدا اسے اچھا رکھے۔ انور عباس نے کل صغرا کو پکنک (قطب مینار) پر لے جانے کی دعوت کی ہے۔ مجھ سے بھی کہلوایا ہے مگر میں بلڈ پریشر، سردی اور زیادہ چلنے کی وجہ سے نہیں جانا چاہتی ہوں۔ صغرا آج دوپہر پھر دیر میں آئیں الجھی ہوئی، خفا۔ خیر تھوڑی دیر میں ٹھیک ہوگئیں۔ خدا اس کے نروس مزاج اور صحت کو درست کرے۔ میری زندگی میں اب خوشیاں کہاں۔ جو بھی ہیں وہ اسی کے دم سے ہیں۔

۷ر جنوری

عذرا رضا کو خط لکھا۔ شمع کے ساتھ خط اور ٹیپ بھیجوں گی۔ وہ اسے امریکہ بھیج دے گی۔

سفرنامہ کا ایک باب۔

صغرا انور کے ساتھ پکنک پر گئی۔ واپسی پر انور نادی اور صبوحی بھی آئے۔

آج کمر میں درد رہا۔

قیصر زیدی ملنے آئے۔

۸ر جنوری

اقبال کو خط لکھا۔

آج ذاکر صاحب کے نواسے (سعیدہ و خورشید کے بیٹے) کی شادی کا ایٹ ہوم ہے۔ کل

---

[1] سعید انصاری صاحب کا بڑا بیٹا [2] اختر حسن فاروقی کے بیٹے شکیل اختر

پہلے چرچ میں شادی ہوئی کہ اس لڑکے کی دوست عیسائی ہے۔ پھر سنا شام کو نکاح ہوا۔ ساری انٹرگیشن کا ٹھیکہ اسی خاندان نے لے رکھا ہے۔ صغرا کو شرکت کے لیے بھیجا۔ بچاری کو وہاں اور واپسی میں بہت پریشانی ہوئی۔ مسز گاندھی آئی ہوئی تھیں اور گیانی جی آنے والے تھے۔ آج اقبال (رزاق صاحب کے بھانجے) کے بیٹے کی شادی ہے اس میں صغرا ہی جائے گی۔

۹ر جنوری

سردی بہت سخت ہے۔ ہلکا ہلکا بادل اور لہر ہے۔

آج میں نے سفرنامہ ختم کرلیا۔ ابھی کتاب کا نام نہیں طے کر پائی۔

آج پھر دو عورتیں ٹریننگ کالج سے تشریف لائیں کہ سنا ہے آپ کی بڑی جائیداد ہے۔ ایک گھر ہمیں کرایہ پر دے دیجیے۔ ہمارے ہاں کہا جاتا تھا کرموں کھائے کوئی بھرموں۔ وہ میری حالت ہے۔ عرض کیا اس پرانے گھر کے سوا دنیا میں کوئی جائیداد نہیں۔ بھائی جان کے گھر کے حوالے دیے۔ بمشکل سمجھایا کہ دو کرایہ پر ہیں اور عنقریب خود گھر والیاں یہاں آنے والی ہیں۔ کون لوگ ہیں جو آئے دن لوگوں کو میرے اور صغرا کے پاس بھیج دیتے ہیں۔

۱۰ر جنوری

آج کئی خط لکھے۔

آج شام شمع[1] علی گڑھ سے آئی۔ اس کی حالت اب تک نہیں سنبھلی ہے۔ صورت نہیں دیکھی جاتی۔ بہن کا صدمہ، اتنی جوان موت، ایسا سخت شاک اور پردیس میں اچانک خبر۔ اور اب تین مہینے بعد ماں باپ کو چھوڑ کر مانٹریال جارہی ہے۔ کیسے نہ جائے۔ بہت سمجھاتی رہی میں کہ اب گھر سنبھالو، کام میں جی لگاؤ۔ میاں کا خیال کرو اور کوشش کرو کہ کورس ختم کرنے کے

---

[1] شمع نقوی سیدہ فرحت اور قیصر نقوی، کی بڑی بیٹی، چھوٹی بیٹی انجم نقوی کے انتقال پر آئی تھیں۔

بعد واپس ہندستان آجاؤ۔ اس کے خاندان کے لوگ ملنے آتے رہے اور کئی دنوں اُسے اور زیادہ رُلاتے رہے۔ رات کو شبو کے ہاں چلی گئی۔ صبح پانچ بجے پالم چلی جائے گی۔ دونوں بھائی عارف اور آصف ساتھ ہیں۔ رعنا اس سے ملنے آئی تھی۔ مجھ کو اقبال نے بلایا ہے۔ میں صغرا کو اصرار کر کے بھیجنا چاہتی ہوں۔

۱۳ر جنوری

بھائی جان کی کتاب کو دیکھا۔ اس حالت میں چھپنے کے بالکل قابل نہیں ہے۔ نارنگ سے بات کی۔ انھیں برا تو لگا کہ جن صاحب نے اسے مرتب کیا ہے یعنی فرحت حسین وہ ان کے ساختہ پرداختہ ہیں، مگر میں نے صاف کہہ دیا کہ اس کی دوبارہ ریڈنگ وغیرہ ہونی ضروری ہے۔

شاہد علی خان سے صغرا نے بات کی۔ وہ میری سوانح حیات موجودہ صورت میں چھاپنے پر تیار نہیں کہ اس پر بیس ہزار روپیہ خرچ ہوگا۔ اگر میں دے دوں تو......؟ میں کہاں سے دوں؟

بہر حال میں اب اسے دیکھوں گی اور کسی طرح کچھ حصے الگ کروں گی۔ اگر چہ ان کو الگ کرنا ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جسم کے کچھ حصے خدانہ خواستہ الگ کرنے ہوں۔

۱۴ر جنوری

کل سلسلہ روز و شب کا بہت سا "سلسلہ" الگ کیا۔ پانچ چھے باب نکالے جس سے ڈیڑھ سو کے قریب صفحات کم ہوگئے۔ اگر چہ اس سے جو میں لکھنا چاہتی تھی اور لکھا اس میں بہت فرق پڑ جائے گا، مگر بیس ہزار روپے۔ اور کئی برس ہیں کس کے پاس؟ اب بھی دیکھیں چھپے گی یا نہیں۔

کل شام اعزاز الدین[1] صاحب کی لڑکی بانو ملنے آئی۔ بہت محبت اور خلوص کی لڑکی ہے۔ باپ ہی کی طرح وہ دو برس سے مفلوج اور بیمار ہیں۔ باپ کی ایسی خدمت خود کر رہی ہے اور

[1] عابد صاحب کے دیرینہ دوست

اپنے بچوں سے کرا رہی ہے کہ کئی زمینیں مل کر نہ کرسکیں۔ چار چار بیٹے ہیں۔ ایک تو دلی ہی میں ہے، دو پاکستان میں اور ایک باہر۔ کسی کو آنے، ملنے، خدمت کرنے کی توفیق نہیں۔ جو کچھ کررہی ہے یہی اور اس کا میاں خدا انھیں اجر دے گا۔ اب بھی اگر چہ اکثریت ایسی ہی اولاد کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرن، اعزاز صاحب اور عابد صاحب کے بچے جیسے لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں اور مجیب صاحب کا بیٹا اور بہو بھی۔

۱۵ جنوری

آج کئی گھنٹے میں نے اور صغرا نے سلسلہ روز و شب کا پوسٹ مارٹم اور قطع و برید کی۔ ڈیڑھ سو سے زیادہ صفحے پہلے نکل چکے تھے۔ اب 178 صفحات اور نکالے۔ اسی طرح اب وہ سوا چار سو صفحے کی ہو جائے گی۔ جو میں کہنا چاہتی تھی، جو زندگی دِکھانا چاہتی تھی یعنی اپنی جیسی بھی ہے ویسی ہی، اس میں سے آدھے کے قریب نکل گیا تو کتنا کم رہ گیا۔ ادھوری تصویر۔ لیکن شاہد علی خاں کی ضد صغرا کا اصرار کہ کتاب کسی طرح بھی سہی، چھپ جائے۔ اب میں کمزور ہوگئی ہوں۔ دوسروں کے سامنے ہتھیار ڈال رہی ہوں۔ یہ کیا بات ہے؟ ورنہ اب بھی چھپ جائے تب کی بات ہے۔

ناول کو کل ہی نقل کیا مگر یہ سوچ کر دل بیٹھ جاتا ہے کہ کون چھاپے گا؟ رات ساڑھے گیارہ بجے عذرا رضا کا فون آیا۔

۱۶ جنوری

خلیق انجم بہت اصرار سے کہہ گئے تھے کہ پیرکوان کے گھر مالک رام کی دعوت ہے۔ آپ اور صغرا ضرور آیئے گا۔ زیدی صاحب[1] کے ساتھ وہ بھی آئیں گے۔ میں کہیں آتی جاتی نہیں مگر

[1] کرنل بشیر حسین زیدی

چونکہ سواری مل رہی تھی اور مالک رام کا بھی خیال تھا۔ جانے کا ارادہ کرلیا۔ مگر ابتدا ہی غلط ہوئی۔ زیدی صاحب پون گھنٹے کے انتظار کے بعد آئے۔ فون خراب تھا۔ پہلے سے معلوم نہ ہوسکا۔ ان کی گاڑی میں دو اور لوگ پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹھس ٹھسا کر بیٹھے۔ زیدی صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ مروّت میں چلے آئے، اسی کا قلق ہوا۔ کافی دیر بعد دریا گنج کے پیچھے گاڑی رکی۔ معلوم ہوا آگے پیدل جانا ہے۔ چار گلیاں پار کیں۔ گندگی اور رکشا وغیرہ کی ٹریفک سے چلنا دشوار۔ جیسے تیسے وہاں پہنچے۔ پرانے گھر کو کچھ نیا بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ صحن بہت چھوٹا سا، مہمان خاصے، انور سجاد بھی موجود۔ ہاروں اور تصویروں کا کاروبار گرم۔ عجب بچکانی حرکات۔ نوجوان پروانے انور سجاد کے گرد تھے اور بوڑھے پروانے مالک رام کے ساتھ تصویریں کھنچوا رہے تھے۔ ایک دوسرے سے تعارف کون کراتا۔ نثار احمد فاروقی اور صدیق[1] سے سرسری سی ملاقات ہوئی۔ پھر کھانے پینے کا سلسلہ چلا۔ میں تو بیٹھی رہی۔ زیدی صاحب بھی اور سب نے دادِ سخن دی، خوب خوب دی۔ واپسی کی جلدی تھی، مگر اب وہ گلیاں اندھیری بھی تھیں اور ناقابل عبور بھی۔ ایک جگہ گڈھے میں پاؤں جا پڑا۔ موزہ، جوتا، ساڑھی سب خراب۔ جیسے تیسے گھر واپس آئے۔ کبھی کہیں جانے کا ارادہ کرو تو الٹی سخت کوفت ہوتی ہے بجائے تفریح کے۔

۲۰/جنوری

زیدی صاحب سے کار لی۔ 30 روپے کا پیٹرول ڈلوایا۔ نذیر بھیا کو ساتھ لیا۔ اردو اکیڈمی کا دفتر وہیں اولڈ سیکریٹریٹ میں ہے۔ ایوارڈ کمیٹی میں میرے علاوہ صدیق الرحمٰن، نارنگ (چیئرمین) خود شریف الحسن، انور دہلوی اور حضرت صلاح الدین تھے جو کچھ زیادہ ہی بول رہے تھے۔ کتابیں تو سال گزشتہ کی تھیں جو پچھلی کمیٹی نے پاس کردی تھیں مگر اس بار بھی

[1] صدیق الرحمٰن قدوائی

اخلاقاً میری رائے لی جا رہی تھی۔ کوئی قابلِ ذکر کتابیں نہ تھیں مگر ایوارڈ تو دینا ہی تھا نا؟ بارہ کتابوں کو جن میں زیادہ تر نوجوان شاعر تھے، چار بڑے انعام۔ ایک خصوصی (سال گزشتہ کا) ملاّ صاحب کو میری تجویز پر ایک ساغر نظامی کو اس سال اور ایک صحافی جمنا داس اختر میری اور انور دہلوی کی تجویز پر۔ اب دو انعاموں پر مسئلہ تھا۔ نارنگ اڑے ہوئے کہ شمس الرحمٰن فاروقی کو ضرور ملے۔ باقی لوگ یا چپ یا اختلاف کہ ابھی وہ جوان ہیں، پھر مل جائے گا۔ مگر نارنگ جس پر اڑ جائیں، دلیلیں، غصہ۔ آخر میں آپا کا فیصلہ۔ میں نے انکار کر دیا۔ چیئرمین جو کہے وہ مان لیجیے اس لیے کہ میں اپنی بات نہ کھونا چاہتی تھی۔ پھر ایک ''خاتون'' کو انعام دینے کا مسئلہ آیا۔ ممتاز مرزا کا نام آیا۔ اگرچہ وہ بھی صرف ایک کتاب کی مصنفہ ہیں، مگر سب کا اصرار۔ بہرحال مجھے بھی زیادہ اختلاف نہ تھا۔

۲۶ر جنوری

آج عینی کو پدم شری ایوارڈ ملا ہے۔ سالِ گزشتہ جب مجھے ملا تھا اور ان کے سامنے کچھ ذکر ہوا تو انھوں نے ذرا حقارت سے کہا تھا مجھے تو مل رہا تھا مگر میں نے کہا مجھے نہیں چاہیے۔ اُسی وقت صغرا نے کہا تھا کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ چنانچہ اس سال جب واقعی ملا تو قبول کرلیا۔ مجھے تو بہت خوشی ہوئی۔ اردو والوں میں سالِ گزشتہ جیسے صرف مجھے ملا تھا، اس سال صرف عینی کو ملا ہے۔

آصف علی گڑھ کے لیے چلا گیا ہے۔ کھانسی زیادہ رہی۔ نیند کی دو گولیاں کھانے کے بعد دو بجے کے قریب آئی۔

دس بجے معلوم ہوا کہ رات کو سعید انصاری صاحب خدا کو پیارے ہوئے۔ اناللہ۔ دو ماہ سے سخت بیمار تھے مگر بڑے حوصلے سے سب سہہ رہے تھے۔ لڑکے، بہو، بیٹیوں نے بہت خدمت کی۔ جامعہ کا ایک اور ستون گرا۔ یہ سب سے پرانے جامعی لوگوں میں تھے۔ خدا

مغفرت کرے۔ کسی طرح ہمت کر کے لڑکیوں کے پاس تعزیت کے لیے گئی۔

آج باوجود سخت سردی اور طبیعت کی خرابی کے ناول کے کافی صفحے نقل کر ڈالے۔ پریڈ نہیں دیکھی۔ سعید صاحب کے انتقال کی خبر کے بعد جی نہ چاہا۔ رات کو البتہ فلم دیکھی 'ہم ہندوستانی'۔ صرف نام ہی نام تھا، ورنہ خاصی بور اور بہت معمولی پکچر تھی۔ مگر کوئی بے ہودگی نہ تھی۔ خیر کچھ وقت کٹ گیا۔

۲۸ رجنوری

اچانک دوپہر رعنا صغیر اور منو آگئے۔ رعنا کے آنے سے بہت خوش ہوئی۔ اگرچہ کل چلی جائے گی۔ یوں تو سبھی میرا خیال رکھتے ہیں۔ صفیہ، رعنا، نجو سب سے زیادہ انیس مگر رعنا کا انداز اور خیال اور ہی ہے۔ بس اُسی میں صغرا کی جھلک نظر آتی ہے اور مزاج صغرا کے مقابلے میں بہت ٹھنڈا ہے۔ رات بارہ بجے تک تو مشاعرہ اور کوی سمینار کے کچھ حصے اپنے ''سن ٹی وی'' پر دیکھے۔ ہندی والوں کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ حب الوطنی، انسان دوستی، آزادی اور قومی یکجہتی پر مگر شاعری کے فن کے لحاظ سے وہ ابھی اردو کے بہت پیچھے ہیں اور اردو والوں کے پاس سوا غم جاناں اور خود ستائی اور خود پرستی کے اور کچھ نہیں۔ اچھے شاعروں میں صرف داراب وفا اور سردار[1] نے پڑھا۔ ڈھائی بجے تک سوئی پھر کھانستے کھانستے صبح ہوگئی۔ رعنا میرے ساتھ جاگتی رہی۔

۳۱ رجنوری

ناول کے باب لکھے۔

شام کو شمیم حنفی اور صبا ملنے کے لیے آئے۔

---

[1] سردار جعفری

صغرا کا کل صبح انتظار ہے۔

دو دن کے لیے مشوری کے ساتھ مل کر کھانا پکایا۔

ذہین نقوی کا فون آیا۔ وہ چاہتے ہیں پندرہ فروری کو غالب ڈے کے موقع پر میں ایک مختصر مقالہ پڑھوں۔ میں نے کوشش کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

ڈاکٹر ماتھر کو فون کر کے زیدی صاحب کے لیے اور باقر مہدی[1] اور میرن صاحب کے لیے کل اور پرسوں کا وقت مقرر کر لیا۔

رات کھانسی کم رہی۔ نیند بہتر آئی۔

۲رفروری

آج سات ہزار روپے باقر مہدی کو دے دیے۔ باقی کل بھجوا دوں گی۔ بڑا رِسک لیا ہے۔ اب خدا ہی جانے نقصان ہوگا خدانخواستہ یا کچھ فائدہ۔

عینی ملنے آئیں۔ وہ اپنے ناول کی اشاعت کے سلسلے میں آئی ہوئی ہیں۔ ان کو شکایت اور رنج ہے کہ ان کو ایوارڈ یا خطاب ملے۔ پر لوگ کہتے ہیں کہ عینی اس کے لیے کوشش کرتی ہیں۔ میں نے بھی سمجھایا۔ پھر رات کو صغرا نے بھی کہ اس قسم کی بکواس پر کان دھرنا بھی نہیں چاہیے۔ جسے کچھ ملتا ہے لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔

۴رفروری

رات چند گھنٹے نیند آئی۔ تھوڑا سا مضمون حالی اور غالب کا لکھا۔ نذیر بھیا ابھی انٹنسیو کیئر میں ہیں۔ عاصمہ ملنے آئی۔ اس نے اطمینان دلایا ہے مگر جب تک وہ واپس نہیں آجاتے، اطمینان مشکل ہے۔

---

[1] پروفیسر باقر مہدی

شام کو پڑوس میں ،میں اور انیس مبارک باد کے لیے گئے۔ ان کے ہاں پاکستانی اور ہندستانی ملاکر تیس چالیس مہمان ہوں گے۔ بہت رونق، دھو دھام، بے حد خرچ ہو رہا ہے۔ سعودی عرب کا پیسہ ہے اور پہلے لڑکے کی شادی۔ خیر خدا مبارک کرے۔ مگر مسلمانوں میں خرچ کرنے کا مرض بڑھتا جارہا ہے۔ جامعہ بھی اس کی لپیٹ میں آگیا ہے۔

طبیعت بہت پریشان ہے۔ نذیر بھیا کی بیماری اور ایسی سخت بیماری۔ ان کے اخراجات۔ گھر کے ان کاموں کی فکر جو انھوں نے سنبھال رکھے تھے۔ کسی مستقل آدمی کا نہ ہونا، نہ ملنا اور طرہ صغرا کی الجھن اور پریشانی۔ خدایا تو ہی ان مشکلوں کا حل نکالے گا۔ میرا بھروسہ تو تجھی پر ہے۔

۵رفروری

آج مجیب صاحب کے ہاں میلاد ہے، صبح ۱۱ بجے۔ دوپہر کو رعنا اور منو وصغیر آئیں گے۔ عمران کی سالگرہ ہے۔

کل سے سردی بہت بڑھ گئی ہے۔

غالب وحالی پر مضمون لکھتی رہی۔ ابھی کل کل بیٹھ نہیں رہی ہے۔

مسز مجیب کے ہاں میلاد میں گئی۔ اس محتاجی کی حالت میں غریب نے میلاد کرایا۔ ان سے مل کر دلاسا دے کر میلاد شروع کردیا۔ ان کی رشتے کی بہو اور بھتیجی بھی آئی ہوئی ہیں۔ بیچ میلاد میں ان کو کرسی پر بٹھا کر لایا گیا اور سلام کے وقت کھڑے نہ ہونے پر وہ رونے لگیں اور سب حاضرین محفل جو مشکل سے ضبط کررہے تھے، رونے لگے۔ محفل میلاد، مجلس عزا بن گئی۔ میرا اور صغرا کا تو روتے روتے برا حال ہوگیا۔ مگر کسی طرح سنبھالا۔ پھر ان کے کمرے میں جاکر بہت ان کی تعریف کی، دلاسا دیا۔ ان کی بہو کو سراہا۔ بہو سے بھی اس کی بہت تعریف کی مگراب ان کی زندگی۔ خدایا۔ خدایا۔ ان پر رحم کر اور ہم لوگوں کو ایسی آزمائش سے بچائیو۔

نذیر بھیا بہتر ہیں مگر ابھی تک انٹنسو کیئر میں ہیں۔ خدا رحم کرے۔

رات ایک فلم دیکھی ''آنکھیں''۔ اچھی فلم ہے۔ حب الوطنی کے موضوع پر بنائی گئی ہے، جاسوس ٹائپ کی، مگر آخر میں بگاڑ دی۔

۱۳ر فروری

سارا دن کام میں گزر گیا۔ چھوٹے چھوٹے ضروری اور غیر ضروری کام۔ صغرا سے ملنے دوپہر کو نرل آ گئی۔ خیر میں تو دو بجے نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر لیٹ گئی تھی۔ شام کو چائے اور چہل قدمی کے بعد عینی آ گئیں اور دو گھنٹے سے زیادہ بیٹھی رہیں۔ بیچ بیچ میں صغرا کے لیے فون۔ صغرا پھر شمیمہ کو بلانا چاہتی ہیں اور اپنی صحت کی خرابی، کام کی زیادتی، پریشانیوں اور الجھنوں سے بہت زیادہ پریشان اور متاثر ہیں۔ میں نے کہا اگر تم اصرار کرو گی تو تمھاری خاطر اور مجبوری کے تحت سب کچھ کر سکتی ہوں مگر وہ رہے گی نہیں۔ پھر بھاگے گی۔ یہ اندیشہ اُسے بھی ہے مگر کچھ ایسی مجبوریاں ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی کہ کیا کیا جائے۔

رات کو انیس صاحب (انگلش کے لکچرر) ایک نئی انگلش لیکچرر نزہت زیبا کو لے کر آئے۔ وہ زاہدہ کا خط لائی تھی۔ زاہدہ کی طالب علم رہ چکی ہے۔ خط کا لب لباب یہ کہ اس کے رہنے سہنے کا کہیں انتظام کر دیجیے۔ ہر ایک کو میں نظر آتی ہوں۔ کوئی میری پریشانیاں اور مشکلیں نہیں دیکھتا۔ یہ نہیں سمجھتا کہ میرے لیے زندگی کے بوجھ اور ذمہ داریاں اپنے ہی لیے اٹھانا دشوار سے دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔ دوسروں کی کیسے اٹھاؤں۔ بہر حال اس سے معذرت کر لی۔ اپنے عزیز تو سب سے زیادہ بے گانہ اور بے پروا ہیں۔

آج سلسلہ روز و شب کے کچھ صفحات مکمل کیے مگر باوجود وعدے کے مکتبہ سے کوئی نہ آیا۔

۱۷ر فروری

فون نہ ملنا تھا نہ ملا۔

آج بھی صبح سے میں اور صغرا کمروں کی دیکھ بھال اور کام میں لگے ہوئے ہیں۔ رات تین بجے کراچی سے پین امریکن فلائٹ سے آئے گی۔ کوشش کر رہی ہوں۔ دیکھیں گاڑی ملتی ہے یا نہیں (۱۱ بجے)۔

اچانک شام کو چھ بجے ظہیر[1] اور عذرا[2] پہنچ گئیں۔ فون تو کراچی میں ملا نہیں مگر وہ اپنی اور ہماری آسانی کی خاطر ایک شام پہلے ہی آ گئیں۔ ظہیر کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ مگر میری محبت میں بے چاری چلی آئی۔ عذرا بھی تھکی ہوئی اور ست ہے۔ علی گڑھ بھی دن بھر جانے کا پروگرام بنا رہی ہیں۔ مگر آج بادل رہا۔ رات میں سردی بڑھ سکتی ہے۔

شام چار بجے چھادی، کنو، چنو اور مونا اچانک آ گئیں۔ چھادی روس سے چند دن کے لیے آئی ہے۔ بہن اور بیٹی ساتھ آ گئیں۔ دو گھنٹے بہت محبت و پیار کی باتیں ہوتی رہیں۔ برسوں بعد ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے فوراً ہی بعد ظہیر و عذرا پہنچ گئیں۔

۱۸ر فروری

دن ظہیر اور عذرا کی خاطر مدارات اور گپ بازی میں گزرا۔ صغرا عذرا کو لے کر رپورٹ کرانے اور کچھ اور اس کا کام کرانے گئیں۔ کل ظہیر عذرا علی گڑھ ٹیکسی سے جانا چاہتی ہیں اور مجھے اور صغرا کو بھی لے جانا چاہتی ہیں۔ مگر موسم ٹھیک نہیں اور ایک دن میں دو سفر ہمت نہیں پڑ رہی۔ اگر موسم ٹھیک ہوا تو شاید چلی جاؤں۔ صغرا کی طبیعت بھی صاف نہیں۔ شمیمہ کو چار دن کے لیے صغرا نے بلا لیا ہے۔

زیدی صاحب شام کو آئے۔ ان سے معلوم ہوا کہ حکیم عبد الحمید کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ بعد میں اخبار میں بھی دیکھا۔ زیدی صاحب کل سوئم میں جائیں گے۔ شاید میں بھی جاؤں اگر علی گڑھ نہ گئی۔

---

[1] ظہیر فاطمہ صالحہ عابد حسین کی گہری دوست

[2] ڈاکٹر عذرا رضا ان کی بیٹی

رات کو انیس اور صفیہ نے ظہیر اور عذرا کی دعوت کی۔ رضا غریب اب تک ٹھیک سے کھانا نہیں کھا سکتا۔

۱۹ر فروری

رات کو بارش ہوئی۔ صبح بھی تھی۔ پہلے تو ظہیر نے علی گڑھ کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں بھی رات نزلہ وغیرہ میں مبتلا رہی۔ پھر اچانک دھوپ نکلی تو انھوں نے ارادہ کر لیا۔ رعنا کے دیور شریف حیدر کو ساتھ جانے پر راضی کیا گیا۔ اکیلے دو عورتوں کا سفر آج کے مخدوش زمانے میں وہ بھی ٹیکسی میں۔ میرا جی نہ چاہا۔ بہر صورت ساڑھے نو بجے وہ لوگ روانہ ہو گئے۔ موسم دن بھر بے رنگ رہا۔ بادل، بونداباندی، سردی، تیز ہوائیں۔ حکیم صاحب کے ہاں بھی جانے کی ہمت نہیں پڑی۔

رعنا کل آ گئی تھی۔ آج چار بجے چلی گئی۔ ہر وقت ہر موقع پر سب کے کام آتی ہے بچاری۔ نذیر بھیا کے لیے پانچ سو روپے اصرار کر کے اور رو رو کر انھیں دے گئی اور جن لوگوں کے ساتھ انھوں نے عمر بھر کیا، ہاتھ پیر سے اور سب طرح وہ چپ سادھے ہیں۔ حد ہے کہ یہاں جسے وہ اولاد سمجھتے ہیں اس نے بھی الٹ کر خبر نہ لی۔

لکھنے پڑھنے کا کام بند ہے۔

۲۴ر فروری

آج اردو اکیڈمی دہلی کے ایوارڈ اور انعامات تقسیم کرنے کا فنکشن تھا۔ خورشید عالم اور دو دلی سرکار کے افسر مہمانانِ خصوصی تھے۔ اچھا صاف ستھرا فنکشن تھا۔ ۸ آدمیوں کو خصوصی انعامات دیے گئے۔ پانچ ہزار روپیہ، شال اور ایک چاندی کی شیشے نما پلیٹ۔ ان میں ساغر، ملّا صاحب، گپتا وفا تو واقعی مستحق تھے۔ ویسے تو جس کو بھی دے دیا دینے والوں کی مرضی۔ دس کتابوں پر دو ہزار فی کس انعام دیا گیا۔ دو مکتبوں کو جن میں مکتبہ جامعہ بھی شامل ہے دو ہزار کا پبلیکیشن پر

انعام دیا گیا۔ ویسے فنکشن بہت سلیقے سے کیا گیا تھا۔ شریف الحسن نقوی کرتا دھرتا تھے۔ تقریر سب سے اچھی نارنگ کی تھی۔ پہلے بھی تھا۔ رفعت سروش کا مگر اس کے لیے ہم نہیں ٹھہرے۔

۲۵ ر فروری

سلسلہ روز و شب کی کتابت شدہ کاپیاں دیکھنی شروع کیں۔ کوئی دسویں بار۔ چھپنے کی امید اب بھی نہیں۔ ایسی ایسی اصلاحیں کاتب تو خیر کرتے ہی تھے اب کاپیاں پڑھنے والے اپنی قابلیت کے اظہار بھی کرنے لگے ہیں۔ میں جسے عابد اور سیدین صاحب تک اپنی زبان میں اصلاح دینے کا حق دے چکے تھے۔ مگر جو لوگ زبان نہ جانتے ہوں ان کی کہاں داد و فریاد کی جائے۔

قیصر صاحب کو مضمون بھجوادیا۔ انھیں پسند آنے کی تو امید نہیں مضمون ملنے سے پہلے ذرا دیر کو وہ آئے بھی تھے۔

شائستہ اکرام اللہ کو فون پر فون کیے۔ یہی معلوم ہوا کہ چنڈی گڑھ گئی ہیں۔ اچانک شام کو فون آیا کہ وہ تو کہیں نہیں گئیں اور کل اتوار کی شام کو چار بجے ملنے آئیں گی۔ وہ بات تو کسی کی سنتی نہیں اپنی ہی کہتی ہیں۔

یکم مارچ

دن اداسی میں گزرا۔

صغرا کی کتاب راگ بھوپالی چھپ کر آئی۔ خوشی ہوئی۔ بہت بڑی خوشی۔ شکر ہے نوبت تو آئی۔ خدا کرے اس کی خاطر خواہ قدر ہو۔

بیگم بھی پرسوں آگئی ہے۔

رات رعنا آئی۔

خودنوشت تقریباً دیکھ ڈالی، مگر حاصل؟ صفر۔

۱۱/مارچ

جامعہ میں کھانا تھا۔ مشاعرہ تھا۔ مگر نہ دل حاضر نہ ذہن۔ میرن[1] کی فکر۔ نہ کوئی ساتھ جانے والا۔ خیال ہی نہیں کیا۔

۱۴/مارچ

آج پیارے میرن خدا کو پیارے ہو گئے۔ بے شمار لوگ آئے۔ مرد، عورت، بچے، عزیز، دوست، پڑوسی! بہت عزیز تھے ہر حلقے میں۔

۸/اپریل

آج اچانک چار دن قبل اقبال[2] اور مریم[3] آ گئے۔ سب بہت خوش ہے اور ظاہر ہے سب سے زیادہ شمع[4]۔ ماں کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی مگر بڑے حوصلے اور خاموشی سے اس نے بچی کی جدائی کو جھیلا۔ کام بھی بہت کر رہی ہے۔ صغرا کا بے حد خیال کرتی ہے۔ انیس کا میرا بھی کا۔ خدا ان تینوں کو خوش و خرم رکھے۔

آج ریاض بہن کی فاتحہ دلوائی۔ مجلس مختصر سی صبح کر لی تھی۔

۱۲/اپریل

احمد ظہیر کی معرفت صفدر جنگ اسپتال کے آنکھوں کے ماہر ڈاکٹر ماتھر سے وقت لیا تھا۔ میں اور اقبال گئے۔ احمد وہاں مل گیا۔ ڈاکٹر ماتھر نے اچھا معائنہ کیا۔ دونوں نمبر بدل گئے تھے،

---

[1] سخت بیمار تھے [2] ڈاکٹر اقبال مہدی [3] ان کی بیٹی [4] ان کی بیوی

دیے۔ بہت اطمینان دلایا کہ پانی ابھی بہت کم اترا ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ دل پر سے بڑا بھاری بوجھ اتر گیا۔ یہاں سے امپیریل ہوٹل حمید[۱] سے ملنے گئی وہ غریب دوائیں دے کر سلا جاتا ہے، نہیں اٹھ سکا۔ زہرا سے مل کر واپس چلے آئے۔ راستے میں پرسوں کی مجلس کے لیے بھوگل میں مٹھائی کا آرڈر اور پیشگی روپے دیے۔

آج کل چہلم کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

۱۴/اپریل

میرن صاحب کا چہلم (مجلس، فاتحہ) بخیر و خوبی ہو گیا۔ دو سو زیادہ لوگ مجلس میں تھے۔ مرد عورتیں مل کر سو سے زیادہ لوگوں نے کھانا کھایا۔ بہت فکر اور الجھن تھی مگر شکر ہے کہ کسی کام میں گڑبڑ نہیں ہوئی۔ خرچ بہت کافی ہوا۔ مولانا کے سفر خرچ اور لین دین کا خرچ اقبال نے برداشت کیا۔ رعنا نے بھی جوڑا بنایا اور اوپر سے بھی خرچ اٹھایا۔

یہ رسمیں کب تک ہمارے ہاں جاری رہیں گی۔ کب تک فضول خرچیوں کا یہ رواج لوگوں کو پریشان کرے گا۔ ہم جیسے لوگ چاہتے بھی ہیں تو لوگوں کے اصرار اور دل شکنی کی وجہ سے مجبور ہو جاتے ہیں۔

میں تو یہ وصیت کرنا چاہتی ہوں کہ سوئم کے بعد میرے مرنے کے سلسلے میں کوئی رسم رسوم نہ ہو سوا مجلس کے! باقی دینے والے جانیں۔ خدا توفیق دے کہ زندگی میں جو کر سکتے ہیں وہ کر لیں اور خدا قبول کرے۔

۱۹/مارچ

آج صغرا، رضا، صفیہ نجو اپنے اپنے کام پر سدھارے ہیں۔ شام پھر لوگ آتے رہے۔

---

[۱] ڈاکٹر سید حمید

کشور[1] اور عینی بھی آئیں۔ بڑی مشکل سے تھوڑا وقت ٹہلنے کے نکالا۔

ایجوکیشن منسٹری سے کتابوں پر ریویو کا تقاضا آرہا ہے۔ آج سے ان کی کتابیں دیکھنی شروع کی ہیں۔ عذرا رضا کا بہت پیارا، بہت محبت بھرا، بے حد عقیدت سے معمور خط ملا۔

۲۹/ مارچ

نسیم انہونوی حسبِ وعدہ آئے۔ بچارے خاصے بیمار، بوڑھے کمزور ہیں۔ مگر سفر کا حوصلہ باقی ہے۔ کسی میٹنگ میں آئے تھے۔

کتابیں نہ چھاپ سکنے کی معذرت اور مشکلات اور نقصانات وغیرہ وغیرہ۔ میں تو پہلے ہی اس کے حق میں نہ تھی۔ خود انھوں نے اصرار کیا تھا تو دو کتابوں کی اجازت دے دی تھی۔ خیر نہ سہی۔

''ساتواں آنگن'' چھاپنے کے لیے فی الحال تو شاہد علی خاں اُسے چھاپنے پر ہمت کی ہے۔ آئندہ کا اللہ مالک ہے۔

صغرا زہرا کے پاس گئی تھی۔ حمید کو دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ اس کی حالت اچھی نہیں۔ خدا سیدہ پر اور خود اس پر رحم کرے۔

۲۹/ اپریل

گزشتہ دن کچھ زیادہ مصروفیت کے گزرے۔ ڈائری نہیں لکھ سکی۔ ظہیر کی فرمائش یوم ولادتِ امام حسین پر پیام لکھنا اور لوگوں سے لکھوانے کی فرمائش!

نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کے لیے بانڈ وغیرہ وغیرہ کی جدوجہد۔ خدا خدا کرکے آج کام مکمل ہوا۔ گرمی۔ زہرا، ذکیہ وغیرہ کی آمد۔ رعنا کی آمد۔

---

[1] کشور قدوائی

۳۰؍اپریل

مولانا عبدالسلام کی بیوی بہو وغیرہ ملنے آئیں۔ظہیر کی فرمائش کے فون کیے۔ رفعت سروش نے پیام بھیجنے کا وعدہ کیا۔ مالک رام نے وعدہ کیا مگر ایفا ہوتا ہے یا نہیں؟

بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہے۔دوبار چکر سے آئے، گرتے گرتے بچی۔

شام کو ڈاکٹر ماتھر کو زیدی صاحب کے ساتھ تحفہ دینے کے لیے گئی۔ آج ان کی سالگرہ تھی۔دونوں میاں بیوی، بیٹی، بامحبت، خوش مزاج ہیں اور کافی پلائی۔

۲؍مئی

ذکیہ، زہرا، سیدہ اور اس کے بچے ساڑھے دس کے بعد آئے۔ بچے ماشاء اللہ کافی بڑے ہو گئے ہیں اور اچھے معلوم ہوتے ہیں۔صغرا تھیں نہیں۔ جیسے تیسے ناشتہ کرایا۔ پھر وہ لوگ چلے گئے۔طبیعت بہت ست اور بے چین ہے۔ بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے۔

آج شمع کا خط آیا۔وہ یہاں سے جا کر گھبرا رہی ہے۔ بہت محبت پیار کا خط ہے۔انیس وغیرہ کی منتظر ہے۔

نجو کے ہاتھ نیشنل بک ٹرسٹ کو اسٹمپ پر کاغذات بھجوائے۔

آج سارا دن بڑے کمرے کے ساتھ کی کوٹھری کی صفائی کر سکی۔ بلو[1] بہت ہاتھ بٹاتا ہے۔ بہت بری حالت تھی کتابوں اور کاغذات پر پھپھوندی لگ گئی۔

۱۰؍مئی

صبح نو بجے تک گھر کے کاموں اور صفائی وغیرہ سے فراغت حاصل کی۔ زیدی صاحب

---

[1] میرن صاحب کا نواسہ

بہت سویرے آگئے تھے ان سے باتیں کیں۔ ان ہی کا ایک دم ہے جو سوچ لیتا ہے کہ کبھی کبھار مصداق کے پاس جا کر اس سے ملوں۔ آج طے کر لیا کہ پرسوں انشاء اللہ ضرور پارٹی ہوگی۔ صغرا اور عبید الحق کے انعام کے اعزاز میں۔ چند صغرا کے دوستوں یا ان دوستوں کے بچوں کو بلوا رہی ہوں اور باقی گھر کے بچے ہوں گے۔ آصف اور ہما سے بھی کہہ دیا ہے۔

شام کو صدیقی صاحب کے ہاں ذرا دیر مبارک باد دینے کے لیے میں اور صغرا گئے۔ رات کو ایک نہایت بکواس دیو مالائی قسم کا فلم آیا جس کو ذرا دیر دیکھا۔ جانے کیسے فلم لوگ بناتے ہیں۔ موسم بہتر ہے۔ صغرا کا مزاج بھی بہتر ہے۔

۱۲ رمئی

دعوت اچھی رہی۔ ۱۵ لوگ باہر سے آئے۔ میرے دوست تو زیدی صاحب ہی تھے۔ باقی صغرا کے دوست اور کولیگ۔ عبید الحق کو انعام ملا ہے۔ بچوں کے آرٹ پر۔ مظفر حنفی کو نیلا ہیرا پر۔ خالد محمود کو چند مہینے پہلے ان کے پہلے مجموعہ پر ملا تھا۔ اس نے ہمیں دعوت میں بلایا بھی تھا۔ حنیف صاحب، صدیق اور عذرا۔ شمیم اور صبا کو بھی بلایا تھا۔ کملیش[1] غریب سخت مصیبت میں ہے۔ پھر بھی آگئی اور شرکت کی۔ عذرا و مجیب نہیں آئے۔ سارا دن میں، صفیہ اور شام میں ظفر[2] اور صغرا اور آصف تک کام میں جٹے رہے۔ رات کو صغرا صفیہ اور رضا شیلا کے ہاں شادی میں گئے۔

معلوم ہوا آج مولانا عتیق صدیقی کا انتقال ہوگیا۔ بہت سخت بیمار تھے۔ بڑی شدید تکلیف اٹھائی۔ مومن، سچے، قدر پرست، دیانت دار اور بے مثال آدمی تھے۔ خدایا ایسے لوگوں کو کیوں اتنا دکھ ملتا ہے۔

عبید الحق نے بتایا پرسوں حکیم چند شاستری[3] کا بھی اچانک ہارٹ فیل ہوگیا۔ عابد صاحب

---

[1] کملیش لاٹھے صغرا مہدی کی دوست [2] ظفر مہدی [3] ہندی کے استاد

کے ساتھیوں اور جامعہ کے کارکنوں میں سے تھے۔
کل مجیب صاحب و مسز مجیب کو دیکھنے گئی تھی۔ دونوں کی حالت عبرت ناک ہے۔ دیکھ کر سخت دکھ ہوا۔

۱۴ر مئی

صبح و شام بیشتر وقت صفائی اور کاموں میں گزرا۔ شیلا کے نہ آنے سے کام اور بڑھ گیا ہے۔ جسم میں سکت نہیں مگر صرف صغرا پر تو چھوڑا نہیں جا سکتا۔
شام کو مالک رام کے فنکشن میں زیدی صاحب کے ساتھ میں اور صغرا گئے۔ ان کو کئی انجمنوں نے مل کر فخر غالب کا ایوارڈ دیا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار ۔فخر غالب!!! ہم تو پون گھنٹے بیٹھے۔ تیسری تقریر پر اٹھ آئے۔ چکر بہت آ رہے تھے۔ کسی طرح سیدہ کے ہاں پہنچے۔ اس کی بچی آشی (عائشہ) کی نویں سالگرہ تھی۔

۱۷ر مئی

آج اسلام اینڈ دی موڈرن ایج سوسائٹی کو ختم کرنے کی میٹنگ تھی۔ پانچ سال کوشش کی کہ سیکریٹری گاڑی کھینچ لیں مگر ناکامی ہوئی۔ میرے دل پر سخت تکلیف تھی۔ مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ یہ کام ہو نہ سکے گا۔ عابد صاحب دنیا میں ایک آدھ ہی پیدا ہوتا ہے۔ اس کا کچھ روپیہ تھا وہ عابد حسین میموریل ٹرسٹ میں منتقل کرنے کا رزولیشن پاس کر دیا گیا۔ خدا زیدی صاحب اور مالک رام کو سلامت رکھے کہ ان کی وجہ سے یہ کام سلجھ تو جاتے ہیں۔
صبح رعنا آ گئی چار دن کے لیے۔ اس سے بڑی رونق ہو گئی۔ عمران بھی آیا ہے مگر بہت خود رائے ہو گیا ہے۔
انیس و شمع کے خط آئے۔ انیس اکیس کو آئیں گی۔ ذکیہ، سیدہ ذرا دیر کو آئیں ان کے گھر

کا کام ابھی بہت باقی ہے۔

آج کل لکھنے پڑھنے کا کام بند ہے۔ طبیعت کسی طرح صاف نہیں ہو رہی ہے۔ خدا جانے کیا ہوگا۔

۲۰ر مئی

مہمانوں کی کثرت۔ نرجس، عینی، زہرا، سیدہ۔ ان کی پریشانی۔ برتن چوری ہو گئے۔ بچاری لڑکیوں کو عجب پریشانی ہے۔

رات نیند خراب رہی کہ اپنے کمرے میں سونا پڑا جو بہت گرم تھا۔ شام کو زیدی صاحب کے ہاں نثار احمد فاروقی کو لے کر گئی۔ ان کو کچھ غلط فہمی تھی وہ دور کرائی۔ چیک پر دستخط کروا دیے۔ ایک ادھوری بکواس فلم 'دل کا ہیرا' دیکھی۔

۲۱ر مئی

شکر ہے انیس خیریت سے آ گئیں۔ اقبال وغیرہ اچھے ہیں۔ اقبال کو ایک گھر بھی مل گیا ہے۔ اتوار کو چلا جائے گا انشاء اللہ اس میں۔

صغرا کے جانے کا مسئلہ طے نہیں ہو رہا ہے۔ بھاگ دوڑ کر رہی ہے۔ کسی کی کچھ رائے کسی کی کچھ۔ آج عابد صاحب ہوتے، بھائی جان ہوتے، کتنی آسانی سے یہ آنے جانے کے مسئلے طے ہو جاتے تھے۔ کہاں کہاں کیسے کیسے آرام واطمینان سے مہینوں رہے ہیں۔ میں نے تو اس لیے اب کہیں جانے کا ارادہ بالکل ترک کر دیا ہے۔ عابد صاحب نے اس سلسلہ میں اتنا کچھ کیا کہ اب نہ حسرت رہی اور عادت بھی خراب ہو گئی ہے۔ اب تو ہم بھلے اور گھر بھلا۔ مگر صغرا کی طرف سے فکر ہے کاش وہ کہیں جا سکے اور آرام لے سکے۔ آج جو اس کا گھر، شوہر، بیٹا ہوتا تو وہ کیوں یوں دوسروں کا سہارا پکڑتی۔

۲۲ رمئی

نزل[1] کی بھاگ دوڑ اور صغرا کی کوشش سے دو ایک جگہ جانے کا معاملہ آگے بڑھا ہے۔ شاید پنچ مڑھی جانا ہو مگر ابھی فیصلہ نہیں کر پائی ہیں۔

۲۳ رمئی

آج برسوں بعد بھائی جان کے گھر چند منٹ کے لیے گئی۔ زہرا، ذکیہ جانے پر تیار کھڑی تھیں۔ گھر کی مرمت وتعمیر کا سلسلہ جاری ہے اور خدا جانے ابھی کب تک جاری رہے گا۔

گرمی کی شدت نے طبیعت بہت پریشان کر رکھی ہے۔ صغرا ایک بجے روٹی وغیرہ خرید کر لائی۔ کچھ گھر میں پکایا ہی تھا۔ جیسے تیسے کھانا کھایا۔ دوپہر میں پیام، سلام، آنا جانا فون وغیرہ چلتے رہے۔ صبح ٹہلنے کے لیے بہت سویرے بخار کے بعد گئی تھی مگر دوپہر کو نہ سو سکی۔ شام کو بلال[2] نے ''میسیج'' دیکھنے کو بلایا دوبارہ دیکھی۔ زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آئی۔ بہت اچھی پکچر ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیم کو سمجھنے اور اسلام کی ابتدائی زندگی کی کٹھنائیں اور ثابت قدمیاں دکھائی ہیں۔ پھر بھی ہمارے مذہب کے ٹھیکیدار خفا ہیں۔ اس دور میں جب خود مسلمان نوجوان مذہب سے ناواقف و محض ہیں، اس بہانے ہی انھیں کچھ معلوم ہو سکتا ہے اور کوئی منظر بھی اسلام کے معیار اور شان کے خلاف نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف اونٹنی دکھائی ہے۔ حضرت علی کی صرف تلوار اور نہ ام المومنین کسی کو نہیں دکھایا۔ ان بزرگوں کی آواز تک نہیں سنائی۔ بلکہ حضرت حمزہؓ حضرت خضرؓ اور دیگر مسلمانوں کی زبان سے باتیں ادا کی گئی ہیں۔ بلال حبشیؓ اس قدر عظیم دکھایا ہے کہ سبحان اللہ، مگر ہمارے مذہبی لوگ نہ دیکھیں نہ سمجھیں۔ تصویر اسلام میں منع ہے تو اسے بھی ممنوع کرو۔ خواہ اس کا مقصد کتنا ہی اچھا ہو۔

---

1. نزل جین صغرا مہدی کی دوست
2. بلال زیدی مرحوم

۴/ جون

صغرا آج سدھار گئی۔ ایل۔ٹی۔سی نہیں ملا۔ رعنا میرے پاس رہنے کے لیے آ گئی ہے۔
ساتواں آنگن کے پروف پڑھنے شروع کیے۔ کسی قدر غلطیاں ہیں۔ روز مرہ، محاورہ، ذرا کم مستعمل الفاظ کو کاتب صاحب بالکل ہی نہیں سمجھتے۔ خدا جانے تصحیح بھی کریں گے یا نہیں۔

۷/ جون

آج رضا اور رعنا سخت اصرار کر کے ایک فلم دکھانے لے گئے۔ 'زمین آسمان'۔ جس کا نہ سر نہ پیر۔ اچھی کاسٹ کو ضائع کیا گیا تھا۔ مگر ان لوگوں کے محبت بھرے اصرار اور خوشی پر رضامند ہونا پڑا۔ باہر سخت گرمی، اندر اچھی خاصی ٹھنڈ تھی۔
رات کو نماز اور دعاؤں وغیرہ میں دیر ہوگئی۔
باچھو کی آج خیر سے ستر برس کے ہوگئے۔ صبح مبارک باد کا فون کیا۔ خدا اُسے تندرستی کے ساتھ سلامت رکھے۔

۸/ جون

صغرا کا خط آیا۔ اقبال کا خط آیا۔ رعنا کی سالگرہ تھی۔ اسے چھوٹا سا تحفہ دیا۔ رعنا آج اپنے گھر گئی تھی۔ اس لیے پکانے کا کچھ کام کیا۔ تلاوت عبادت وغیرہ میں کچھ وقت لگا۔ طبیعت بہت الجھی ہوئی تھی تو ایک نہایت بور ناول ایک خاتون کا لکھا ہوا پڑھتی رہی۔ عذرا رضا کو خط لکھا۔ عذرا کی دوست کے والد اور والدہ امریکہ جا رہے ہیں ان کے ساتھ اسے کچھ کتابیں بھیجنی ہیں۔
رضا اور غالباً صفیہ آج بمبئی جا رہے ہیں اور بھی تنہائی ہو جائے گی۔

۹/جون

رضا اور صفیہ آج بمبئی گئے۔ خدا پھر سے واپس لائے۔ صفیہ گھبرا رہی تھی۔ میں نے بمبئی باچھو کے ہاں فون کر دیا امید تو ہے کہ وہ لوگ اس کا سواگت ہی کریں گے۔

۱۱/جون

تلاوت، عبادت، چہل قدمی۔ رات کی نیند غائب۔ چند خط لکھے۔

کل بھائی جان کے خاندان کو کھانے پر بلایا ہے۔ ماشاءاللہ ۱۲ آدمی ہیں۔ باقی گھر کے۔ اسی کے انتظام میں مشغول رہی۔ صغرا ہی سب کو بلاتی، پکاتی اور کھلاتی رہتی ہے۔ عابد صاحب کے بعد دل ہی نہیں اٹھتا کسی کو بلانے کو۔ رات کو بے حد تھک گئی۔ یہی انیس کا حال ہوگا۔ رعنا تو کبھی بولتی ہی نہیں لیکن پیاری بچی ہے۔ خدا اسے خوش و سلامت رکھے۔

۱۲/جون

صبح سویرے سے دعوت کا کھانا پکانا شروع تھا۔ کئی چیزیں خود پکائیں۔ کھیر، قورمہ، چاول۔ انیس نے کچے گوشت کے کباب بنائے۔ دوسرے کاموں میں ہاتھ بٹایا۔ رعنا نے بہت سا کام سمیٹا۔ شام کو روزہ دار نجو نگو نے سب انتظام کیا برتن، سلاد، رائتہ، نیبو پانی وغیرہ وغیرہ کا۔

سب لوگ آٹھ کے بعد آئے۔ ساڑھے دس کے بعد گئے۔ بھائی جان اور بھابی جیسے دل کے اندر سے باہر برابر نکل کر بیٹھے تھے۔ ایک ایک بچی اور بچّے کی صورت میں ان کی جھلک نظر آرہی تھی۔ آج زندہ ہوتے تو ان بچوں کو دیکھ کر خوشی سے کیا حال ہوتا۔ دونوں ہی اپنے بچوں اور ان کے بچوں کے عاشق تھے۔

سب نے حد سے زیادہ خوش ہو کر تعریف کر کے گلے میں بانہیں ڈال ڈال کر پیار کر کے کھانا کھایا۔ محنت وصول ہوگئی۔

۱۷ر جون

سخت گرمی۔ بجلی بار بار غائب۔ طبیعت ست۔ زیدی صاحب کے ہاں دوپہر کا کھانا۔ غلام حسین اور ان کی بیگم سے ملاقات۔ انھوں نے اس عمر میں ایک بچہ اڈپٹ کیا ہے جو بے حد لاڈلا اور خاصا شریر ہے۔

شام کو ذرا دیر حمید سیدہ وغیرہ کے ہاں گزارا۔ حمید بہتر ہیں۔ کم سے کم مجھے لگے۔

یکم جولائی

عید نہیں منائی گئی مگر پچپاس ساٹھ سے زیادہ لوگ ملنے آئے۔ سویاں نہ سہی شربت، چائے پان تو پیش کرنا پڑتا ہی ہے۔

اچانک سینے میں درد اٹھا۔ کچھ دیر سہا پھر لیٹ گئی۔ اندر جا کر دوا کھائی۔ مگر باہر عینی، امینہ، نارنگ اور منورما اور پھر ظفر پیامی اور منورما (جو مدتوں بعد آئے تھے) ملنے آئے۔ کسی طرح جبر کر کے ان سے ملی۔ کافی دیر بات چیت رہی۔ دو بجے دوا کھا کر کمرہ بند کر کے لیٹی۔ اٹھی تو طبیعت بہتر تھی۔ زہرا وغیرہ نے لوگوں کو شام کو بلایا تھا، مگر نہ جا سکی۔ احمد (ذکیہ کا بیٹا) اس نے بھی منع کیا۔ تھرائی ٹس کا خیال اس کا بھی تھا۔ اس کی دوا کھائی۔ لوگ ملنے آتے رہے۔ کمرے پر ہی ملتی رہی۔ ہر عید درد و غم کا ایک معنی سمجھانے آتی ہے۔

۶ر جولائی

عابد علی خاں کے انعام ملنے کی خوشی میں مالک رام نے انجمن ترقی اردو میں دعوت دی۔

وہاں کیوں؟ سمجھ میں نہیں آیا۔

اور پھر اسے ایک جلسہ بنا ڈالا۔ خلیق انجم اور متعدد لوگوں نے دو دو چار چار منٹ کی تقریریں کیں۔ ایک ڈیڑھ منٹ میں بھی بولی۔ جلسہ بہت پھیکا رہا۔ خاص کر اس لیے کہ باہر کا شور، پنکھوں کا شور اور آواز تھا۔

آج غالب ایوارڈ تقسیم ہوئے۔ عینی کو بھی ملا ہے۔ صغرا گئی تھی۔ میں سواری نہ ہونے کی وجہ سے نہ جا سکی۔ جلسہ میں بہت کم لوگ تھے مگر باوجود اتنے سخت خراب حالات کے موصوفہ[1] موجود تھیں۔ تقریر بھی کی اور انعامات بھی تقسیم کیے۔

۷؍جولائی

صغرا کے دوست آتے رہے۔ عینی نے زیادہ وقت گزارا۔ بارش کل بھی ہوئی اور آج بھی۔ کرونا بھی آ گئیں۔ کل صغرا کی سالگرہ ہے۔ اپنی کتاب کی پہلی جلد اُسے دینے کے لیے چپکے سے رکھی تھی کہ صبح دے دوں گی مگر رات کو انیس نے کل کی دعوت بول دی اور رفتہ رفتہ کئی لوگوں کو معلوم ہو گیا۔

۹؍جولائی

آج بھی خوب بارش ہوئی۔ کل سر پر سفر سوار ہے۔ زہرا، سیدہ، ذکیہ نے اچانک سلسلہ روز و شب کے سلسلہ میں ایک فنکشن اپنے گھر پر کر ڈالا۔ انور، نادی، صبوحی، میرے اور انیس کے گھر کے سب لوگوں کو۔ کنو[2] کو، بیگم کو، صدیق اور عذرا کو۔ شمیم حنفی، مظفر حنفی، کشور قدوائی وغیرہ کو بلایا۔ دو تین کے سوا سب آئے۔ زیدی صاحب سب سے پہلے آئے۔ تقریریں ہوئیں۔ زیدی صاحب نے انتہائی محبت اور خلوص سے اس کتاب پر تقریر اور بہت تعریف کی۔

---

[1] اندرا گاندھی [2] ممتاز مرزا

سیدہ نے انگریزی میں اس کو بہت سراہا اور زہرا نے تو اردو میں اتنی خوبصورت تقریر کی جس سے کتاب کی خصوصیات پر بڑے متوازن انداز سے نہایت عمدہ روشنی ڈالی۔ صغرا نے ذرا سے مزاحیہ انداز میں تقریر کی۔ انور نے ایک چھوٹی سی پراثر تقریر کی۔ غرض اچھا خاصا فنکشن کرڈالا۔ کمال یہ ہے کہ حمید بھی آئے اور بیٹھے رہے۔ ذکیہ کے بچے میاں نہیں آئے۔ حمید کے بچے کام کرتے رہے۔ چھوٹے بھی ہیں اور زبان نہیں سمجھتے۔ آخر میں میں نے ایک چھوٹی سی تقریر میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ بھائی جان کا تو نام ہی نہیں لے سکی۔ چائے وغیرہ کے بعد بڑی دیر تک بیگم اور ممتاز مرزا نے اپنا کلام سنایا جسے سب نے پسند کیا۔ میں تو ساڑھے آٹھ بجے آ گئی۔ ان لوگوں کی محفل جمی رہی۔ اب کل لکھنؤ جانا ہے اور آرتھرائٹس کی تکلیف بڑھ رہی ہے۔ پیٹ بھی ٹھیک نہیں۔

۱۲؍جولائی

مسرور جہاں آج شام ملنے آئیں اور کئی گھنٹے بیٹھیں۔ زیادہ تر اپنی ہی باتیں کرتی رہیں۔ اقبال کا بیان ہے کہ علی جواد زیدی نے کہا ہے کہ یہ وہ پیر کو ملنے آئیں گے اور کوئی جلسہ کرنے آئیں گے۔ مگر میں جانتی ہوں لکھنؤ والے یہ سب نہیں کرتے کم سے کم میرے لیے۔ میں تو ان سے اور نازش مرحوم کی بیوی کی وجہ سے ملنا چاہتی تھی۔

ٹی۔ وی والے بہت بے چین تھے (بقول اقبال جو وہ ہیں اکثر پروگرام دیتا ہے) کہ میں آؤں تو پروگرام کرائیں۔ اب خدا جانے۔ میں تو کچھ لائی بھی نہیں۔ آج خوب بارش ہوئی۔ دوپہر جب ہم صغرا اور شمع امین آباد میں نغمہ کے جہیز کے لیے شاپنگ کر رہے تھے۔ شکر ہے کہ واپس چلے تو بارش کم ہو گئی تھی۔ واپسی پر رکشا والا بہت لمبے رستے سے لایا۔ موسم بہتر ہو گیا ہے۔

۱۳ر جولائی

مسرور جہاں کے ہاں ملنے گئے۔ حسب عادت صغرا بلکہ رکشا والا راستہ بھولے۔ بچاری کے ہاں رات کے قریب پہنچے۔ وہ چائے پر بہت سی چیزیں تیار کیے بیٹھی تھیں۔ بہت محبت اور عقیدت سے ملتی ہیں۔ ان کے والد نصیر حسین خیال اکثر بھائی جان کے ہاں جا کر رہا کرتے تھے۔ یہ خود نوابوں میں بیاہی تھیں۔ اب شوہر مر گئے ہیں۔ دوسری بیوی تھیں۔ جائیداد وغیرہ کے جھگڑے چلتے رہتے ہیں۔ اچھی خاصی لکھنے والی ہیں۔

نزہت فاطمہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مسرور جہاں سے کہا ہے۔ شاید کوئی صورت نکل آئے۔ اقبال چھٹی پر ہے۔ بیماری کے لیے چھٹی لی ہے مگر بہت سے کام کرتا ہے۔ صغرا یا تو گانے سنا کرتی ہے یا پھر پڑھتی رہتی ہے۔ بہر حال یہاں اسے کچھ سکون مل رہا ہے۔ شمع کے پاس آج کل ملازمہ نہیں۔ صغرا جتنا ہو سکتا ہے ہاتھ بٹاتی ہے۔ شمع بہت محبت اور خوش مزاجی سے سب کر رہی ہے۔

۱۴ر جولائی

کوئی ملنے نہیں آیا۔ میں نسیم صاحب[1] سے ملنا چاہتی ہوں مگر بلڈ پریشر لو ہے اور ٹانگوں میں درد اور پھر شاپنگ کے لیے جانا یا بارش۔ ہاں پرسوں حیات اللہ انصاری اور سلطانہ سے ملے۔ کئی زینے چڑھنے پڑے۔ ملے تو بہت خلوص اور اپنائیت سے۔ خاص کر سلطانہ کھانے پر بھی بلا رہی تھیں مگر میں نے معذرت کر لی۔ حیات اللہ صاحب خاصے خشک آدمی ہیں۔ تول تول کے بولتے ہیں۔ مگر ہم سے تو اچھی طرح ملتے ہیں۔ ایک زمانے میں عابد صاحب سے ناراض ہو گئے تھے۔

---

[1] نسیم انہونوی

۱۵؍جولائی

شمع کے رضوی[۱] صاحب آج لکھنؤ آئے۔ ان کے ساتھ شمع کے پھوپھی زاد بھائی بھی تھے۔ جوان آدمی ہیں اور گیارہ بچوں کے باپ جن میں سے ایک ابھی ہوا ہے۔ بہت خوش اور مطمئن ہے۔ رضوی صاحب مجھے بہت پسند ہیں۔ بہت ہی سیدھے سادے، پرخلوص بامحبت آدمی ہیں۔ نہایت وضع دار بلکہ جفاکش۔ شمع اقبال دونوں کو بہت چاہتے ہیں اور سارا[۲] پر تو فدا ہیں۔ رات کو وہ یہیں رہیں گے۔ شمع کے بھائی دوسری بہن کے ہاں چلے جائیں گے۔ شمع پر بہت کام پڑ رہا ہے۔

آج بھی کوئی ملنے نہیں آیا۔ میں دن بھر نزہت کا انتظار کرتی رہی۔ خدا جانے کیا قصہ ہے۔ خوب بارش ہوئی۔ دن میں شدید گرمی بھی تو تھی۔

شام کو شمع اور صغرا رضوی صاحب کے ساتھ جا کر ظہیر کی ساڑھیاں اور نغمہ کی کچھ اور چیزیں لے آئیں۔ میں پڑھتی رہی، اپنی خودنوشت۔

۱۷؍جولائی

معلوم ہوا ٹی وی والے آئے۔ تلاش کیا گھر نہیں ملا۔ آج ریکارڈنگ تھی۔ اب اقبال نے کل ان سے وعدہ کرلیا اگرچہ میں نے سختی سے انکار کیا تھا۔ کل مجھے علی جواد زیدی کے ہاں بھی جانا ہے۔ ان سے نازش صاحب کے سلسلے میں فون پر بات ہوئی۔ اندازہ ہوا وہ کچھ نہیں کرسکتے۔ بیواؤں کے لیے کوئی فاؤنڈیشن نہیں ہے۔

آج جا کر انور اور کچھ دوسرے لوگوں کے لیے تحفے لائی۔ کتنا ہی کنجوسی کرو مگر ہوتے ہوتے یہ سب بھی سیکڑوں کی ہو جاتی ہے اور خیر یہ سب تو میں اپنی خوشی سے لیتی ہوں، رکشاؤں میں بھی بہت اٹھ جاتا ہے۔ ویسے تو اقبال کچھ خرچ کرنے ہی نہیں دیتا۔

---

[۱] مہدی حسین رضوی [۲] رضوی صاحب کی نواسی سارہ

۱۸؍جولائی

آج جو ہوا وہ کبھی نہ ہوا تھا۔ ڈھائی بجے ٹی۔ وی کے لیے روانہ ہوئے۔ گاڑی نہیں بھیجی انھوں نے۔ حالانکہ میں نے سختی سے کہہ دیا تھا مگر اقبال کی مروت۔ بہت دور۔ رکشا سے پچاس منٹ لگ گئے سخت دھوپ، طرہ یہ کہ صغرا بیگم گر پڑیں۔ خدا نے بہت خیر کرلی۔ اللہ نہ کرے خدا جانے کیا ہو جاتا۔ کسی طرح پریشان ٹی۔ وی سینٹر پہنچے۔ بجائے کسی ڈھنگ کے موضوع کے جو مجھے سوٹ کرتا اچانک تھا ''موجودہ سماج میں ادب کی افادیت''۔ اور بحث کرنے والے ساتھی میں نامی انصاری اور ابوالحسنات کانپوری کے صاحبزادے۔ اقبال بھی آ گیا۔ دو گھنٹے بعد خدا خدا کر کے ریکارڈنگ ہوئی۔ پونے پانچ بجے ختم ہوا۔ شکر کیا۔ مگر کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ مشین خراب تھی۔ دوبارہ ہوگی۔ وہ بھی اب نہیں نو بجے رات کو۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ مگر کارکنوں کی نوکری پر بن جاتی۔ میری یہ کمزوری ہے۔ ہمیشہ ایسے موقع پر رحم آ جاتا ہے۔ پھر وہ دونوں حضرات جان کو آ گئے۔ اب چار بجے صبح جانا۔ بکنگ کرانا، زیدی کے ہاں جانا، گھر جانا اور دوبارہ ریکارڈنگ۔ ماننا پڑا۔ رات گیارہ بجے گھر واپس آئے۔

علی جواد زیدی بہت ہی محبت اور عقیدت سے ملے۔ ان کی بیوی بہت بور بھی ہوگئی ہیں۔ منہ ہاتھ دھویا۔ چائے پی، باتیں ہوئیں۔ خیالات میں کافی ہم رنگی ہے۔ سلسلہ روز و شب کی صرف ایک ہی کاپی لے گئی تھی۔ انھوں نے غزلوں کا مجموعہ بدلے میں دیا۔ نسیم صاحب بمبئی گئے۔ فہیم انہونونی خط اور کتابیں کچھ تحفے میں بھیجیں۔ نزہت نے پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔ آج بیگم بھی آ گئی اور مسعود بھی۔ بہت کام پڑ رہا ہے۔ اب خیر کل صبح ہم جا ہی رہے ہیں۔ منو جو صغرا سے بہت مانوس ہے بہت اداس ہے۔ سفر سے پریشان ہو رہی ہوں۔ بہت تھک گئی ہوں۔ رکشاؤں کی وجہ سے خاص طور پر۔ حالانکہ پھر تین بار گئی۔ ٹی۔ وی والوں نے تھک ہار کر موٹر دی، ورنہ میں جاتی ہی نا۔

۲۹ر جولائی

سیدہ مجھے اور صغرا کو انور کے ہاں لے گئی۔ طبیعت اچھی نہ تھی مگر سواری مل رہی تھی، اس لیے چلی گئی۔ صغرا حسب عادت راستہ بھول گئی۔ خیر پہنچ گئے۔

ڈیڑھ گھنٹے وہاں رہے۔ اس سے پہلے انو اور صبو اولمپک کھیل دیکھ رہے تھے۔ سیدہ اور انور، صغرا اور نادی باتیں کرتی رہیں (آپس میں) اور میں ذرا دیر بیٹھتی، سنتی یا ایک آدھ لفظ بولتی رہی۔ بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ اب ہماری عمر اور دلچسپیاں اور باتیں جوان دل وغیرہ کو اپیل نہیں کرتیں یا لوگ بات کاٹ دیتے ہیں یا بے نیاز ہو جاتے ہیں (ارادتاً نہیں) محبت میں کمی نہیں مگر دلچسپی کہاں سے لائیں۔ اپنے دوستوں اور ہم عمر عزیزوں کا کتنا خیال آتا ہے۔ اب خدا عزت، صحت کے ساتھ اپنے ہاں بلا لے۔ اب بیماریاں بھی سہاری نہیں جاتیں۔

۲ر اگست

ایک رسالے کے محرم نمبر کے لیے ایک مضمون لکھنا ہے۔ شروع کرنے کی اب تک نوبت نہیں آئی۔ گیارہ بجے تک مختلف کام کیے۔ انکم ٹیکس کے کاغذات جمع کیے۔ الماریاں صاف کرائیں اور پھر بجلی غائب۔

تین بجے بجلی آئی تو ذرا دم میں دم آیا۔ آج سخت قبض، پیٹ میں درد اور بے چینی ہے۔ کمزوری بڑھتی جاتی ہے اور کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی ہے۔

ڈاک نہیں آتی۔ ظہیر، عذرا، اقبال کے خط کا انتظار ہے اور کئی کاروباری خطوں کا۔

آج ایک فلم آئی ''آخری دور''۔ بے وقوفی کی فلم تھی مگر تھوڑی دیر جی بہل گیا۔ بے ہودگی نہ تھی اور جانی واکر کا رول ہنسانے والا تھا۔

۱۶ر اگست

دن بھر لوگ آتے رہے۔
تقریر (امام حسین) پر لکھنے کی کوشش جاری۔ کھانا پکایا۔ شدید گرمی۔ بجلی بار بار غائب۔ سات بار بجلی غائب۔ شام کو بچّے فلم بھی نہ دیکھ سکے۔ صغرا کی مصروفیت، عذرا، کملیش، عینی، زہرا، سیدہ، پھول (مسز منچندا) وغیرہ وغیرہ کے چکر میں صبح سے شام ہوگئی۔

۱۷ر اگست

تقریر امام حسینؑ پر کسی طرح پوری کی!
مسز نقوی آگئیں۔ ڈیڑھ گھنٹے کے قریب ان کے ساتھ وقت صرف ہوا۔ پھر پکانے کا تھوڑا کام کیا۔ تیز بارش، پھر بجلی غائب۔ پھر شام تک سخت گرمی۔
شام کو غالب سوسائٹی ایوارڈ کے فنکشن میں شرکت۔ سخت گرمی، نہایت طویل اور بور تقریریں۔ بے حد بے تکی تعریفیں اور بار بار وہی باتیں دہرانا۔
ڈاکٹر قاسم کے پاس دو بار گئی۔ مگر ملاقات نہ ہو سکی۔ سخت ہجوم۔ آٹھ بجے واپسی۔ گرمی سے بدحواسی۔ طبیعت بہت سست اور بے چین۔ ۹ بجے کے بعد تحسین حیدر نازل۔ پرسوں کے فنکشن کے لیے بات کرنے۔ میں جانا نہیں چاہتی مگر وعدہ کر چکی ہوں مجبوری ہے۔

۱۸ر اگست

جب سالگرہ ہوئی تو عقدہ یہ کھلا
یاں اور گرہ سے ایک سال جاتا ہے
اب تو ہر سال جو گزرتا ہے شرم سے سر جھکا دیتا ہے۔ اے برس کی عمر صرف باجی کی ہوئی تھی۔

میرے ماں باپ بھائی بہن میں سے میں آج اس کو بھی پار کر رہی ہوں۔ اب زندگی میں کوئی چارم نہیں رہا۔ کام بھی کرتی ہوں تو جلدی تھک جاتی ہوں۔ چاہے وہ لکھنے کا ہو یا گھر کا یا کاغذات ڈھونڈنے کا۔ چھے دن سے میٹرک کا سرٹیفکیٹ تلاش کر رہی ہوں۔ بلامبالغہ ہزاروں کاغذات ہیں۔ اتنی الماریاں ہیں۔ کسی میں نہیں اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے اس میں لگ کر چور ہو جاتی ہوں خدایا۔ اب صحت، عزت اور خوشی کے ساتھ واپس بلالے۔ کس کے لیے جیوں؟ بھائی جان نہیں، عابد صاحب نہیں۔ صغرا دوسرے بچّے اب بھی بہت چاہتے ہیں۔ مگر اب ان کو میری ضرورت بھی نہیں۔ پھر بیماری، محتاجگی اور معذوری سے گھبراتی ہوں۔ تیری مغفرت کی طالب ہوں مولا۔ تونے عزت کے ساتھ زندہ رکھا ہے۔ وہاں بھی عزت کے ساتھ بلالے اور عزت کی زندگی وہاں بھی ملے اور میرے بچھڑے عزیز اور لقائے الٰہی کی دولت اور جب تیرا پیام آئے تو لب پر تیرا نام، دل میں تیری یاد اور محبت ہو اور تیری بخشش و کرم پر یقین۔

۱۹/اگست

طبیعت صبح ہی سے ست تھی مگر کاغذ ڈھونڈنے، کھانا پکانے، لوگوں سے ملنے کا کام جاری رہا۔ ویسے آج بزم زہرا میں امام حسینؑ پر تقریر اور جلسے کی صدارت کرنے کے لیے جانا تھا۔ ۹ بجے سے تیار، لینے والے کا انتظار۔ آخر ساڑھے بارہ بجے ارادہ ترک کیا۔ ایک بجے تحسین حیدر کی بیٹی بیٹا لینے آئے۔ اب کیا وقت رہا؟ دیر ہوگئی وغیرہ وغیرہ معذرت کر دی کہ جا نہیں سکتی۔ تھوڑا سا کھانا کھایا۔ شام کو ملنے جانے کی ہمت بھی نہیں پڑی۔ ذرا دیر فلم دیکھی۔ وہاں بھی بیٹھا نہ گیا اور پھر طبیعت بگڑتی گئی۔ بلڈ پریشر بہت ہائی، سر بھاری پتھر۔ ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ۔ ٹانگیں سُن۔ بات نہ کی جائے۔ لیجیے دنیا بھر کے خیالات یہ نہ ہو جائے، وہ نہ ہو جائے۔ سب پریشان۔ پھر ظاہر کر دیتے ہیں کہ کوئی بات نہیں۔ انیس کو اکیلے میں بلا کر بات کی۔ حالت بگڑے تو اسپتال نہ لے جانا۔ ماتھر کو گھر پر بلالینا۔ وہ بچاری چپ چاپ سنتی رہی۔

دو گولیاں لیں سکون کی، ایک نیند کی۔ بلڈ پریشر کی۔ درد کی کھا کر رات کو جیسے تیسے گزارا۔ اگلے دن (۲۰ کی صبح) بہتر تھی۔ دیر سے ناشتہ کیا۔ زہرا کی طبیعت بھی کل سے خراب ہے۔ اسے بھی دیکھنے نہ جاسکی۔ دن بھر لیٹے ہی گزرا۔

۲۲ /اگست

رات دو گولی کھائیں۔ پھر بھی نیند پوری نہیں ہوئی۔ رات کو تھوڑی بارش ہوئی۔ دن میں مگر موسم سخت ہے۔

صبح کو بیگم سفارش حسین آ گئیں۔ عین کام کے وقت دیر تک بیٹھیں۔ یوں بھی کسی سے رکھائی کرنا مشکل ہے اور وہ تو پرانی ملنے والی ہیں۔ ان کے مسائل ہیں بچاری کے۔

غلام حیدر کی کتاب پر مختصر تبصرہ لکھ کر مکمل کیا۔ امام حسین کی پیدائش کی تقریر کو ٹھیک ٹھاک کیا۔ قومی آواز کے اڈیٹر سے فون پر بات کی اور پھر اس مضمون کو لکھنؤ عشرت علی صدیقی کو بھیج دیا اشاعت کے لیے۔

عزیز قریشی کا صبح سے انتظار تھا۔ ڈھائی بجے صغرا آئیں۔ معلوم ہوا نہیں آئیں گے یا شاید شام کو آئیں۔ شام کو امید قطع ہو گئی کھانا کھالیا۔ رات کو دس بجے میں تو لیٹ چکی تھی۔ عزیز قریشی آئے۔ لڑکیوں اور رضا وغیرہ نے کھانا کھلوایا اور پھر بسیرا[1] پہنچا دیا۔

۵ /ستمبر

آج جاں ہار مختار کی برسی ہے! صغرا نے ایک جوڑا بنا کر اللہ نام کا دیا ہے۔ مجلس کرنا چاہتی ہوں مگر نہ آج نہ پرسوں کر سکتی۔ دیکھیں کب ہوتی ہے۔ بارش، تہوار (ہمارے ہاں نہ کبھی دوسروں کے ہاں) اور سڑک نالا بنی ہوئی، کسی کو بلائیں بھی تو کیسے۔

---

[1] خواجہ غلام السیدین کا چھوٹا گھر

آج نذیر بھیا علی گڑھ جا رہے ہیں۔ قیصر آئے تھے چلے گئے۔ عینی جو کل آئی تھیں اور تین گھنٹے گپ مار کر گئیں وہ بھی علی گڑھ جا رہی ہیں۔ اور تو اور صفیہ بھی جا رہی ہیں اور کل رات کو رضا بھی! کس پر زور ہے؟ کس پر دخل ہے؟ جس کا جو جی چاہے کرے۔ پوچھنے کی زحمت بھی کم ہی کوئی گوارا کرتا ہے۔

بجلی آج پھر غائب رہی۔ تین بجے سے ساڑھے نو بجے تک۔ ذرا دیر کو زیدی صاحب کے ہاں گئی۔ ان کے لیے لوٹا منگایا تھا۔ پسند آیا انھیں۔ چھدو بیٹھی تھی۔ وہی جامعہ کے مسائل۔ وہ بچارے تو جمال[1] کی تعریف ہی کرتے ہیں۔

زہرا چند منٹ کو آئی، صغرا نہیں تھی۔ تھوڑی دیر میں واپس چلی گئی۔

۱۹ر ستمبر

کھانسی، دمہ، سینے میں سخت درد۔ سیدہ ڈاکٹر عاصمہ کو لائی۔ کچھ دوائیں دیں۔ ہولی فیملی دکھانے کا مشورہ دیا۔ ڈاکٹر ماتھر کو فون کیا۔ کل بلایا ہے۔ دوائیں زیادہ ہوگئی ہیں۔ اس کا بہت اثر ہے۔

۲۰ر ستمبر

ڈاکٹر ماتھر نے دیکھا۔ نمک بالکل بند (پہلے ہی کون سا ملتا تھا) مکمل آرام۔ گھر پر رہو مگر احتیاط۔ کارڈیوگرام کراؤ گی۔ ''اگر آپ چاہیں ویسے میرے پاس فالتو پیسے نہیں۔'' ''اچھا گھر جاؤ آرام کرو۔ نمک بالکل بند۔''

''ڈاکٹر صاحب کل جلسہ ہے اس میں......''

''نہیں''۔

---

[1] جمال قدوائی

''ڈاکٹر صاحب ۲۴ کو ریڈیو پر تقریر ہے۔''

''پیر کو تم مجھے دکھاؤ، پھر کچھ سوچنا۔''

چنانچہ اب ہم بر سرِ دارِ بستر ہیں۔ بے نمک کی یا میٹھی چیزیں کھا رہے ہیں۔ اس مٹھاس کا صغرا پر زیادہ اثر پڑا ہے۔ آج اردو اکیڈمی میں اس کے افسانے کا فنکشن ہے۔ اپنی قسمت میں یہ خوشی بھی نہیں۔

معلوم نہیں کب بیماریوں کا یہ سلسلہ ختم ہوگا۔ نہ جیتے بنتا ہے نہ اللہ میاں بلاتا ہے اور اب تو دوا اور لگ گئے۔ نجو کی شادی اور صفیہ کے بچے۔ اُف یہ انسان کی ہوس۔ حالانکہ خدا نے بارہا کہا ہے بال اور اولاد اور دنیا کی دلچسپیاں بالکل بیکار ہیں۔ اصل چیز عاقبت کی فکر ہے۔ مگر اپنے بندوں سے محبت اور سلوک! یہ بھی تو اسی کا ہی فرمان ہے۔

۲۳ر ستمبر

طبیعت بہتر مگر اینٹی بائی ٹکس کی وجہ سے بھوک بالکل بند اور گیس۔ اوپر سے نمک بند۔ خواہش ناپید! کمزوری بڑھ رہی ہے۔

آج نادی انو ملنے آئے۔ ظہیر نے خط اور دوا بھیجی ہے۔ صغرا کو ساڑھی۔ معلوم ہوا عباسی اور اس کے گھر میں سب بیمار ہیں۔ خدا رحم کرے۔

تقریر کو کچھ ٹھیک ٹھاک کیا مگر پسند نہیں آئی۔ بہر حال۔

رات کو صدیق آئے۔ ان سے اردو اکیڈمی کے بارے میں بات چیت ہوئی۔ ہم دونوں کی یہ خواہش اور اصرار ہے کہ خصوصی انعام اس بار مجیب صاحب اور حمیدہ سلطان کو ملنا چاہیے۔

۳ر اکتوبر

۱۱ر محرم ختم ہوگیا۔ محرم، امام کے نام کے مقدس دس دن۔ میری طبیعت اس قابل نہیں

رہی۔ بہرحال سات مجلسیں پڑھیں۔ شامِ غریباں کی مجلس سب سے زیادہ پر اثر ہوتی ہے۔ شبو چار دن سے آگئی ہے۔ اس کی وجہ سے سوز سے پڑھنے میں جان پڑگئی۔ نغمہ بھی ساتھ ہے۔

عشرے کی نذر، کھچڑی وغیرہ پکی۔ شام کو مجلس ہوئی۔ صبح کو میں نے سب کو اعمال کرائے۔ میں وہاں پانی پت میں سب کو اعمال کرایا کرتی تھیں۔ قرول باغ سے یہ خدمت (جب اچھی ہوئی ہوں) انجام دیتی رہی ہوں۔ زیادہ خواتین ہوئیں تب بھی صرف میں انیس اور شبو ہوئے تب بھی۔ شام کی زیارت عابد صاحب پڑھاتے تھے۔ ان کے بعد میرن صاحب پڑھانے لگے۔ اب وہ دونوں خدا کو پیارے ہو گئے۔ اس سال میں نے پڑھائی۔ دیکھیں اگلے سال کون پڑھاتا ہے۔

۱۱ر محرم کو سوئم کی مجلس کر لی کہ رعنا آج جانے والی ہے۔ کل شمع اور منو[1] جا رہی ہیں۔ پرسوں بیگم کے ہاں کی مجلس ہے۔ اس میں مجھے پڑھنا ہے۔ سخت کام ہے اس مجلس میں پڑھنا مگر بیگم کی خواہش ہے اس لیے پڑھنی ہی ہے۔

۳ر نومبر

آج ہماری پیاری اندرا گاندھی کا انتم سنسکار، آخری رسوم بھی ادا ہو گئیں۔ بلا مبالغہ لاکھوں نے تو تین دن دو رات ویسے درشن کیے اور لاکھوں آدمی دس کیلو میٹر کے راستے پر کھڑے تھے۔ عورتیں اور بچے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ اندرا گاندھی کے نعرے لگ رہے تھے۔ لگتے رہے لگتے رہے۔ ہم نے تو سب کچھ ٹی۔ وی پر دیکھا۔ مشتِ خاک، خاک یا راکھ میں مل گئی۔ مگر اندرا ابھی صدیوں زندہ رہے گی۔ ایسی عورت، ایسی بہادر، ایسی قوت والی عورت۔ اس نے دنیا کی عورتوں کا سر اونچا کر دیا اور اس کی خدمات تو اب دھیرے دھیرے ہی سامنے آئیں گی۔ مگر یہ غلام ذہنیت والے ہمیشہ ننگ شام بن جاتے ہیں۔ پنجاب میں سکھوں

---

[1] سارہ مہدی

نے بہت سر اٹھایا، ہزاروں کو مارا، کروڑوں کا نقصان کیا۔ ایک طرح سے بغاوت ہی کی اور جب اس کا تدارک کرنا چاہا تو اندرا جی کو شہید کر دیا۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ لوگ سب سکھوں، سب عورتوں، بچوں، بے قصور، بے گناہوں کو مارنے اور جلانے اور وحشت و بربریت دکھانے پر تُل جائیں۔ راجیو گاندھی اور دوسرے لوگ اپنی طرف سے ہر کوشش کر رہے ہیں۔ دلّی میں تو فوج کی سب بکتر بند گاڑیاں بھی کچھ آ گئی ہیں۔ یوں تو ہندستان کے بیشتر حصوں میں فساد پھوٹ پڑا ہے۔ ہر جگہ کوششیں جاری ہیں۔ ماں کی میت کو اگنی دینے اور ڈھائی تین دن تک اس کے پاس کھڑا رہنا راجیو گاندھی کی ہمت اور عزم کا بے پناہ نمونہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا ایک اسٹیچو کھڑا ہے جو کبھی کبھی حرکت میں آجاتا ہے۔ بیوی، بیٹی، بیٹا اور بعد میں نیچے کا حصہ بچہ اور خاندان کے جانے کون کون لوگ علاوہ پنڈتوں کے موجود نظر آتے رہے۔ سنا ہے کہ کل راجیو نے گڑبڑ والے علاقوں کا دورہ بھی کیا۔ ٹینگ بھی بلا رہے ہیں۔

۴رنومبر

کچھ کام کرنے کی کوشش کی۔ لکھنے پڑھنے کا کام بالکل نہیں ہو رہا۔ بس ٹی۔وی، ریڈیو یا عبادت تھوڑی بہت۔ ٹہلنے بھی شام کو گئی۔ طبیعت پر بہت اثر ہے۔ دلی میں اب حالات بہتر ہیں مگر پورا اطمینان نہیں۔ دلی کا لیفٹیننٹ گورنر بدل دیا گیا ہے۔ راجیو گاندھی، ہوم منسٹر اور وہ سخت اقدام کر رہے ہیں۔ ملک کے اور حصوں میں بھی حالات بہتر ہیں مگر کتنے؟ یہ خدا ہی جانے۔ لوگ جن میں موصوف پیش پیش ہیں۔ طرح طرح کی خبریں دے کر پریشان کر رہے ہیں۔ مگر ہم خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں اور اپنے ملک کے مستقبل کے لیے دعا کرتے ہیں اور یہ امید کہ راجیو اور دوسرے لوگ سنبھال لیں گے۔ عام خیال (گھر میں بھی) یہ ہے کہ اب خالصتان ضرور بنے گا اور جنگ ہوگی۔ (خدانخواستہ) پاکستان سے۔ میرا خیال اور بلکہ تقریباً یقین ہے کہ اب خالصتان نہیں بنے گا اور نہ جنگ ہوگی کم سے کم مستقبل قریب میں۔ خدا اس عقیدے کی لاج رکھے۔

۵؍نومبر

۵؍نومبر صبح۔ رات نیند بہت کم۔ بہت بے چین رہی۔ دوائیں کئی دن سے نہیں تھی۔ شاید اسی کا اثر تھا۔ صغرا کل دوائیں لے کر آئی۔ آج شب بازار اور کرفیو دونوں کھل گئے ہیں۔ رات بلکہ صبح ہوتے میں نے اندرا گاندھی کو خواب میں دیکھا۔ جیسے میں اور میرے ساتھ اور کئی خاندان کے لوگ ان کے پاس سنجے کی تعزیت کو گئے ہیں اور بہت تلاش کے بعد وہ نظر آتی ہیں۔ بھاری جسم، سفید کھدّر کی ساڑھی۔ ہم ان سے کہہ رہے ہیں کہ ہمیں اندرا گاندھی سے ملنا ہے اور وہ کتاب جو سب سے پہلی کتاب ان پر چھپی ہے، انھیں پیش کرنا ہے۔ تو وہ کہتی ہیں کہ اِدھر سے نہیں تم اُدھر سے مشرقی (اب یاد نہیں کیا کہا تھا) دروازے سے آؤ۔ تب ملاقات ہوسکتی ہے۔ میں حیران ہوں کہ کھڑی تو ہیں پھر ملاقات کیوں نہیں ہوتی۔ پھر جانے کیا ہوتا ہے کہ وہ ایک کرسی پر بیٹھی ہیں اور میں ان کو کتاب اور کچھ اور پیش کر رہی ہوں۔ کتاب پر قیصر اور بیگم کا نام ہے اور پھر آنکھ کھل جاتی ہے۔ کیا مطلب ہے اس خواب کا۔ عقل حیران ہے۔

صبح مختلف کام کیے۔ لوگ آتے فون کرتے اور افواہیں سناتے رہے۔ زیدی صاحب آئے۔ انھیں ناشتہ کرایا۔ ذکیہ آئی، اسے کھانا کھلایا (گھر میں کھانے کو بہت کم، چیزیں مل نہیں رہیں اور ملتی ہیں تو خراب اور بہت مہنگی) تین بجے عزیز[1] آئے۔ اس قدر ان پر اثر ہے کہ کیا بتایا جائے۔ سخت صدمہ ہے۔ ساڑھے آٹھ تک رہے۔ بمشکل چائے پر تھوڑا سا کھایا۔ کچھ آرام کیا۔ زہرا[2] سے کچھ بحث رہی مگر میرے سمجھانے کا بہتر اثر ہوا۔ میں نے انھیں ’نراس میں آس‘ ان کو پڑھنے دی۔ عابد صاحب، ذاکر صاحب اور دوسرے لوگوں کی مثالیں دی ہیں کہ کس طرح ۴۷ء میں انھوں نے اپنے اپنے انداز میں خدمت کی۔

---

[1] عزیز قریشی [2] گورنر اتراکھنڈ

اندرا جی پر لکھنا چاہتی ہوں مگر ابھی تک دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔ آشا کی کرن بلکہ سورج میرے دل میں تو روشن ہے۔ مجھے تو اپنے دیس باسیوں کی اکثریت پر، نیک لوگوں پر، کسی حد تک حکومت پر، خود اور ذاتِ باری تعالیٰ پر جو سب کا رکھوالا، سب کا محافظ ہے بھروسہ ہے۔ یہی بھروسہ ایسے سخت وقتوں میں ساتھ دیتا ہے۔ دنیا اسی کی ہے اور اس سے بڑھ کر اس کی رکشا کرنے والا کون ہے۔ کون ہوسکتا ہے؟

۷ رنومبر

مسز گاندھی پر مضمون مکمل کرلیا۔ پورے پانچ صفحے فل سائز کے۔ عنوان رکھا ہے ''اندرا۔ زندہ ہے۔'' لیکن کوئی آدمی نہ ملا جو قومی آواز کے دفتر پہنچا دے۔ کل پھر کوشش کروں گی۔

ٹی وی پر اندرا جی پر بہت اچھے انٹرویو آرہے ہیں۔ پہلی بار ٹی۔ وی کی افادیت کا احساس ہوا ورنہ فضول پروگرام ہی زیادہ ہوتے ہیں۔ راجیو گاندھی بہت مضبوطی، سمجھداری اور عزم سے کام کر رہے ہیں۔ خدا ان کی رکشا کرے۔ یہ ہمارے دشمن ملک جو اندر خانہ ہماری دشمنی کر رہے ہیں۔ خدا ان سے محفوظ رکھے۔

رعنا صبح آئیں۔ ان کے پرس سے ایک سونے کا ہار اور چھ سو روپے کسی نے بس میں نکال لیے۔ ماں اور بچے کی بری حالت تھی۔ یہ سب سے قیمتی اور بھاری زیور تھا جو اسے جہیز میں ملا تھا اور وہ اسے نجو کو دینا چاہتی تھی۔ خیر اس نے تو اپنے کو سنبھال لیا۔ اگرچہ بہت دکھ ہے مگر سارے گھر کو غم ہوا۔ صغیر کو تو بہت ہی قلق معلوم ہوتا ہے۔ فوراً باہر اور گھر چلے گئے۔ مگر اس وقت دلی اور ہندستان میں جو ہورہا ہے خدا نے جان بچائی، عزت بچائی گھر بچایا۔ ہمارے ہاں تو کہا ہی جاتا ہے جان کا صدقہ مال۔ مگر میرے اعصاب اور ذہن پر بہت اثر پڑا۔ رات کو نیند نہیں آئی۔ زیدی صاحب کے ہاں پڑھنے کا بھی اثر تھا کہ طبیعت صاف نہ تھی مگر وعدہ کر چکی

تھی۔ میری طبیعت دو تین دن سے پھر بگڑ گئی ہے۔ ذہن اور اعصاب متاثر ہیں۔

۸ر نومبر

کل قومی آواز کو اپنا مضمون ''اندرا گاندھی۔ زندہ ہے'' بھیج دیا۔ ایک اور مضمون لکھنا شروع کیا ہے۔ دیکھیں بنتا ہے یا نہیں۔ کلام پاک عابد صاحب کو بخشنے کے لیے شروع کیا ہے۔ انھیں چیزوں سے دل کو تسلی ملتی ہے۔ ویسے کہا تو یہی جا رہا ہے کہ شہر اور دیس میں شانتی بہت کچھ قائم ہوگئی ہے۔ لیکن فوج اور پولیس کے ہٹنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ صدیقی صاحب کے ہاں سے نئی دنیا اور پرتاپ لے کر آئی۔ انھیں پڑھ کر ذہن اور الجھ گیا۔ خدا راجیو کو اور ہندستان کے دشمنوں سے ہم سب کو بچائے۔ بعض مسلمانوں کے ذہنوں میں جو نفرت اور غصہ بھرا ہوا ہے (جس کی وجہ بھی ہیں) وہ کسی طرح نہیں نکلتا۔ مگر اس کا اظہار غلط وقت اور غلط طریقے سے ہو تو غصہ آتا ہے۔ انسان کو انسان کی حیثیت سے نہیں، خانوں میں بانٹ کر دیکھا جاتا ہے۔

کل گرونانک جی کا جنم دن تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ امن کے ساتھ منا لیا گیا۔ گردواروں میں ہندو سکھوں نے مل کر پاٹھ کیا۔ اس کے جلوس سارے شہر میں نکلے جس میں دونوں تینوں فرقوں کے لوگ عورتیں اور بچے بھی تھے۔

عزیز کی پرسوں سے خبر نہیں ملی۔ ہم لوگ پریشان ہیں۔ خاص طور پر ان کے دوست بھی پریشان ہیں۔ خدا جانے کیا قصہ ہے؟ کہیں طبیعت نہ خراب ہوگئی ہو۔

آج معلوم ہوا صفیہ کی گھڑی چوری ہوگئی۔ روز ایک نہ ایک نقصان۔ خدا جانے کون ایسے ڈاکو گھس آئے ہیں۔ نصیر کو بہت سمجھایا ہے۔ معلوم تو نہیں ہوتا۔ لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

۹رنومبر

صبا[1] اور ان کی لڑکیاں ملنے کے لیے آئیں۔ غزالہ[2] بھی آئیں اور کئی لوگ آئے۔ ہاں احمد جمال پاشا پاکستان سے آئے۔ کئی گھنٹے رہے۔ کھانا کھایا۔ ظہیر کا خط لائے ہیں۔ وہ اگرچہ مصروف اور پریشان ہے مگر میری کتاب پڑھ ڈالی ہے اور ظاہر ہے بہت متاثر ہے اور تعریف کی ہے۔ ہم لوگوں کی طرف سے پریشان ہے۔ کیسے اُسے خیریت بتائی جائے۔ فون تو ملتے ہی نہیں ہیں نہ وہاں سے نہ یہاں سے۔

میں نے ایک اور مضمون شروع کیا ''اندرا۔ عورت کی آن، نسوانیت کی شان''۔

رعنا کل چلی جائے گی۔ میاں نے بلالیا ہے۔ خدا کرے سب خیریت رہے۔ ویسے کل بھی چھٹی ہے، پرسوں بھی۔

طبیعت ان دنوں بیگانۂ غم ہوتی جاتی ہے
مرے حصے کی جیسے ہر خوشی کم ہوتی جاتی ہے

۱۰رنومبر

میرا مضمون ''اندرا جی۔ زندہ ہیں'' قومی آواز کے ہفتہ وار (رسالہ) میں آج آگیا۔ جن لوگوں نے پڑھا بہت تعریف کی۔ عزیز قریشی کا خیال ہے کہ انگریزی ترجمہ ہونا چاہیے۔ مگر اپنے لیے یہ سب کون کرے؟ کبھی کسی نے نہیں کیا۔ یہ پرچہ بہت اچھا نکلا ہے۔ ابرار قدوائی کا مضمون خط جو لکھا نہ جاسکا بہت فکر انگیز ہے۔ ہاجرہ بیگم کا مضمون بہت اچھا ہے اور بھی کئی مضمون بہت خوب ہیں۔ نظمیں بھی بعض اچھی ہیں۔ ہر دل سے ایک ہی آواز اور صدا دیتی محسوس ہوتی ہے۔ خدا ان کی قربانی رائیگاں نہ کرے۔ کل عزیز قریشی ہمیں کملیش[3] اور ذکیہ[4] کے ہاں لے

---

[1] مسز شمیم حنفی [2] غزالہ انصاری [3] کملیش صغرا مہدی کی دوست [4] نواسی بھانجی کی بیٹی

گئے۔ تھوڑی دیر رہے۔ کل جامعہ والے اور کمیونسٹ انجمن مارچ نکالنے والے تھے۔ (سوسو کر جاگنا اسے ہی کہتے ہیں) پولس نے منع کر دیا عین وقت پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب کو مایوسی ہوئی۔ خیر ریلیف کا کچھ کام ہو رہا ہے۔ جامعہ ہائر سیکنڈری اسکول کے بچے انٹرویو لینے آئے تھے۔ صبا تو انٹرویو کی دھمکی دے کر رہ گئیں۔ وہ تو صرف اپنے خاندان (محدود دائرہ) اور وی۔ آئی۔ پی کو نوازتی ہیں۔ میری طبیعت بہتر ہے۔

۲۸ر نومبر

رات سے صغرا کو سخت چکروں کا دورہ پڑا۔ رات سے پڑی ہوئی ہے۔ دوا موجود تھی، دی، کھانا کھلایا۔ رات کو دوا دی۔ اُٹھ کر دیکھتی رہی۔ وہ بیمار ہوتی ہے تو میں اپنی بیماری بھول جاتی ہوں۔ پریشان تو کبھی کی بیماری میں ہو جاتی ہوں۔ اس کا صدقہ نکالا۔ رعنا نے نجو کی کچھ چیزیں اور خرید کر بھیجی ہیں۔ اللہ نام کا سوئٹر پورا کر لیا میں نے اور انیس نے۔ اب دوسرا شروع کر رہی ہوں۔

ہماری زبان سے ایک ارجنٹ خط آیا کہ بیدی پر کچھ لکھ کر بھیجو۔ لکھا۔ مگر پھر کوئی لینے نہیں آیا۔ نہایت غیر ذمہ دار لوگ ہیں۔ اب تک اندرا نمبر نہیں نکالا۔ مضمون مانگنے کے لیے اتنی جلدی تھی۔ اب بیدی اور فیض پر عنایت ہے۔ دیکھیں نکلے گا یا نہیں۔

کل غالب اکیڈمی میں فیض کی تعزیت کا جلسہ ہے۔ اگر زیدی صاحب گئے اور صغرا ٹھیک رہی تو میں بھی جانا چاہتی ہوں مگر ۶ بجے جلسہ ہے۔ بہت دیر ہو جائے گی۔

رجسٹری واپس مل گئی۔ دماغ کس قدر الجھ گیا ہے۔ اچھا خاصا صحیح پتا لکھا تھا مگر سمجھا کہ نام غلط لکھ دیا۔ اب دوبارہ ہوگی۔ دیکھیں وہ لوگ کیا کرتے ہیں۔

قومی آواز سے وہ نمبر نہ ملا جس میں مضمون چھپا تھا۔ لوگ اس قدر جھوٹ کیوں بولتے ہیں خدایا؟

۲۹ر نومبر

صغرا کے چکروں کا وہی حال رہا۔ کھانا وغیرہ کچھ اس نے پکا دیا تھا۔ اب صبح سے میں دیکھ رہی ہوں۔ شبو آ گئی ہے اور ہُما بھی آئے گی۔ خیر یہ سب تو ہو جائے گا۔ میری اور صغرا کی طبیعت ٹھیک رہے۔

انجمن ترقی اردو کی ممبر شپ پھر مل گئی۔ میں نے کوئی کوشش نہ کی۔ تین چار مبارک باد کے خط بھی آئے۔ خیر کام وام تو خاک نہیں ہوتا۔

صغرا کی آج طبیعت خراب رہی۔ کملیش بہت دیر رہی۔ شبو آئی تھی۔ دن بھر رہی۔ دوپہر کو ہما بھی آئی۔ کچھ میں نے پکا لیا تھا پھر صغرا نے اُسی حالت میں بہن کے لیے پکایا۔ شام کو میں نے سالن پکایا۔

آج رات بہت بے چین گزری (۳۰ کی رات) بار بار پیشاب، مچھر، نیند غائب۔ بلڈ پریشر بھی غالباً زیادہ رہا۔ جوڑوں میں درد شروع ہو گیا ہے، خدا خیر کرے۔

۱۱ر دسمبر

آج ناصر رضا کے ہاں میلاد تھا۔ وہاں رفیعہ منظور الامین سے ملاقات ہوئی۔ مڈل ایجڈ خاتون ہیں۔ مگر بہت اسمارٹ، مہذب اور خوش شکل ہیں۔ بہت ہی محبت اور خلوص سے ملیں۔ اپنے ہاں کے مولود کا اعلان کیا۔ کل کی مجلس کے لیے سب سے کہا۔ کلامِ پاک بخشنے کے لیے جو شروع کیا تھا وہ کل صبح ختم ہو جائے گا۔ رات عجب بکھرے بکھرے خواب دیکھے۔ نیند کی اسٹرائک موڈ کی وجہ سے ذہن میں خواب اب کلیر نہیں ہوتے۔ مگر ہر خواب میں عابد صاحب کی جھلک ضرور تھی۔

کل کے لیے مضمون ٹھیک ٹھاک؟ شاید ۱۳ کو شبو اور رعنا آ جائے۔ اقبال کا خط

آیا۔ ہم اس کے خط اور فون کے انتظار میں رہے اور میں تو خط بھی لکھتی رہی مگر اُسے نہیں ملے۔ اس کی طبیعت صاف نہیں، فکر ہے۔ آج فون بھی خراب ہوگیا۔ طبیعت بہت اداس و پریشان ہے۔ خدایا۔ یہ موتِ فراق کب تک؟ کب تک؟ کب تک؟

۱۶/ دسمبر

پورا دن ہنگامہ کا۔ صبح سے صفائی وغیرہ۔ مولود کا تبرک بنانا۔ گیارہ سے پہلے ہی اصغر[1] اور اس کی ممانی آگئیں۔ صفیہ انیس بچاری پکانے میں۔ صغرا نے بھی کچھ پکایا۔ ان سے بات چیت ہوئی۔ ۱۱/ جنوری ۸۵ء شادی کی تاریخ فی الحال طے ہوئی ہے۔ سخت سردی ہوگی۔ خدا مالک ہے۔ اور پھر دیکھتے ہیں تو زاہدہ[2] اور پھر ساجدہ[3] اور پھر صبا[4] چلی آرہی ہیں۔ وہی اکھڑا اکھڑا ظاہری انداز، تکلیف دہ باتیں خواہ سیاست کی ہی ہوں۔

انو[5] نادی[6] صبو[7] تو بلائے ہوئے تھے وہ بھی آگئے۔ زاہدہ نے فرمایا اب آپ کے لاڈلے عزیز آگئے۔ اب ہم جارہے ہیں۔ میں نے کہا میں تو نہ کسی کی خود لاڈلی ہوں نہ کوئی میرا لاڈلا ہے۔ خیر وہ لوگ چلی گئیں۔ انیس کی طرف کھانا ہوا۔ ہماری طرف میلاد کا انتظام ہوا۔ پچاس کے قریب خواتین آئیں۔ میں نے نجو، صغرا اور ممّی[8] اس کی بیٹی وغیرہ نے پڑھا۔ میلاد بہت عمدہ ہوا اور صرف ایک گھنٹے کا۔ تبرک وافر ہی رہا۔

نجو کی مہمان بس ایک کیلو لڈو لائی تھیں۔ ہم نے دو کیلو مٹھائی ساتھ کردی اور لڑکے کو دو ہزار روپے کپڑوں وغیرہ کے لیے دے دیے۔ خاصے غریب اور تھوڑے پھوہڑ اور بے حوصلہ معلوم ہوتے ہیں۔ لڑکے پر خاندان کا بار بھی ہے۔ صغرا دلگیر ہے مگر میں سوچتی ہوں لڑکا اچھا ہو اور سسرال۔ گزارا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ جانے کیا قصہ ہے۔ اقبال کے دوست اور صغیر کے بھائی کو فون کردیا تھا۔ رعنا کو پرچہ بھیج دیا ہے۔ خدا ساتھ خیریت کے یہ عرصہ طے کرائے۔

۱۔ نزہت مہدی کے میاں ۲۔ زاہدہ زیدی ۳۔ ساجدہ زیدی ۴۔ صبا زیدی ۵۔ انور عباس ۶۔ نادرہ عباس ۷۔ صبوحی انو کی بیٹی ۸۔ جمال فاطمہ

۲۳ر دسمبر

کام جاری ہے۔ طبیعت بہتر ہے۔ صغرا کی طرف سے پریشانی ہے۔ کان کے ڈاکٹر نے الجھن میں ڈال دیا ہے کہ خدانخواستہ کوئی دل کی تکلیف ہے۔ پریشان ہوں۔ دعا کر رہی ہوں، دعائیں پڑھ رہی ہوں۔

آج کئی دن بعد ذرا سی فرصت ملی ہے کہ روزنامچہ لکھوں۔ صدارتی تقریر (جلسہ ملا صاحب) مکمل کرتی رہی۔ نجو کی شادی کے سلسلے میں صلاح مشورے، اختلافاتِ خیال سب میں جاری۔ اُسے سنبھالنا۔ کپڑوں وغیرہ کو ٹھیک ٹھاک کرنا۔ جوڑے گئے ہیں ان کی تکمیل کے لیے انیس وغیرہ سے اصرار۔ غرض۔ سب چیزیں۔ کیوں؟ دلچسپی۔ شوق؟ محبت؟ یا زندہ رہنے کا بہانا۔

۲۴ر دسمبر

صبح صبح ووٹ دینے گئے۔ لوگ کافی کم تھے۔ دو چار جگہ کے سوا۔ ویسے پولنگ پُرامن رہا۔ کہتے ہیں 61 فیصدی ووٹ پڑے۔ اب نتائج کب سے آئیں گے۔ کیا ہوگا؟

صغرا نے اپنے دوستوں مسز منچندا، ان کی بیٹی، میاں، عذرا مجیب کی دعوت کی تھی۔ مسز منچندا کا خاندان بہت پسند آیا۔ صغیر آئے۔ ان سے کچھ فرنیچر وغیرہ کی بات ہوئی۔ آج عذرا رضا کو خط لکھا ہے۔ اس کی ماں کو لکھ چکی ہوں۔ بہت تکلیف دہ صورتِ حال ہے۔ اُف! کوئی گھر میں نہیں ہے۔ سب پریشان ہیں۔ جالب کو بھی خط لکھا ہے۔ ان کا بھی ایک تکلیف دہ خط آیا ہے۔ کل تک ڈاک خانے بند ہیں۔

۲۵ر دسمبر

ان اللہ مع الصابرن۔ والصبر ان اللہ یحب المحسنین۔ حم

وانت ارحم الراحمین۔

خدا خاتمہ بخیر کرے۔

تیری دنیا میں دل لگتا نہیں ہے
میرے مولا مجھے واپس بلا لے

☆☆☆

1985

یکم جنوری

شاہد علی خاں نے حیاتِ عابد کی اڈوانس کاپی تیار کر کے بھیجی۔ شکر ہے کہ یہ کتاب میری زندگی میں چھپ گئی۔ صغرا نے اس پر جان توڑ محنت کی ہے اور شاہد علی خاں نے چھپوانے میں اگرچہ دیر لگائی مگر بہت جاں فشانی سے چھاپی۔ خدا کرے اس کی وہ قدر ہو جو ہونی چاہیے۔

کتاب شروع کی سخت تکلیف کی حالت میں۔ معلوم ہو رہا تھا کہ حسبِ دستور عابد صاحب میرے برابر بیٹھے ہیں۔ میرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنے ایک ہاتھ سے مجھے طاقت دے رہے ہیں۔

۲ر جنوری

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

سخت سردی۔ بیگم وغیرہ آگئیں۔ رعنا چلی گئی۔ ۳۰ کو اقبال، شمع، منّو آ گئے۔

کتاب پڑھ رہی ہوں۔ بہت اچھی بن گئی ہے۔ آخری باب پڑھتے وقت دو گھنٹے آنکھوں سے دریا بہتے رہے۔ اب تو کوئی ان آنسوؤں کو پونچھنے والا نہیں۔

۷ر جنوری

مسعود حسین خان کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ، نارنگ کو ہندی اور عینی کا لکھنؤ میں ایوارڈ ، ذیل سنگھ نے اردو کے بارے میں بہت اچھی تقریر کی۔

۸ر جنوری

دن روشن اور گرم ہو گیا ہے۔ مشوری کی مدد سے غسل کر لیا۔ طبیعت بہت ہلکی ہو گئی۔ مگر کمزوری بہت بڑھ گئی ہے۔ آج ایران کلچرل ڈیپارٹمنٹ سے ایک صاحب خط لے کر آئے وہ لوگ مجھے ایران بھیجنا چاہتے ہیں۔ کسی وفد کے ساتھ۔

ایران! خمینی۔ جنگ۔ شیعیت کا بیڑا۔ اسلام کے نام پر غیر اسلامی حرکتیں۔ خوں ریزی۔ وہ ایران ہو یا عراق! میں کچھ نہ کر سکوں مگر اپنے عقیدے اور اصولوں پر قائم تو رہ سکتی ہوں۔ اپنی عمر اور صحت کا عذر کر کے انکار کر دیا۔

مسرور جہاں کا لڑکا ان کے افسانوں کا نیا مجموعہ لے کر آیا۔ واقعی مسلسل لکھ رہی ہے اور اچھا خاصا لکھتی ہے۔ بہت محبت اور خلوص کرتی ہے۔

۱۱ر جنوری

صبح سے لے کر رات کے آٹھ بجے تک شادی کا ہنگامہ رہا۔ برات، عورتیں، قریبی مہمان۔ شام کو چالیس سے زیادہ عورت مرد، بے انتہا شور، کھانا، ایٹ ہوم، نکاح، رخصتی، رسمیں، عورتوں لڑکیوں کے بے پناہ ہجوم، تحفے، روپے۔

دماغ، جسم دل سب پر سخت اثر مگر بے حد برداشت اور ہمت سے کسی طرح سب سہا۔ نجو کو رخصت کیا مگر مہمانوں کو کیسے رخصت کیا جائے۔

دولھا، سسرال والے سب اچھے ہیں اور بہت خوش اور مرعوب ہیں۔ انتظام سے جہیز سے، دولھن سے۔ بری بھی اچھی آئی۔

اب خدا ان کو شاد آباد رکھے۔ رعنا ساتھ گئی ہے۔

۱۲؍جنوری

رعنا صبح آ گئی۔ اقبال، صغیر اور بچے نجو کو دو پہر لے آئے۔ دولھا دولھن ایک دوسرے سے بہت خوش معلوم ہوتے ہیں۔ مہمانداری اور ہنگامہ ابھی جاری ہے۔ انیس بالکل چور ہو گئی ہیں۔ صفیہ نے اس حال میں بے حد کام کیا۔ صغرا رعنا نے تو خیر کیا ہے اور باہر قیصر، صغیر، رضا، اقبال اور سب سے زیادہ ان کے دوستوں نے بے حد محنت کی اور جامعہ کے بزرگوں نے بھی سرپرستی کی۔ اب خدا سب کو خوش رکھے۔ دن کاموں اور گھر کو سمیٹنے میں گیا۔ میری طبیعت بہتر ہے۔

کل اندر جیت لال کا انگریزی کا سلسلہ روز و شب پر نیشنل ہیرلڈ میں ریویو آیا۔ بہت اچھا ہے۔ آج فون پر بہت تعریف کر رہے۔ لینگوج سیل کے کاغذات آئے۔

۱۹؍جنوری

سخت سردی ہے۔ طبیعت نئے سرے سے خراب ہونے لگی۔ خدا خیر کرے۔

ایک خط ظہیر کو لکھا اور علی رضا کو عابد صاحب کی حیاتِ عابد پڑوسی صدیقی صاحب کی بیگم کے ساتھ روانہ کی۔ دن بھر لوگ آتے رہے۔ قسم قسم کے۔ کافی تکان ہو گئی۔

۲۰؍جنوری

صبح سویرے معلوم ہوا رات سے صفیہ کے درد ہے۔ اسی وقت فون کیا۔ چھدو کی گاڑی میں، میں، انیس اور رضا اُسے لے کر ہولی فیملی گئے۔ آدھ گھنٹے بعد داخل کر لیا۔ انیس رضا ٹھہر گئیں۔ میں گیارہ بجے واپس آ گئی۔

صدیقی صاحب پر رات دل کا حملہ ہوا۔ وہ بھی انٹنسیو کیر والے کمرے میں داخل ہیں۔

ان کی بیوی پاکستان نہیں گئیں۔ سارا دن انتظار اور پریشانی میں گزرا۔ صغرا دعوت میں گئی تھیں۔ شام کو اسپتال گئیں۔ بار بار فون کرتے رہے۔ مگر دیر ہے دیر ہے۔ کہا جاتا رہا۔

نو بجے معلوم ہوا کہ ہمارے مجیب صاحب بھی خدا کو پیارے ہوگئے۔ خدا نے ان کی مصیبت کاٹ دی۔ مگر پچپن برس کا ساتھ بیچاری بھابھی پر کیا گزر رہی ہوگی؟ صغرا اسی وقت گئی۔ دل پر اثر ہے۔ ان کو تو جانا تھا۔ مگر پچاس برس کی دوستی کا رشتہ ہمارا بھی ٹوٹ گیا۔ خدا ان کو بخشے۔

وقت پڑھتے گزرا۔ رات کو بہت بے چینی رہی۔ نیند نہیں آئی۔

۲۱/جنوری

خدا کا شکر و احسان ہے صفیہ کے ۹ بجے صبح لڑکا پیدا ہوا۔ اطلاع ملتے ہی انیس وغیرہ چلی گئیں۔ میں مجیب صاحب کے ہاں گئی تھی۔ عجیب حالت ہے۔ عورتوں، مردوں سے گھر بھرا ہے۔ مگر عورتوں میں کوئی ماتم دار ہے نہیں۔ بھابھی معذور پڑی ہیں۔ مجھے جانے نہیں دیتے تھے لوگ مگر میں زبردستی گھس گئی۔ زخمی بے بس پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہی ہیں۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اٹھنے نہ دیتی تھیں۔ اب دوپہر کو پھر جاؤں گی۔

رضا کے بچے ہونے کی خبر صغرا نے دی اور باہر سب جگہ فون سے دے دی۔ سب لوگ بہت خوش ہیں۔

۱۲/فروری

آج بھی کام (کتابوں) میں زیادہ وقت گزرا۔ پھر سیدہ، سیما اور ذکیہ آگئیں۔ اب خالاؤں اور بھانجی میں بلقیس کے جائیداد وغیرہ کے حصے پر فیصلہ ہونے کا مسئلہ ہے۔ خدا اس جائیداد سے سب کو محفوظ رکھے۔ وہ زمین ہو یا روپیہ۔ بس اتنا دے کہ رہنے کو گھر ہو اور خرچ

کرنے کو روپیہ پیسہ کہ کسی کی محتاجگی نہ ہو اور ضرورت مندوں کی مدد کی جاسکے۔

آج طبیعت زیادہ خراب ہے۔ چہرے پر ورم بڑھ گیا ہے۔ جگہ جگہ لال چتے پڑ جاتے ہیں۔ سوچتی ہوں پرسوں ڈاکٹر کو دکھا ہی لوں۔

۲۶ر فروری

آج شام مشاعرہ ہے ایوان غالب میں۔ سیدہ، زہرا، حمید، نادرہ، انور سب کو کارڈ دیے تھے اور اصرار کیا تھا کہ آنا۔ وعدہ کیا تھا سب نے مگر اب جو معلوم کیا (مجھے واپسی کا لالچ تھا کہ وہاں تو ٹیکسی بھی نہیں ملتی) سب منکر۔ کسی کا پروگرام کسی کی دعوت، کسی کی مجبوری۔ لعنت ہے یہ کار بھی۔ خدا توفیق دے کہ نہ اب کسی سے مانگوں اور نہ جاؤں جب تک کوئی پکا انتظام نہ ہو۔ صرف شاہد نے کہا کہ واپسی پر میں ضرور دیکھ لوں گا۔

مشاعرہ کا وقت ۵ بجے تھا۔ مہمان خصوصی سعیدہ خورشید۔ ہم پہنچے پانچ بجے۔ مشاعرہ شروع ہوا چھ بجے۔ (پھولوں سے سجا ہال) سعیدہ خورشید لا پتہ۔ حمیدہ سلطان نے صدارت کی۔ مہمانِ خصوصی شبنم گروور جو بہت معمولی شعر کہتی ہیں (ہندی لپی میں)، کسی بڑے افسر کی بیوی ہیں۔ بہرصورت تیرہ چودہ شاعرات آئی تھیں۔ جوان اور نوجوان خواتین نے بھی اپنا بہت اچھا کلام سنایا جو انھیں کا کہا ہوا، ورنہ لوگ راگ کے بل پر مشاعرہ میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ایک صاحبہ لکھنؤ سے مانی جائسی کی بھتیجی آئی تھیں۔ ایک بمبئی سے تیز طرار مگر بدتمیز نہیں۔ کلام بھی اچھا تھا۔ ایک کشمیری لڑکی بہت خوبصورت اور اچھی شاعرہ اور تو اور جمیلہ بانو کی بیٹی اور رفعت سروش کی بیٹی بھی اچھی شاعرہ اور سنجیدہ تھیں۔ بیگم (سیدہ فرحت) ممتاز مرزا اور ساجدہ زیدی تینوں بہت پختہ کار شاعرہ۔ خاص کر بیگم کا کلام بہت پسند کیا گیا۔ وہ دونوں تو خیر مشاعروں میں جایا ہی کرتی ہیں۔ جمیلہ بانو نے نظامت کی جو ذرا کرنی نہیں آتی۔ بکواس کرتی اور ناز و ادا دکھاتی رہیں۔ نہ کسی کا تعارف کراسکتیں نہ کچھ۔ حمیدہ نے یہ کہہ کر شاعرات کو خفا کر دیا کہ

عورتوں نے اب تک شاعری میں کوئی خاص کام نہیں کیا جیسا افسانہ نگاری میں کیا ہے۔ بچاری کو ویسے ہی تقریر کرنی نہیں آتی (دوسری صاحبہ کو تو ذرا بھی نہ آتی تھی) اور آخر میں نسیم فاروقی (لکھنؤ) سے آگئی۔ وہ پہلے دلی میں تھی نہایت بے ہودہ فقرے باز۔ مرد عورت جو نہایت شرافت سے مشاعرہ سن رہے تھے اور داد دے رہے تھے۔ اس میں سے بدتمیز قسم کے فقرے بازی برابر آئے۔ بہرحال آخر میں، میں نے (خود فرمائش کر کے) تقریر کی۔ اپنے خواتین کی شاعری کو سراہا۔ صاحبانِ دیوان و کتاب شاعرات کا ذکر اور تعریف کی جس سے وہ سب خوش ہو گئیں۔ دس بجے گھر واپس آئے۔

۲۹/ مارچ

آج ''دلی والے'' سمینار کا پانچ بجے افتتاح ہے۔ سمینار کا پروگرام تو بہت اچھا ہے۔ خاص کر کل کا پروگرام کسی قدر میری خواہش تھی کہ اس سمینار میں شریک ہوں گی۔ اس میں میرا مقالہ ڈاکٹر انصاری پر، صغرا کا مضمون عابد صاحب پر، محمد حسن کا خواجہ غلام السیدین پر، حکیم اجمل خاں پر، مجیب صاحب پر، ذاکر صاحب پر، اور بہت سے اور دلی والوں پر سننے کو ملتے۔ ایک سیشن میں میری صدارت بھی تھی مگر اب تو پروگرام خاک شدہ! صغرا گئی ہے۔

بیگم کے ہاں سے فون آیا کہ اس کی بیٹی جو ہمارے ہاں تھی، فوراً بھیج دو۔ چنانچہ اُسے روانہ کر دیا۔ رعنا بھی سدھار گئی۔ اب کیا ہوگا۔ کیسے ہوگا۔ خدا ہی مالک ہے۔

ڈاکٹر حلیم کوثر کو بلایا تھا۔ شام کو آنے کا وعدہ تھا۔ اب تک تو آئے نہیں۔ شبو کا خط آیا جو غریب میری وجہ سے اور خود اپنے حالات سے پریشان ہے۔ شاہد علی خاں سے کتابیں منگائی تھیں۔ انھوں نے دو ڈائجسٹ بھیج دیے جن کا پڑھنا یوں بھی مشکل۔

ڈاکٹر حلیم کوثر، زہرا، سیدہ، قیصر صاحب وغیرہ آئے۔ عزیز قریشی رات گئے آئے، مع پھلوں کے۔

۱۳/اپریل

درد، تکلیف، تھوڑا تھوڑا چلنا، ناگواریاں، بدتمیزیاں۔

[1] زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
میں تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلی

میری قسمت میں دکھ گر اتنا تھا
دل بھی یارب ''پتھر کا دیا ہوتا''

مریضِ زندگی ہوں کس طرح چھٹکارہ پاؤں گی
خدایا تو دعا سن لے مجھے اس سے رہائی دے

ہم نے چاہا تھا کہ اندوہِ زماں سے چھوٹیں
میرا خالق مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

۱۴/اپریل

انیس کی مدد سے کسی طرح نہائی۔ دوپہر کو شبو صغرا کے ساتھ آئی۔ مل کر بہت روئی اور کہا آپ کے سوا میرا کوئی نہیں۔ خدا رکھے سب ہیں۔ اس کی محبت ہے۔ بہر حال میں نے کہا اس کے میاں نے مجھے کتنے ہی دکھ دیے ہیں مگر اس کی خاطر ہمیشہ جھیلا۔ اب بھی درگزر کر کے اگر صحت نے اجازت دی تو آؤں گی۔[2]

---

[1] شعروں میں حسب حال ترمیم کی ہے [2] اپنی بیٹی کی شادی میں آنے کے لیے کہنے آئی تھیں۔

۲۹/اپریل

صبح باچھو سے بات ہوئی۔ کچھ کمزور، اکھڑے اور پریشان محسوس ہوئے۔ اس کے حالات اور صحت! وہ ہی ہے ان سب سے لڑ رہا ہے اور کام کر رہا ہے۔ عذرا رضا کا خط فون کچھ نہیں آیا پریشانی ہے۔ کل اُسے فون کراؤں گی۔

آج اردو اکیڈمی کا فنکشن ہوا۔ باچھو کو خصوصی انعام گیارہ ہزار روپے کا، باقی ظہیر صدیقی، شوکت علی فہمی اور گلزار کو پانچ پانچ ہزار کے انعام مجموعی خدمات پر دیے گئے۔ کتابوں پر کئی انعام LG نے کاٹ دیے جس کا مجھے بہت افسوس ہوا۔ بعض ایسے لوگوں کو جن کو بھی دلوانا چاہتی تھی نہیں ملے۔ البتہ پیام تعلیم کو مل گیا اور قیصر زیدی صاحب کو بھی۔ صادقہ ذکی اور حنیف کیفی کو بھی۔

جلسہ اچھا خاصا ہوا۔ نارنگ کو باچھو کے بارے میں، میں نے ہی بتایا تھا اور شریف الحسن کو بھی بایوڈیٹا دیا تھا۔ لوگوں کی تقریریں اچھی تھیں۔ بعد میں گانے کا پروگرام ہوا۔ خاتون گانے والی ایسی ہی تھیں اور پاکستان کے علی برادران (فاعتبروا یا اولی الابصار) صورت حرام، آواز خراب، غزل کا انتخاب مہمل۔ آخر میں بلھے شاہ کی بیت بھی کافی.... جو سمجھ میں نہیں آئی۔ بہت کوفت ہوئی۔ باچھو کا اصرار تھا کہ انھوں نے فلورا میں دعوت دی ہے۔ انور وغیرہ نے ٹھیک سے کسی کو اطلاع نہ دی تھی۔ نتیجہ یہ کہ بیس مہمانوں میں سے اگر مجھے اور نجو و اصغر کو بھی ملالیا جائے تو پانچ مہمان تھے۔ بجلی غائب، سخت گرمی۔ کھانا دیر میں ملا اور بہت برا۔ باچھو کو بہت تکلیف ہوئی ٹانگ کی وجہ سے۔ مگر ان کی محبت اور شوق! خدا کی پناہ۔ مجھے بھی بہت تکلیف ہوئی۔ کل اسی فلورا میں کچھ انجمن ایوارڈ ملنے والوں کو دعوت دے رہی ہیں۔ مجھے بھی مدعو کیا تھا مگر میں نے معذرت کرلی۔

۵؍جون

ذکیہ کو بخار آگیا۔ بازو میں درد بھی۔ میں بہت پریشان ہوں اس کی طرف سے۔ خدا کرے جلد ٹھیک ہو جائے۔

سیدہ کی گاڑی میں احمد کے ساتھ اُسے دیکھنے گئی۔ عزیز بھی وہاں آگئے تھے۔ واپسی ہوتے ہوتے رات کے دس بج گئے۔ نماز تلاوت وغیرہ سب لیٹ۔ روز کوئی نہ کوئی چکر ایسا ہو جاتا ہے کہ رات کے بارہ ایک بج جاتا ہے۔

۱۰؍جون/۲۰؍رمضان

معلوم ہوا رعنا کی طبیعت پھر خراب ہے۔ نگو اور نذیر بھیا کو اس کے پاس بھیجا۔ نگو تو رہ گئی نذیر جلوس مجلس وغیرہ میں شرکت کر کے رات کو ساڑھے گیارہ بجے واپس آئے۔ نہ اپنی صحت کی فکر ہے نہ دوسروں کی پریشانی کی۔

اصغر صغرا کا وزا لے آئے۔ شکر ہے۔ اب ٹکٹ کا مسئلہ رہ گیا ہے اور پھر بتن کو فون کرنے کا۔ صفیہ، حسن کل آگئے۔ آج ان کی نانی خالائیں وغیرہ انیس کے ہاں آئی تھیں۔ ان کی نانی مجھ سے کم سے کم سات آٹھ برس بڑی ہوں گی۔ یا شاید زیادہ۔ دبلی پتلی گوری، جھریاں پڑی، منہ میں دانت نہیں۔ مگر ماشاء اللہ سفر کرتی ہیں، خوش خرم رہتی ہیں۔ بیٹوں، نواسے نواسیوں سب میں دلچسپی لیتی ہیں۔ بس سے سفر کر کے یہاں آجاتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر بڑھاپے کا احساس ذرا کم ہوا۔ شاید کل رعنا آجائے۔ اس کی طرف سے فکر ہے۔ سارا کا خط میرے نام اردو اور صغرا کے نام انگریزی میں آیا۔ سیدہ کا خط آیا۔ وہ بہت پریشان ہے۔ زندگی خراب ہوگئی لڑکی کی اور افسوس دکھوں کے ہاتھوں۔ بہت صدمہ ہے۔ مگر انسان کتنا بے بس ہے۔ قومی آواز میں میرا جو مضمون اسلام پر چھپا تھا اس پر بہت آرا آرہی ہیں۔ موافق بھی مخالف بھی۔ سوچا

جواب لکھوں پھر چھوڑ دیا۔لوگوں کو تو توجہ دلانا تھا۔وہ شکر ہے کہ ہو رہی ہے۔

۱۱/جون

ہر رات مختصر اعمال (شب قدر کے) میں نے اور انیس نے کیے۔ دعائیں وغیرہ پڑھیں۔رات گیارہ سے ۵ بجے تک بجلی غائب رہی۔ مچھر، گرمی اور نیند کی دوائیں بے اثر۔ چار بجے بجلی آگئی اور پھر دن میں غائب۔ذرا ہوا چلی آندھی اور بجلی غائب۔

چولھا اور کنکشن لینا ہے۔ دو ہزار سے زیادہ کا خرچ۔ آج اچھن کے لڑکے کو پیسے جمع کرنے بھیجا ہے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

۳/جولائی

خدا خدا کر کے آج صغرا کا فون آیا کہ وہ ''بخیریت'' یعنی بہ ہزار خرابی بسیار پہنچ گئی۔ بتن اب پہلے سے بہتر ہے مگر کافی بیمار تھی۔ کچھ کتابیں ایجوکیشن منسٹری سے ریویو کے لیے آئی ہیں۔ میں نے کتابوں کی الماریوں اور دیگر الماریوں اور کمروں وغیرہ کی صفائی کی مہم شروع کر دی ہے۔

باچھو کی ٹانگ کا آپریشن ہوا ہے۔خدا اُسے صحت دے۔ بہت فکر ہے۔

۱۷/جولائی

پرسوں چھدو واپس آئی۔صرف آشی اس کے ساتھ آئی ہے۔میاں نہ خود آئے نہ بچوں کو لانے دیا۔ بچاری اداس اور پریشان ہے مگر ظاہر نہیں کرتی۔ پرسوں تو شام بھر لوگ آتے رہے۔ آج (۱۸) عذرا کا خط آیا ہے۔وہ چاہتی ہے میں پھر اس کی ماں کو اس کی شادی کے لیے راضی کرنے کا خط لکھوں۔مگر یہ سب پہلے ہو چکا ہے اور اس کی ماں کے جواب سخت انکار کے

اور تکلیف دہ تھے۔ اس نے تو یہاں تک لکھا کہ آپ کراچی چلی جائے۔ قطع نظر اس کے کہ میرا جانا ناممکن ہے۔ ممکن بھی ہوتا تو میں نہ جاتی۔ ماں بیٹی کے معاملے میں کسی دوسرے کا دخل دینا ٹھیک نہیں۔ آپ لاکھ کچھ کہیں اولاد جس کی ہوتی ہے اُسی کا حق ہوتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کیا کروں؟

۱۹ر جولائی

خدا خدا کرکے آج شام اقبال کا فون آیا کہ شمع کے سلامتی و خیریت کے ساتھ لڑکی پیدا ہوگئی ۱۷ کو۔ خدا اُسے ماں باپ اور سب عزیزوں کے سائے میں پروان چڑھائے۔ میں تو بہت پریشان تھی۔ رعنا کے آپریشن سے بچہ ہونے کا خیال ہے۔ خدا اُسے اچھا رکھے۔ جی پریشان ہے۔ ۲۵ کو اسپتال میں داخل ہوگی۔ ۲۶ کو آپریشن ہوگا انشاء اللہ۔ صغرا تو آج اس سے مل آئی۔ میں نہیں جاسکی۔ جاؤں تو سو روپے ٹیکسی کے خرچ ہوں۔ گاڑی تو اول کون دیتا ہے اور دے بھی تو 60-50 کا پٹرول اور چار گھنٹے آنے جانے میں صرف۔

بارشیں برابر۔ سڑک تالاب بنی ہوئی ہے۔ سڑک کا گندے پانی کا نل چھ دن سے ٹوٹا پڑا ہے۔ کوئی سنوائی نہیں مرمت کی۔ شکر ہے بجلی اور فون بہتر حالت میں ہیں۔ میری طبیعت بہت سست ہے۔ سر میں اور بدن میں درد۔ صبح اٹھا نہیں جاتا۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔

۹ر اگست

آج معلوم ہوا کہ کل چھادی کے شوہر منیش کا انتقال ہوگیا۔ گئے تھے روس پیسہ کمانے۔ وہاں پہنچتے ہی ہارٹ اٹیک ہوا اور تین برس بیماری میں کٹ گئے۔ بار بار ہارٹ کی بیماری۔ کبھی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ زیادہ وقت اسپتالوں ہی میں گزرا اور میری بہن غریب تیمارداری ہی کرتی رہی۔ اس کی ساری زندگی لوگوں کی خدمت اور تیمارداری کرنے، دکھ اٹھانے اور غم سہنے

میں گزر گئی۔ پندرہ دن ہوئے وہ روس سے بمبئی آ گئی۔ ڈاکٹروں نے ٹال دیا کہ آپریشن ہارٹ کا ہندستان میں کرالینا۔ میں تو اُسی وقت کھٹک گئی تھی۔ دنیا تو روس جاتی ہے آپریشن کے لیے۔ یہ الٹا ہندستان بھیجنا کیا معنی؟ خدا چھادی اور بچوں کو صبر دے۔ یہ تو خیر اچھا ہے کہ اب سب بچے تعلیم سے فارغ ہو چکے ہیں۔ دو لڑکیاں ڈاکٹر ہیں۔ لڑکا بھی غالباً الیکٹرونک کی کوئی اچھی ڈگری لیے ہوئے ہے اور نوکر ہے۔ چھوٹی لڑکی کی شاید تعلیم ابھی باقی ہے۔ مگر باپ کا صدمہ تو بہر حال ہے ہی سخت اور چھادی کے لیے بھی یہ بڑا سخت واقعہ ہے۔ خدا اُسے صبر دے۔ ہے بھی وہ غضب کی صابر۔

۲۲/اکتوبر

منجھلے (اطہر) بلگرامی کے ہاں مجلس تھی۔ ان کی بیوی دو بار دوڑ کر آئیں۔ خوشامد کی کہ آپ پڑھ دیں معصوم کربلا والا مضمون۔ وعدہ تو نہیں کیا تھا مگر گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوپہر کو سو نہ سکی۔ مضمون تو خیر ہمیشہ ہی پسند کیا جاتا ہے۔ مگر خدا کی مہربانی اور مولا کے نام کی برکت سے جانے کہاں سے پڑھتے وقت دم آجاتا ہے! آج تو خیال تھا کہ شاید پڑھتے ہوئے ہی چل بسوں۔ مگر خیر! لیکن ڈھائی گھنٹے صرف ہو گئے۔ خواتین اتنے لمبے لمبے نوحے اور اتنا ماتم کرتی ہیں اور سوز سے پڑھنے والیاں سخت غلطیاں کرتی ہیں۔

آج ایکسرے اور خون کا معائنہ ہو گیا۔ مگر شکر ہے کہ کوئی خاص خرابی نہیں نکلی۔ اب ڈاکٹر خلیل اللہ سے بات کرنی ہے۔ آج صغرا نے نغمہ اور شاہد کو کھانے پر بلایا ہے۔ کوئی خط نہیں آیا۔ نہ اقبال کا نہ کسی اور کا۔ خدا کرے سب خیریت سے ہوں۔ آج رضا اور صفیہ اور منو علی گڑھ گئے۔ گھر میں شدید سناٹا ہے۔

☆☆☆

1986

یکم جنوری

ہمیشہ پہلی جنوری کی رات کو بارہ بجے تک سال بھر کا حساب جوڑا کرتی تھی اور زبردستی عابد صاحب کو دکھایا کرتی تھی۔ وہ مذاق اڑاتے۔ میں کہتی اتنا تو سُن لیجیے۔ پورے سال کا میزان پڑھا جاتا۔ وہ کہتے ''دیکھو مصداق مدراس میں فلاں صاحب بیٹے کی شادی کا حساب جوڑ رہے تھے کہ ہارٹ فیل ہوگیا۔'' ہم ہنستے اور مذاق کرتے اور اگلے سال کے لیے کچھ سوچتے اور سو جاتے۔ ان کے بعد بھی تھوڑی بہت یہ عادت رہی۔ اس سال خیال آیا تو محسوس ہوا کہ کس کے لیے؟ کیوں؟ فائدہ؟ خرچ تو ہونا ہے وہ ہوگا ہی۔ جب تک محنت کرسکتی ہوں کروں گی، جب تک کام چل سکتا ہے چلے گا۔ اس سب سے کیا حاصل۔

بجلی کئی گھنٹے سے غائب رہی۔ اقبال کی بیٹی سارا، رضا وغیرہ، نذیر بھیا، نصیر اور ببلو سب نئے سال کا پروگرام دیکھنے کو بے قرار تھے۔ ان سب نے دیکھا صغرا بہت تھکی ہوئی تھی۔ میری طبیعت یوں خراب اور پریشان ہے۔ رات کو ایک بجے تک کتاب پڑھتی رہی۔

۲؍جنوری

کچھ نقل کا کام کیا۔ کچھ خطوط کے جواب دیے۔ نہانے کی ہمت کررہی ہوں۔ بہت سردی ہے۔ کچھ لوگ ملنے آئے۔

مجھے شام کو سیدہ خان عبدالغفار خان سے ملانے لے گئی جن سے ملنے سینکڑوں آدمی

آرہے تھے۔ دس بارہ برس پہلے وہ ہمارے گھر بھی آئے تھا، کھانا کھایا تھا، عابد صاحب تھے، سارا خاندان تھا۔ میں نے ان کی مزاج پرسی کی۔ مصافحہ انھوں نے خود کیا۔ میں نے ان کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگایا۔ آنے والی نسلیں سچ مچ ہم پر ناز کریں گی کہ ہم نے بادشاہ خاں کو دیکھا تھا۔ ولی خاں البتہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔

۲رفروری

مولانا آزاد پر نیا مضمون بچوں کی کتاب پر مکمل کرلیا۔ اقبال کو خط۔

نجو اور اصغر ملنے آئے۔ رعنا کو بڑی مشکل سے فون ہوسکا۔ وہ شاید اگلے اتوار کو آسکے گی۔ بوا کا بیٹا بہتر ہے۔ مگر چھ مہینے کے لیے پلنگ پر ہے اور بوا جو پہلے سے نیم جان ہیں اور بدحال ہیں اور اس کا اثر صغرا پر پڑ رہا ہے۔ بے تحاشا کام اور صحت خراب۔

۶رفروری

مولانا آزاد پر نیا مضمون بال بھارتی کی آٹھویں کلاس کے لیے مکمل کیا۔ مہاراشٹر کی ایک مسودہ کی کتاب پر نظر ڈال کر رائے لکھی اور پونے بشیر الدین صاحب کو بھیج دیا۔

مجیب صاحب پر نہیں بلکہ مجیب و مسز مجیب پر مضمون۔ کچھ یادیں کچھ باتیں۔ لکھ لیا ہے۔ مضمون ختم کرنے کے بعد ضیا صاحب کا پرچہ ملا کہ آپ ۱۷۔۱۸ تک بھیج دیں۔ مگر شکر ہے میں نے جلدی سے مکمل کرلیا۔ اب دو چار دن بعد بھیج دوں گی ان کو۔ آج غزالہ[1] آئیں۔ ان کے دس ہزار روپے مہینوں سے جامعہ رجسٹرار آفس میں اٹکے پڑے ہیں اور نہیں ملتے۔ افسوس کیا ہوتا جا رہا ہے جامعہ کو۔

---

[1] غزالہ انصاری

۲۷/فروری

آج صبح بہتر محسوس کیا۔ اگرچہ درد میں کمی سی تھی۔ صبح کشور[1]، شہناز[2]، غزالہ[3] وغیرہ آئیں۔ سر دھونے کی ہمت نہ تھی۔ صرف مالش کرائی۔ اقبال کو اور ایک دو اور خط لکھے۔ مگر اس سے درد بڑھ گیا۔ شام کو صغرا اور انیس، عابد زیدی کی لڑکی کی شادی میں چلی گئیں۔ بہت کہنے کے بعد زیدی صاحب کے گئی۔ باقر مہدی کا پیام پہنچایا۔ پھر سیدہ کے گئی۔ رنجو[4] صاحب کو ''پھوپی جان سے کچھ زیادہ ہی عقیدت و محبت ہوگئی ہے۔ باتیں کرتا رہا۔ لڑکا اچھا لگتا ہے۔ مگر تھوڑا سنکی ہے۔ ویسے بڑا آرٹسٹ ہے۔ گٹار بجانے والوں میں اس کا بڑا نام ہے۔ شام کو ٹی۔وی پر ایک کہانی دیکھی۔ یہ سلسلہ اچھا ہے۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں پیش کی جاتی ہیں مختلف زبانوں کے افسانہ نگاروں کی۔

۲/مارچ

قریشی کا خط پاکستان سے۔ وہ مولانا حالی پر کتاب لکھ رہا ہے۔ اتنا بڑا سوالنامہ کہ خاصا تھیسس بن جائے۔ وہ بچارا آٹھویں پاس ہے۔ شاید اردو کی قابلیت کچھ بڑھا لی ہو۔ میں تو پاکستان بننے کے بعد اس سے ملی ہی نہیں۔

انور روز ملنے آنے کا وعدہ کرتا ہے اور نہیں آتا۔

۶/مارچ

صغرا بہت دن سے دعوت کرنے کو کہہ رہی تھی۔ سحاب قزلباش کے آنے کا بہانا کر کے دعوت بول دی۔ شرکا جو کم تھے خاصے ہوگئے عینی، سحاب، چھدو، آشی، زہرہ، ذکیہ، حمیدہ، سالم

---

[1] کشور قدوائی [2] شہناز ہاشمی [3] غزالہ انصاری [4] سیدہ کے دوست

اور سنبل۔ عزیز قریشی۔ انجو (سیدہ کا دوست) رضا، صفیہ، انیس، نگو اور گھر کے باقی سب آدمی۔ کچھ لوگ وقت پر آئے اور دیر سے آنے والوں پر بگڑنے اور فقرے بازی کرتے رہے۔ ہم تو وقت دے سکتے ہیں مجبوری تھی۔ بہر حال نو کے بعد کھانا ہوا۔ لوگوں نے (شاید سوا سالم کے) شوق سے کھانا کھایا۔ پھر شعر و سخن کی محفل جمی۔ ممتاز مرزا نہ آسکی اس لیے ایک ہی شاعرہ تھی وہ بھی تھکی ہوئی۔ خیر تین چار غزلیں اس نے سنائی۔ پھر رضا نے طویل اور مزاحیہ چیزیں سنا کر محفل کو گرما دیا۔ ساڑھے دس گیارہ بجے محفل ختم ہوئی۔ سامان اٹھوا کے رکھواتے گیارہ سے زیادہ بج گئے۔

۱۴/ مارچ

آج ابو طالب اکیڈمی میں شام کے جلسے کی صدارت کی اور حاؔلی کی مثنویوں پر مقالہ پڑھا۔ صغرا نے میر حسن اور زہر عشق کی مثنویوں پر پڑھا۔ دو مقالے اور تھے اور دو تقریریں۔ حاضرین پچیس تیس سے بھی کم تھے۔ بہر حال اس وقت دلی میں اتنے جلسے، سمینار اور مشاعرے ہو رہے ہیں کہ یہ مہدی نظمی ہی کی ہمت تھی کہ انھوں نے حاضرین کی پروا نہ کی اور وقت مقررہ پر سمینار کر رہے ہیں۔ آج پھر ہے۔ صبح سے کام کی کثرت۔ پھر احمد جمال پاشا دو ڈھائی گھنٹہ کے لیے پھر تحسین، تصویروں کی فرمایش۔ پھر سمینار۔ وہاں سے واپس آکر میرن صاحب کی فاتحہ۔ پھر ایکیوپنکچر جس میں اب بہت تکلیف ہوتی ہے اور رات کو ساڑھے دس بجے اچانک ببّن کی پاکستان سے آمد۔ بچاری بیماری کی حالت میں اکیلی ہی آئی ہے۔ خدا کا شکر ہے خیریت سے پہنچ گئی۔ گیارہ بجے رات تک صبح سے مسلسل مصروفیت رہی۔

۱۶/ مارچ

رات بہت بری گزری۔ قریب قریب تڑپتے اور جاگتے۔ اس لیے کہ علاوہ اور تکلیفوں کے بازو اور گردن کا درد بہت تھا۔ کسی کل چین نہ تھا۔ یہی سوچتے گزری کہ ہو گا کیا۔ اگر

اکیوپنکچر بھی ناکام ہوگیا۔ اب تو صرف تین سٹنگ ہی رہ گئی ہیں۔ خدایا اب اس عمر کو ختم کرورنہ کیسے زندگی گزرے گی میرے مولا۔

صغرا کے دوست آئے۔ مکتبہ میں دعوت کی گئی۔ مجھ سے ملنے یوسف ناظم، عزیز، فراز، زبیری، اصغر، نجو اور رعنا وغیرہ آتے جاتے رہے۔ پوری صبح سخت تکلیف میں گزر گئی۔ دوپہر کو آرام کیا۔ تھوڑا ٹہلی۔ شام کو کسی طرح وقت کاٹنے کے لیے فلم دیکھی۔ فضول تھی۔ جی پریشان ہے۔ بس دعا اور دعاؤں کا سہارا ہے۔

۱۷/مارچ

شاہد علی خاں کی فرمائش پر ان کو سات کہانیوں کا مجموعہ بھیجا۔ وہ اسے اپریل تک چھاپنے کا وعدہ کرتے ہیں مگر کون جانے؟ کب سے چار کتابیں پڑی ہیں، سال گزر گئے۔

آج ڈاکٹر کے پاس پھر گئی۔ آٹھویں سٹنگ تھی۔ درد کی شدت میں کچھ کمی تھی۔ امید تو دلاتے ہیں کہ ٹھیک ہوجائیں گی۔ خدا مالک ہے۔ موسم بھی بہت خراب پھر ہوگیا ہے۔ گرج کڑک۔ تھوڑی سی بارش بہت سا بادل۔ شفیقہ فرحت آئی تھیں۔ اردو بورڈ کی میٹنگ کے لیے آئی ہیں۔ صبح کا وقت ان کی نذر ہوگیا۔ میں نے بورڈ کی میٹنگ میں جانے سے انکار کردیا ہے۔ غلام حیدر آئے۔ وہ ایک جلسے کی صدرات چاہتے تھے مگر کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ گول گول اصرار، گول گول بیماری کا بہانا کر کے انکار پیام لکھ دیا۔

۱۸/مارچ

آج شاہد علی خاں نے میرے گھر پر مجروح[1] کو ملنے اور کلام سنانے کے لیے بلایا۔ مسز شاہد اپنی تین چار دوستوں کو لے آئیں۔ سیدہ آگئی۔ رضا، نگو، ببّن، صغرا، شاہد علی خاں وغیرہ

[1] مجروح سلطان پوری

اچھا خاصا چودہ آدمیوں کا مجمع ہوگیا۔ مجروح سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ پہلے بس دور سے مشاعروں میں دیکھا تھا۔ انھوں نے گھنٹہ بھر سے زیادہ اپنا کلام سنایا اور میری رائے بالکل بدل دی کہ وہ تو فلموں کے شاعر ہیں۔ بس پہلے جو کہہ دیا وہ کہہ دیا۔ مگر اب انھوں نے نیا پرانا دونوں چیزیں سنائیں اور بیشتر پسند آئیں۔ وہ بھی بہت موڈ میں آگئے۔ عبید نے بہت سی تصویریں لیں۔ مجروح مہذب، جوش گفتار، خوش گو اور خوش گلو ہیں۔ خوشی ہوئی کہ اچھا کلام سننے کو ملا اور اچھے آدمی سے ملاقات ہوگئی۔

شام پر سکون گزری۔ کئی کتابیں دیکھیں۔ امیر قزلباش کا غزلوں کا مجموعہ بہت اچھا ہے۔ انور دہلوی کو ایوارڈ کے سلسلے میں فون کیا۔ وہ کہتے ہیں کام ہوگیا۔ خط کا انتظار کیجیے۔ اقبال کو صغرا رضا نے فون کیے نہیں ملتا۔

تین کتابیں 'انعامی' پڑھیں۔ وقت کم رہ گیا ہے۔ ۲۴ کو میٹنگ ہے۔ کسی طرح ان کو ختم کرنا ہے۔ آج نویں سٹنگ ہوگئی۔ خدا ساتھ خیریت کے پورا کورس کرا دے۔ درد اور تکلیف میں تو اس کے فضل سے کمی ہے۔ اگرچہ سردی بہت ہے۔

۲۶ر مارچ

قیامت۔ ذکیہ کا بچہ ۲۶ برس کا کڑیل جوان ایکسیڈنٹ۔ ختم۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شام ماتھر آئے۔ دیکھا۔ بلڈ پریشر بہت ہائی۔ کھانسی، دمہ۔ ذکیہ کے پاس تک جانے کی ممانعت۔ تڑپتی رہی، دعا کرتی رہی، روتی رہی۔ سب بے کار۔

۲۷ر مارچ

آج ''اردو والے'' سمینار کی صدارت کرنی تھی مگر نہیں جاسکی۔ جانا بھی نہیں چاہا۔ کل عذرا رضا کی دوست سیما مع اپنی ماں اور بہن کے آنے والی ہیں۔ میں آج ذکیہ کے گھر گئی۔

بہر حال کسی طرح سنبھل گئی ہے۔ مگر پھر بھی اس کی تڑپ خدایا! صبر دے اسے۔

یکم اپریل

سیما کی ماں، بیگم احسان اور بہن فریدہ آئیں۔ نو بجے سے دو بجے تک رہیں۔ کھانا کھایا۔ اچھے لوگ ہیں۔ ماں پاکستان میں بڑی ہوئیں۔ سیما امریکہ میں۔ ملے کہاں ہندستان میں۔ عذرا نے حسبِ عادت تحفے بھیجے ہیں۔ صغرا نے بدلے میں ساڑھی اور تحفہ وغیرہ بھیجا۔ میں نے تو اس وقت صرف خط اور تصویر بھیجی ہے۔

آج ہمت کر کے ٹہلنے گئی۔ خدا کرے طبیعت سنبھل جائے۔ محتاجگی اور مجبوری کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ دن کو جیسے تیسے گزرتا ہے مگر رات! اُف خدایا۔ بیماریوں کا زور۔ خیالات کا طوفان، اگلے پچھلے واقعات کا گہرا احساس۔ اور درد و غم جو سینے میں دن بھر دفن رہتے ہیں ان کا غلبہ۔ دواؤں سے بھی اتنی کم اور اتنی بے چین نیند! بس تیرا ہی سہارا ہے۔ خدا ذکیہ کے حال پر رحم کرے۔

۲/اپریل

ڈاکٹر خلیل کو -/500 روپے علاج کا معاوضہ آج بھیج دیا۔ صغرا کو -/500 مکان کی مرمت کے سلسلے میں دے دیے۔ صبح کو بہت سے کام کیے جن میں خطوط کی چھنٹائی بھی تھی۔ بارہ بجے تک بے حد مصروف رہی۔ دوپہر کو پھر بھی نیند نہیں آئی۔ دن آج کا مہمانوں اور آنے والوں کے لحاظ سے سکون سے گزرا۔

۳/اپریل

میر صاحب کی نواسی چل بسی۔ احمد کو فون کیا کہ جو کر سکتے ہو اس کے لیے کرو۔ اس نے

خون دلوایا۔ کچھ اور مدد کی۔ خدا اُسے اجر دے۔

رات بے چین گزری۔ کون سی نئی بات ہے؟ دن اِدھر اُدھر کے لوگوں سے ملنے یا خطوط چھانٹنے میں۔ خلیق انجم سے بات ہوئی۔ یادگارِ حالی کا نیا اڈیشن نکل رہا ہے۔ دیباچہ کی فرمائش ہے۔ ان کے لیے خطوط (دوستوں اور اہم ہستیوں کے) جمع کیے ہیں کچھ۔ وہ کل منگانے کا وعدہ کیا ہے۔ یوں تو ہزاروں ہی خط ہیں۔ کس کس کو کیسے جمع کروں؟ جب کوئی سہارا دینے والا نہیں۔

ذہن پریشان ہے۔ ذکیہ کی فکر، سیدہ کی فکر، صغرا کی فکر، بنّن کی فکر۔ شکر ہے اس کی رپورٹیں ٹھیک آئیں۔ انیس کی فکر۔ کیوں دل دنیا سے اچاٹ نہیں ہو جاتا؟ کیوں بس اس کی یاد باقی نہیں رہتی؟

۴؍اپریل

کہانی تاثراتی۔ کئی دن سے دماغ میں کلبلا رہی تھی۔ آج پہلا رف پلاٹ اس کا لکھ لیا۔ بہت سے خطوں کو چھانٹا جو اِدھر اُدھر بکھرے تھے۔ کوئی سو کے قریب خط انجمن ترقی اردو کے لیے ایک لفافے میں جمع کیے اور ان کو بھیج دیے۔ ملنے والے کم آئے پھر بھی طبیعت گھبراتی ہے۔ شام خاموشی میں گزری بلکہ تنہا۔

۱۴؍اپریل

آج ذکیہ آئی۔ بیچاری چہلم وغیرہ کے انتظام میں اپنے کو مصروف رکھ رہی ہے۔ مگر حالتِ دیکھی نہیں جاتی۔ آدھی رہ گئی ہے۔ کبھی بلک بلک کر رونے لگتی ہے، کبھی اوندھی سیدھی باتیں۔ خدا اولایا تو دے نا، دے تو واپس نہ لے۔ ایسی حالت میں کوئی کیسے اُسے سمجھا سکتا ہے۔ پھر ابھی کتنے دن ہوئے ہیں؟ ظاہرا اور سب نے اپنے کو سنبھال لیا ہے وہ تو ماں ہے۔

۲۶ برس کا کڑیل جوان، یہ شاک، یہ صدمہ، یہ مامتا۔ کیسے سہارے۔ خدا کی مرضی ہی تھی اور کیا تھا؟ پھر سعیدہ رضا کی پوتی کا دوسرا حادثہ اس میں بھی اس کو بہت کچھ کرنا پڑا۔

۲۱/اپریل

''ہماری زبان'' میں مولانا آزاد پر نثار فاروقی کا ایک نامعقول مضمون چھپا ہے۔ قطع نظر اس تحقیق کے جو فرمائی گئی ہے (مجھے نہ علم ہے، نہ ہوسکتا ہے کہ وہ کس حد تک درست ہے) زبان اور اندازِ بیان نہایت بے ادبی کا بلکہ بدتمیزی کا ہے۔ بہت رنج ہوا۔ زیدی صاحب، مالک رام، شاہد بھی خفا ہیں۔ افسوس تو ہے کہ وہ ہماری زبان میں چھپا کیسے؟ مالک رام صاحب کا بیان ہے کہ مخمور سعیدی نے چھاپا ہے۔ جن کو ہم نے اس سال ایوارڈ دیا؟ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ کیا چھوٹے بڑے اسی طرح بن سکتے ہیں اس دور میں کہ بڑوں پر کیچڑ اچھالیں اور وہ بھی ان کے دنیا سے جانے کے برسوں بعد۔ عابد صاحب کہا کرتے تھے ''تنقید اور تحقیق ہے کہاں؟ کون ہے اس کا اہل؟'' کتنا صحیح کہتے تھے۔

بہت سے کام کیے۔ بہت تھک گئی۔ شام کو تھوڑا ٹہلی۔ رات کو نیند نہیں آئی تھی۔

۲۲/اپریل

آج جواں مرگ جواں سال جان ہار عارف کا چہلم ہوگیا۔ بہ خرابی بسیار امامیہ ہال پہنچے۔ لکھنؤ سے سوز خواں اور طاہر جردلی پڑھنے آئے تھے۔ سوزخوانوں نے تو خیر پڑھا۔ مگر طاہر جردلی نے موقع کے مناسب بہت اچھی مجلس پڑھی۔ مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ وہ ایسی اچھی مجلس پڑھ سکتے ہیں۔ ذکیہ کا تو جو بھی حال ہو میرا روتے روتے برا حال ہوگیا۔ معلوم ہوتا تھا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ مگر بہت ضبط کیا کہ آوازیں نہ نکلیں۔ گھر کی سو کے قریب عورتیں اور اس سے زیادہ مرد شریک ہوئے۔ علی گڑھ سے ساجدہ، زاہدہ، غزالہ، ذکیہ کی نند نندوئی اور کئی اور

عزیز آئے۔ دلی سے بھی بہت سے عزیز دوست آئے۔ سارا گھر بھرا ہوا۔ ذکیہ نے بہت عمدہ کھانا پکوایا۔ بچاری نے حسرت نکالی۔ شادی کی جگہ چہلم کا کھانا پکوایا۔ یا اللہ! اُسے کیسے صبر آئے گا۔ تین ساڑھے تین بجے گھر آئی۔ تھک کر ذہنی، دلی، دماغی، جسمانی حالت چور تھی۔ شام زیادہ تر تلاوت میں کٹی کہ یہی ایک سہارا ہے۔ صغرا چھ دو دیر میں آئیں۔

۳۰/اپریل

آج پارلیمنٹ کے ممبروں کی طرف سے پرسنل لا بل کی حمایت میں بہت بڑا شاندار جلسہ ہوا۔ عزیز[1] کے اصرار پر مجھے بھی جانا پڑا۔ تقریریں سیاسی بھی تھیں اور بل کی وضاحت کے سلسلے میں بھی۔ عابدہ احمد کی تقریر سب سے اچھی تھی۔ جلسہ تو شام تک چلا۔ میں ایک بجے کے قریب چلی آئی۔ آنے جانے کا انتظام عزیز ہی نے کیا۔ آج بھی دن بھر بجلی غائب رہی۔ سخت تکلیف میں کل رات گزری تھی۔ دن بھی ویسا ہی کٹا۔ پھر دو گھنٹے کے لیے بجلی آئی، پھر غائب۔ بجلی کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آتا کیسے طے کیا جائے؟ عجب حالات ہیں کوئی پرسانِ حال نہیں۔

۱۶/مئی

کل رعنا آئے گی۔ شام سے موسم بدل گیا۔ ہوا میں خنکی۔ ہلکی بارش۔ آندھی مگر ٹھنڈی۔ زندگی ہے تو بہر حال گزارا ہوگا۔

۱۷/مئی

تیز نیند کی دوا کھائی۔ اس سے بہتر نیند آئی۔ یوں بھی رات سکون رہا۔ آج سویرے پہلے نجو مع بچی کے، پھر رعنا مع بچوں کے آگئے۔ آج رعنا کی سالگرہ ہے۔ صغرا نے سب ان کے گھر

[1] عزیز قریشی کانگریس کے مدھیہ پردیش کے لیڈر آج کل گورنر اترا کھنڈ

والوں وغیرہ کو بلا کر دعوت کی۔ سب نے بہت شوق سے کھانا کھایا۔ ذرا دیر کو گھر کی فضا خوشگوار ہوگئی۔ مجھے جانے کیوں آج دن بھر رونا آتا رہا۔ نمازوں میں مسلسل آنسو بہتے رہے۔ خدا جانے یہ خوفِ خدا تھا یا خوفِ مستقبل یا کیا۔

نجّو کی بچی بہت چھوٹی سی، موٹی اور پیاری ہے۔ رعنا کی تو بہت خوبصورت ہے مگر بیمار رہتی ہے۔ حسن عابد تو ہے ہی بہت پیارا اور جب سارے بچے مل جائیں تو...... زندگی میں سچی خوشی بس اسی وقت ملتی ہے۔

۱۸ر مئی

آج سعیدہ رضا کی پوتی کے چہلم کی مجلس میں، میں اور صغرا گئے۔ موٹر اور ڈرائیور کا انتظام کیا۔ نئے فیشن اور اپر کلاس والوں کی مجلس تھی۔ مرد عورت ایک کمرے تو نہیں مگر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ مولوی صاحب شاید مرعوب ہوگئے یا شاید ان کا انداز ہی یہ تھا کہ سائنس اور مذہب اور نیچر اور خدا جانے کیا کیا ملا دیا۔ حاصل مجلس بس دو تین منٹ پڑھا۔ وہاں سے شبّو کے ہاں چلی گئی۔ گڈو[1] نوکر ہوگیا ہے اس خوشی میں اس نے آج رات خاندان والوں کو بلایا تھا۔ مگر میں دوپہر ہی کو چلی آئی۔ کھانا کھایا۔ بچیوں نے بہت شوق سے پکایا۔ شبّو بہت خوش ہوئی اور رونے لگی۔ شام کو اور لوگ گئے۔ میں نے فلم نہیں دیکھی۔ طبیعت پریشان ہے۔ آج علی گڑھ جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ خدا کرے جا سکوں۔ کل رات ۷ بجے ببلو کو لے کر جانے کا خیال ہے۔

۲۸ر مئی

آج ذکیہ آئی۔ رات کو رہنے کے لیے۔ بظاہر سنبھال لیا ہے مگر دل میں جو زخم ہے وہ کیسے بھرے گا۔ ہر وقت وہی نام، وہی ذکر، وہی خیال، خدا اس پر رحم کرے۔ دوپہر کو خلیق انجم یادگار

---

[1] مظہر مہدی

حالی کی تین جلدیں پانچویں اڈیشن کی لے کر آئے۔ بہت اچھی چھپی ہے۔ جی خوش ہوگیا۔ اسی وقت صالحہ (الٰہ آباد والی) آگئیں۔ بمشکل ان سے پیچھا چھڑایا۔

آج عذرا کو امریکہ خط لکھا۔ موسم بہت اچھا ہو رہا ہے۔ مگر گھٹنے کے پاس سے داہنی اور اب بائیں ٹانگ کی ہڈی بڑھ رہی ہے اور ساتھ ہی درد بھی ہے۔ اس سے بہت پریشانی ہے۔ خدا ہی ان بیماریوں سے نجات دے گا۔ کام بہت سست رفتاری سے ہو رہا ہے۔ سردار جی نے تیزی کم کردی ہے۔ خدا جانے کیوں۔

۲۱/جون

انیس اور نجو واپس آگئیں۔ رعنا کے ہاں سے۔ نجو مع اپنی بچی کے آئی ہے۔ بچی بہت پیاری مگر نجو کی صحت خراب ہے۔ گرمی بلا کی ہے۔ کمزور تو ہے ہی۔

۲۲/جون

صبح رضا اور صفیہ اور حسن عابد بھی آ گئے۔ گھر میں رونق بھی ہے اور ہلچل بھی۔ دوپہر صغرا، عذرا فلم دیکھنے گئیں۔ کھانا سب نے یہاں کھایا۔ گرمی بلا کی ہے۔ کہیں اور کیا قریب بھی آنے جانے کا سوال نہیں ہے۔ اقبال نے بلایا بھی ہے۔ اگست میں مگر نہ سفر کی طاقت نہ دل میں لگن۔ اقبال نے آم بھیجے ہیں مگر آج صبح سے میرے پیٹ میں گڑبڑ ہے۔ پیچش کی کیفیت ہوگئی ہے۔ رات تک بہت درد اور پیچش بڑھ گئی۔ عاصمہ کو فون کیا۔ بخار بھی ہوگیا۔ اگرچہ تھرمامیٹر میں مشکل سے نکلتا ہے (کارڈی زون کی عنایت) رات سخت بے چین گزری۔ ٹانگوں اور جسم میں سخت درد ہے۔ کوئی کام بھی نہ ہو سکا۔ یادگار حالی کی ایک کاپی عزیز قریشی کو دی۔ بہت خوش ہوئے۔

۲۴/جون

طبیعت کچھ بہتر رہی۔ دن میں تھوڑا چلی پھری، تھوڑا کھانا کھایا۔ بخار بھی نہیں ہوا۔ مگر طبیعت بہت سست اور کمزور۔ بلڈ پریشر لو۔ بمشکل نماز پڑھی اور تھوڑی تلاوت کی۔ پڑھا بھی نہیں گیا۔ نہ کتاب نہ کلامِ پاک۔ موسم بہت اچھا ہو گیا ہے۔ بادل۔ ٹھنڈی ہوا۔ تھوڑی بارش۔ مگر قسمت کے ماروں کے لیے ہر موسم میں بیماری ہر چیز کو بے لطف بنا دیتی ہے۔ آج کل عجب حال ہے۔ کبھی بلقیس[1] کو خواب میں دیکھتی ہوں، کبھی اماں کو، کبھی میرن صاحب کو۔ بچاری نجو! کو صبح ہی صبح دیور آ کر لے گیا۔ بیاہی لڑکیوں کی بے بسی!!

موسم اچھا ہو گیا ہے۔ پیچش بدستور۔ ڈاکٹر ماتھر کو کل دکھانے کا قصد۔

۳/جولائی

کاغذات، خطوط، مضمون ادھورے پورے۔ اور اکیلی میں کرنے والی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اس ہنگامی دور میں کسی کو ذرا سا سہارا دینے کی فرصت نہیں ہر ایک اپنے اپنے کام اور مصروفیات میں الجھا ہوا۔ اور ایک میں تھی۔ زندگی کے ساٹھ سال اپنے سے نہیں زیادہ دوسروں کے کاموں میں کھپا دیے اور جب خود ضرورت پڑی تو!؟

موسم پھر بہت گرم ہو گیا ہے۔ صغرا کا اصرار ہے کہ لکھنؤ چلو۔ اقبال کا بھی اصرار ہے۔ مگر صحت، ہمت، موسم، حالات اور وہاں کی پریشانیاں...... سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ جی چاہتا ہے، پر ہمت جواب دے دیتی ہے۔

۵/جولائی

گرمی سخت۔ دل پر بوجھ۔ شام کو بے اختیار دو تین گھنٹے روتے گزرے۔ صغرا دن دوستوں میں گزار کر شام کو گھر پر تھی۔ رات کو بہت سوچتی رہی مگر کوئی خاص بات تو تھی نہیں۔

---

[1] سیدین صاحب کی بیٹی

رونے سے بھی کیا حاصل۔ ذرا ذرا سی مجبوری، چھوٹے چھوٹے کام جب نہ ہو سکیں۔ کرنے والے نہ ملیں۔ یا دن کو فرصت نہ دی جائے تو صبر کرنا چاہیے۔ چنانچہ اسی کی جدوجہد کر رہی ہوں۔ دن بھر مصروف رہی ہوں مگر بعض وقت خدا کے حضور بھی حاضر ہو کر صبر و قرار کھو دیتی ہوں۔ وہ تو اس کی محبت ہے کہ آنسو خشک ہو گئے ہیں۔ ورنہ مجھے تو دن رات ہی رونا چاہیے تھا۔

عابد صاحب پر ایک اور مضمون ملا ہے۔ سوچ رہی ہوں کہ اسے کتاب میں شامل کروں۔

۱۹ر جولائی

کل سروجنی نائیڈو (انگلش) ختم کر لی بہت اچھی کتاب ہے۔ اور مسز نائیڈو کی بڑی دلکش مگر سچی تصویر معلوم ہوتی ہے۔ مدت بعد انگلش کی کتاب پڑھی اور بہت خوشی ہوئی۔ آج مالی نے حسبِ دستور (تین چار برس پہلے کی طرح) بدتمیزی بدزبانی کی۔ اگرچہ وہ چار دن بھی نہ آئے مگر زبان نہیں کھولتی کہ بیہودہ آدمی کے منہ کون لگے۔ مگر اب میں اُسے رکھوں گی نہیں، چاہے باغ تباہ ہو جائے۔ ٹہلنے گئی۔ تلاوت عبادت کی۔ رات کو سیما کا فون ملایا کہ شاید اس سے ظہیر کی خیریت معلوم ہو مگر اس سے پہلے ہی گیارہ بارہ بجے کے درمیان (رات) عذرا کا فون آ گیا۔ بہت سخت، بہت نازک۔ بہت تکلیف دہ آپریشن تھا مگر وہ بچ گئی۔ ہوش میں ہے۔ یا علی یا علی کہتی بے ہوش ہوئی اور یا علی یا علی کہتی ہوئی ہوش میں آئی۔ ابھی تکلیف بہت ہے۔ اولاد خاص کر عذرا دن رات خدمت کر رہی ہے اور ساری اولاد بھی جمع ہو گئی ہے۔ میرا دل بے اختیار چاہتا رہا رات بھر کسی نہ کسی طرح اسے جا کر دیکھوں اور ملوں۔ مگر علاوہ اور مشکلوں کے اپنی صحت پر اعتماد نہیں۔ وہاں جا کر بیمار پڑ گئی تو؟ وہ لوگ اُسے دیکھیں گے کہ مجھے۔ خیر یار زندہ صحبت باقی۔ ہو سکا تو پاکستان آنے کے بعد مل آؤں گی۔

۲۴ر جولائی

رات اسی الجھن میں رہی۔ صبح بہت دیر میں سوئی۔ صغرا آٹھ بجے آگئی۔ شام سے اسی نے کام سنبھال لیا مگر میں اپنے کو بہت تھکا ہوا محسوس کر رہی ہوں۔ مکتبہ پارسل بھیجے ہیں۔ خدا بخش لائبریری کے لیے ہو جائیں تو ایک بار سے تو سبک دوش ہو جاؤں۔

کل شمیم[۱] کو دیکھا۔ یہ خدا کی قدرت ہے کہ فالج سے اتنی جلدی سنبھل گئیں اور اب خدا کے فضل سے بول رہی ہیں۔ چل پھر رہی ہیں۔ واقعی خدا ہی سب کا سہارا ہے ورنہ اس غریب کا کون کرنے والا تھا۔ بیٹا بہو پوتا پوتی اس دور میں کس کے ہوئے ہیں۔ اگرچہ بیٹا تو بہت خیال کرتا ہے لیکن اگر لمبی بیماری چلتی تو کیا ہوتا۔ کشور سے ملی۔ کشور بہت بوڑھی لگنے لگی ہے۔

۲۸/ جولائی

آج عذرا کا بفلو سے فون آیا۔ ظہیر سے بات ہوئی۔ گھر آگئی ہے مگر بہت کمزور ہے۔ واکر کی مدد سے چلتی ہے۔ علی رضا کی محبت دیکھیے۔ بیس گھنٹے کا روزہ رکھ رہے ہیں۔ ایک مہینے کے بیوی کی صحت کے لیے۔ خدا اُسے مکمل صحت دے۔ عذرا میرا پہلا خط ملا۔ بعد کا نہیں ملا۔ سوالوں کی بوچھار، تو اس میں تھی۔ اب جب وہ اس کا جواب دے گی تو جانے نہ جانے کا فیصلہ کروں گی۔ وجہ تو بہت سی ہیں۔ تنہا سفر، ایک صحت کی زیادہ خرابی کا ڈر، دوسروں پر بار بننے کا خوف، گھر سے دور رہ کر سب کی فکر، دلی کے جھگڑے اور فساد جو دل کو ٹکڑے کیے دے رہے ہیں، ان کی فکر، صغرا اور گھر والوں کی فکر، اور خدا جانے کتنی اور فکریں۔ سخت کش مکش میں ہوں۔

۵/ اگست

آج کھرانا کو دکھانے گئی۔ کوئی گاڑی نہ ملی۔ عزیز میرے سخت انکار کے باوجود اپنی جیپ لے کر آئے۔ ایک بجے ڈاکٹر نے ایک دانت کا کچھ علاج کیا۔ دوبارہ بلایا ہے۔ پھر بہت چاہا

---

[۱] شمیم قدوائی جمال قدوائی کی پہلی بیوی

کہ وہ پارلیمنٹ چلے جائیں مگر نہیں مانے۔ پہنچانے آئے۔ خیر کچھ کھلایا پلایا۔ تین بجے واپس گئے۔ ٹکٹ ان کے ہاتھ میں ہے۔ دیکھیں کب اور کس گاڑی کا ہوتا ہے۔ پھر اقبال کو اطلاع دینی ہے۔

کل اور یعسوب کا آج فون آیا۔ سخت اصرار ہے کہ لندن آجاؤ وغیرہ وغیرہ۔

۶/اگست

پاکیزہ آنچل، سوال نامہ صغرا صاحبہ نے تو تیرہ چودہ چار سطروں کے سوال لکھ کر دے دیے۔ کل سے جواب لکھ رہی ہوں اور اب تک پورے نہیں ہوئے۔ گرمی شدید ہے۔ کام بہت ہیں۔ سمیٹ نہیں پا رہی۔ نرجس کو خط لکھا تعزیت کا۔

۷/اگست

احمد[1] ماتھر آنکھوں کے ڈاکٹر، صفدر جنگ میں لے گیا۔ دو بار پہلے بھی دیکھ چکے ہیں، مگر انھوں نے سرسری معائنہ آنکھ کا کیا اور کہا کسی پیر کو آئیں۔ اس دن چک اپ ہوگا۔ میں نے کہا اب تو میں انشاء اللہ لکھنؤ جا رہی ہوں۔ واپسی پر خدا نے چاہا تو آؤں گی۔ دانت کا کام ادھورا، آنکھ کا ادھورا۔ اب کل ماتھر کے پاس جانا ہے اور پرسوں سے سامان رکھنا اور سمیٹنا چاہتی ہوں۔ ذرا سے سفر سے جی گھبراتا ہے۔ پھر امریکہ لندن کا سفر۔ نہیں نہیں یہ اپنے بس کا نہیں۔

آج انٹرویو مکمل کر کے صغرا کو دے دیئے۔ کہکشاں پروین کوئی صاحبزادی ہیں افسانہ نگار مجھ پر ریسرچ کی ہے۔ وہ مجھ سے میرے اپنے افسانوں کے لیے رائے مانگ رہی ہیں۔

۱۱/اگست

---

[1] ڈاکٹر احمد ظہیر

آج دن بھر سفر کی تیاری میں کٹا۔ اگو[1] اور بھائیہ[2] کو دوبارہ فون صغرا نے کر دیا۔ رات کو باوجود بے حد منع کرنے کے عزیز جیپ لے کر آ گئے۔ فرسٹ کلاس میں (چار سیٹ کا ڈبہ) میری اور نذیر بھیا کی سیٹیں تھیں۔ بہت آرام سے سفر کٹا۔ غالباً موصوف نے کنڈکٹر سے کہہ دیا ہوگا کہ اس درجہ میں کوئی نہ آئے اور بھی کچھ کیا ہوگا۔ راستے میں خوب اچھی بارش ہوئی اور موسم خوشگوار ہو گیا ورنہ تین دن سے گرمی نے بالکل بدحواس کر رکھا تھا۔ کاکوری، سندیلہ وغیرہ اسٹیشن صبح سویرے آئے پورا راستہ آموں کے درختوں اور باغوں سے بھرا ہوا بے حد حسین لگ رہا تھا۔ اسٹیشن پر اقبال اور اگو کی گاڑی موجود۔ سارا اسکول جا چکی تھی۔ شمع بہت خوش ہوئی۔ زہرا[3] بہت پیاری ہو گئی ہے۔ صغرا کو خیریت کا خط لکھا اور دن اونگھتے، سامان رکھتے اٹھاتے گزر گیا۔ اقبال بہت خیال کرتا ہے۔ شمع بھی اپنے انداز میں۔ نذیر بھیا کل صبح ہی چلے جائیں گے۔

۱۲ر اگست

آج اقبال نے بہت تکلیف اٹھا کر چھوٹا کمرہ میرے لیے ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ بہت محنت کرتا ہے۔ ذرا سے کمپلیکس نہ ہوتے تو ہیرا تھا۔ اب چھوٹا کمرہ میرے سامان اور سونے کا ہو گیا۔ زہرا کی وجہ سے بند رکھنا پڑتا ہے۔ دن میں دو خط لکھے۔ ایک مضمون پورا کیا۔ دوپہر کو پڑھتے سوتے کٹا۔ شام کو اقبال شمع وغیرہ کے ساتھ رزیڈنسی میں خاصی دور ٹہلنے گئی۔ وہاں سلطانہ حیات مل گئیں۔ حسب عادت گرم جوشی سے جس میں تصنع بھی ہوتا ہے۔ میں اپنے ہاں آنے کے لیے کہا اور جلدی سے چلی گئیں۔ ابھی تک مسرور جہاں سے یا کسی اور سے ملاقات نہیں ہوئی۔ مدت بعد باوجود بچوں کے شور کے سکون کا احساس ہو رہا ہے۔ مگر بلڈ پریشر کم، ٹانگوں اور سر میں درد۔ دراصل گرمی ہے اور ان فلیٹوں میں صحن تو ہوتا ہی نہیں ہے۔ گھر یاد آ رہا ہے۔ صغرا یاد آ رہی ہے۔ حسین عابد، انیس اور سبھی۔ مگر سوچتی ہوں کچھ عرصے یہاں رہوں تو شاید بہتر ہی

---

[1] سید کاظم ظہیر   [2] ڈاکٹر بھائیہ   [3] اقبال مہدی کی چھوٹی بیٹی

ہوگا۔

۱۵؍اگست

رات بھر پڑوس میں ہنگامہ رہا۔ جانے کیوں۔ صبح چار بجے سے لوگ آتے جاتے بچے چلانے لگے۔ رات کو بھی دیر تک پڑوس کے گھروں میں غالباً وی سی آر چلتا رہا۔ بہر حال نماز کے بعد دیر تک لیٹی رہی۔ دوپہر تک کئی لوز موشن ہوئے۔ بہت ڈری۔ عاصمہ[1] کی دوا مل گئی۔ اس کے کھانے سے سکون ہوا۔ اقبال نے شمع اور بچیوں کے ان کی ایک سہیلی کے ہاں بچوں کی سالگرہ پر اصرار کر کے بھیج دیا۔ کام کرنے (آج مضمون ختم کرلیا) نہانے کے بعد میں نے اور اقبال نے کھچڑی پکائی۔ بہت مزے کی تھی۔ دونوں نے شوق سے کھائی۔ بہت دیر اقبال باتیں کرتا رہا۔ دل کی باتیں بھی محتاط جواب دیتی رہی۔ شام کو میں اور اقبال مسرور جہاں کے ہاں گئے۔ وہ وعدہ کر کے بھی نہ آئی تھیں۔ بہت خوش اور بہت شرمندہ ہوئیں۔ واپسی رکشا پر ہوئی جس سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ آج ٹی وی اور ریڈیو پر پندرہ اگست کے پروگرام کا زور رہا۔ وہی پرانی چیزیں، پرانی باتیں۔ جوش اور ولولہ مگر اب نہیں۔ البتہ لکھنؤ کے ''اودھ پنچ'' پروگرام میں جنگ آزادی میں علما کا حصہ اچھا پروگرام ہوا۔ لوگ تو ان جانے تھے مگر باتیں انھوں نے صحیح اور پتے کی کہیں۔ آج تو چھٹی تھی۔ کل شاید خط آئے۔ شمع آٹھ بجے رات کو واپس آئی۔

۱۷؍اگست

آج عید الضحیٰ تھی۔ اپنے ہاں تو بہت لوگ آئے ہوں گے۔ یہاں بھی اقبال کے بارہ پندرہ کولیگ دوست، شمع اور بچوں کی دوست۔ لوگ تو کم تھے مگر ماشاء اللہ کیا کھایا ہے! کیا کھایا

---

[1] ڈاکٹر عاصمہ حسین

ہے کہ رشک آتا تھا یا حیرت۔ دوپہر کے بعد ہلکی بارش شروع ہوگئی۔ موسم خوشگوار ہوگیا۔ شمع تو آدھے سے زیادہ دن پکانے اور پھر کھلانے میں لگی رہی۔ اقبال مہمانوں میں میرا دن اداسی میں گزرا۔ اعمال کے بعد دعائیں پڑھیں اور پھر ایسے ہی لیٹے اونگھتے رہے۔ کچھ ان کے دوستوں سے ملتے گزر گیا۔ گھر اور بچے بہت یاد آتے رہے۔ صغرا کو شام کو خط لکھا۔

۱۶ر ستمبر

آج عاشورہ محرم تھا۔ رات نہ سونے کے برابر پڑھتے یا ٹہلتے کٹی۔ صبح نماز فجر کے بعد پھر سوگئی۔ تھوڑا سا کچھ پیا اور کھایا کہ اب پورے دن کا فاقہ ممکن نہیں رہا۔ دن ریڈیو پر مجلسیں سنتے گزرا۔ شام کو پھر مجلس کی۔ صغرا، انیس، صفیہ نے کھانا پکایا۔ میں نے شربت پر جناب امام حسین اور حضرت علی اصغر کی نذر دے کر بچوں اور بڑوں کو پلایا۔ فاقہ شکنی کے بعد سات بجے شام غریباں کی مجلس۔ اس میں بھی میرا ٹیپ لگایا گیا۔ میں نے خود نہیں پڑھی اور شبو نے نوحے پڑھے۔ بے حد رقت ہوئی۔ ذکیہ سیدہ وغیرہ دیر سے گئیں۔

۱۷ر ستمبر

سوئم کی مجلس رات کو ہوئی۔ فاتحہ پر میں بیویوں سے رخصت ہوئی کہ اب خدا جانے ملنا ہو محرم میں کہ نہیں۔ بعض رونے لگیں۔ بعض دعائیں دینے لگیں مگر خدایا بس اب تجھ سے یہی دعا ہے کہ اس مہینے ورنہ اس سال میں اپنے دامنِ رحمت میں چھپا لے۔ زندگی کا بوجھ بھاری سے بھاری ہوتا جارہا ہے۔

۱۸ر ستمبر

(۱۲ر محرم الحرام) آج میرے عابد آپ مجھ سے صبح آٹھ بجے جدا ہوئے تھے۔ ہندستانی

حساب سے نو سال۔ اُف نو سال آپ کے بغیر گزر گئے اور میں زندہ ہوں۔ کام کر رہی ہوں۔ دنیا کے فرائض ادا کر رہی ہوں۔ مگر۔ یہ کہوں تو مبالغہ ہوگا کہ آپ مجھ سے ایک لمحہ جدا نہیں ہوئے یعنی خیال آپ کا ہر وقت آتا ہے۔ صبح آنکھ کھلتی ہے تو پہلا تاثر یہ کہ عابد یہیں ہیں۔ دن بھر جب کوئی تخلیقی کام کرو تو یہ احساس کہ عابد صاحب کو دکھانا ہے۔ قرآن کی تلاوت، بخار میں دعائیں یہ ضرور یاد دلاتی ہیں کہ آپ اس دنیا سے مجھ سے بہت دور ہیں۔ مگر لاشعور کی یہ کیفیت دن میں کتنی بار گزرتی ہیں۔ رات میں کتنی بار دھوکا دیتی ہیں۔ خواہ وہ لمحہ بھر کی ہو آپ ابھی یہاں تھے، میرے پاس۔ شاید دل کے اندر کی شبیہ ذہن میں آجاتی ہیں۔ میں اتنی حقیر خدا کی بندی، اس کی محبت، اس پر بھروسا، اسی کا سہارا۔ سب کچھ کر سکتی ہوں مگر اُسے موجود نہیں محسوس کرتی۔ مگر آپ کو کرتی ہوں۔ اب تک کرتی ہوں عابد۔ جانے اس دنیا میں آپ سے مل سکوں گی یا نہیں۔ امید پر ہی جی رہی ہوں کہ زندگی میں نیک اعمال کیے ہیں تو خدا آپ کو اور مجھے یکجا کرے گا۔ اور آپ تو مجسم نیک عمل تھے۔ نو سال سے یہ صلیب تنہا اٹھا رہی ہوں میری جان۔ درد یہ تنہائی اب بہت زیادہ بڑھتی جا رہی ہے۔ درد و غم اور دکھ اور بیماریوں نے اندر سے جیسے کھوکھلا کر دیا ہے۔ مگر۔ یہ صلیب جو مقدر ہے اٹھائے جا رہی ہوں۔ خدایا۔ خدایا۔ خدایا۔

۱۹ر ستمبر

کل رات شاہ مردان امام باڑے میں نسیم امروہوی (پاکستانی) کی مجلس سننے گئی۔ بچاری سیدہ لے گئی۔ شاعری کے لحاظ سے کلام بہت اچھا تھا۔ مرثیت بہت کم تھی اور صناعی اور الفاظ کی عبور محاوروں اور تلمیحات وغیرہ وغیرہ پر قدرت۔ پر اپنا دل ہے میرے سوا وہاں جتنی عورتیں تھیں (پچیس تیس پڑھی لکھی............) ان میں سے ایک بھی اس شاعری کو دس فیصدی سے زیادہ نہیں سمجھتیں۔

۵/نومبر

شبو آئی ہے۔ اس کی صحت کتنی خراب ہوگئی ہے۔ دل کا مرض خاصا سیریس۔ ارتھرائیٹس۔ نروس خراب۔ اس نے جھیلا بھی تو کیا کچھ ہے۔ آج رہے گی۔ ہما کی کچھ بات چیت چل رہی ہے خدا کرے کامیاب ہو۔

آج پھر کچھ مضامین اور خطوط ڈھونڈے اور رکھنے رکھانے میں لگی رہی۔ مضمون جو تلاش کرتی ہوں ملتا نہیں ہے یا ادھورا ملتا ہے۔ رات نیند اچھی نہیں آتی۔ اور دن میں بھی اتنا شور اور ہنگامہ چاروں طرف رہتا ہے کہ نیند کا سوال ہی نہیں۔

۲۵/نومبر

آج شاہد[1] کا حیدرآباد سے بہت محبت بھرا خط آیا۔ کل نرجس اور بیگم کا خط آیا تھا۔ آصف بھی مبارکباد دینے آیا۔ آج صغرا، رضا، نذیر بھیا اور صفیہ 'نوٹنکی' دیکھنے گئے ہیں۔ کل انصاری صاحب کے یہاں قوالی تھی۔ عزیز کا بہت اصرار تھا، مگر میں کہاں جاتی۔ اب نہ شوق، نہ امنگ، نہ طاقت، نہ صحت، ہاں کبھی کبھی مردہ دل میں کچھ زندگی آتی بھی ہے تو صحت اُسے کچل دیتی ہے۔

۲۲/دسمبر

آج صغرا ایک سیمنار میں بھوپال گئی ہے۔ آج بہت دن بعد عزیز آئے تھے۔ کچھ کاغذ دستخط کو دے گئے ہیں کہ میرے علاج کے لیے کسی کلچر سوسائٹی سے کچھ لینا ہے چاہتے تھے۔ ان کی عجیب باتیں ہوتی ہیں۔ انکار بھی نہیں کر سکتے۔

اقبال اور اس کے بچوں کی وجہ سے بہت رونق ہے۔ بیگم شاید کل چلی جائے۔ دھوپ میں

---

[1] شاہد شبو کے داماد

کام نہ کرسکنے کی وجہ سے طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ ناموران علی گڑھ۔ بھائی جان پر چند صفحے لکھے۔

۲۳ر دسمبر

ہریانہ اردو اکیڈمی کو اس کے رسالے کے لیے ایک اپنا اور ایک بھائی جان کا مضمون ''پانی پت'' بھجوایا۔ اپنی کتاب میں سے تلخیص کی اور بھائی جان کی سوانح سے کچھ حصہ نقل کرا کے آج بھیج دیا۔ دیکھیں ان لوگوں کو پسند آتا ہے یا نہیں۔

سیدین صاحب پر مضمون کے تین چار صفحے مزید لکھے مگر سردی نے تباہ کر رکھا تھا۔ آخر چھوڑ دیا۔ دوپہر تک باہر رہی۔ طبیعت بہت خراب ہے۔ غالباً سردی کے اثر سے ہڈیوں میں درد تو ہے ہی پیٹ میں بہت تکلیف۔ سردی کا تو جانے کا ابھی کوئی سوال ہی نہیں۔ میرا کیا بنے گا مولا؟ خدا سب بوڑھوں بیماروں، مجبوروں، غریبوں، بے سہارا لوگوں پر رحم کرے۔

بیگم آج چلی گئی۔ اچانک آصف آ کر لے گیا۔

۲۴ر دسمبر

رات سخت سرد، دن اس سے زیادہ۔ طبیعت پر سردی کا بہت اثر پڑا۔ آدھی رات جاگتے گزری۔ ہیٹر بوتل سب بے کار۔ کسی طرح دو صفحے مضمون کے لکھے مگر ہاتھ کام ہی نہیں کر رہے تھے۔ ثریا حسین مع خاندان کے آ گئیں۔ بہت خلوص کرتی ہے بیچاری۔ دوپہر کو فہمیدہ ریاض آئی۔ مگر صغرا نہیں تھی۔ صفیہ اور میں نے چلتا کر دیا۔ شام کو زیدی صاحب کے گئی۔ بہت مصروف تھے۔ اب اچھے ہیں مگر بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ اقبال صبح پانچ بجے رائے پور ایک سمینار میں سدھار گیا۔ بھائی جان پر مضمون تھوڑا سا لکھ پائی۔

۲۸/ دسمبر

ایک امریکن خاتون گیل ملنے آئی۔ دس برس پہلے بھی آئی تھی۔ اس نے حالی کی مجالس النساء اور چپ کی داد کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ کتاب شائع ہوگئی۔ بہت اچھی ہے۔ اسے مجھے پیش کرنے آئی تھی۔ یہ لوگ جو علمی، ادبی، لسانی مذاق رکھتے اور خدمت کرنا چاہتے ہیں تو کس لگن اور شوق سے زبان سیکھتے ہیں۔ اس کے لیے سفر کرتے ہیں، محبت کرتے ہیں، لوگوں سے ملتے ہیں۔ تین چار بار وہ اردو سیکھنے اور ترجمہ کرنے کے شوق میں ہندستان اور پاکستان آئی اور بہت سے لوگوں سے استفادہ کیا۔ میں نے اُسے نیا افسانوں کا مجموعہ اور اردو ادب میں خواتین کا انگریزی ترجمہ دیا۔ بہت خوش ہوئی۔ اب وہ مسلمان عورتوں پر ہندستان میں ریسرچ کررہی ہے۔ صغرا، رعنا، رضا، صفیہ، نذیر بھیا، عمران و سارا تو فلم دیکھنے چلے گئے اور تینوں بچوں نے کئی گھنٹے ہنگامہ، رونا پیٹنا مچایا۔ میرے تو بس کے نہ تھے انیس اور بوا نے سنبھالا۔ چھدو آج آگئی خیریت سے۔ شام کو باچھو سے ملنے اس کے فنکشن میں گئی اور بہت دلگرفتہ آئی۔ صحت کے ساتھ دماغ پر بھی غصہ اور بیزاری اور بدمزاجی کا اثر ہے۔ نہ کوئی ڈھنگ کا نوکر رکھتا ہے نہ عزیزوں دوستوں میں کوئی ایسا ہے جو مجبور کرے یا خود کو اس کے لیے وقف کردے اور آنا جانا بھی نہیں چھوڑتا۔ سمجھتی ہوں ایک جگہ پڑے پڑے بھی اکتا جاتا ہے۔ مگر اس طرح انجام خدانہ خواستہ کیا ہوجائے۔ خدا اس پر رحم کرے۔ میں نے تو اسی لیے ہر جگہ کا آنا جانا و سیر و تفریح، فنکشن سب چھوڑ دیے ہیں۔ حالانکہ مرض کی حالت میں بہت فرق ہے۔

☆☆☆

1987

۳/جون

یا اللہ! میری قسمت میں یہ دیکھنا تھا۔ یہ آخری چراغ میرے خاندان کا میرے دادا کی اولاد کا میری زندگی میں بجھنا تھا۔ مجھ میں اور اس میں سات آٹھ مہینے کا تو فرق تھا۔ کاش میں اس سے پہلے چلی جاتی۔ یہ دعا تھی کہ اب میں کسی چھوٹے کا صدمہ نہ اٹھاؤں۔ مگر میرے اللہ! جو تیری مرضی اور مصلحت، جو تیرا حکم۔ سات سال کی شدید بیماری سہی۔ اسی میں اس نے بے پناہ قوت سے کام کیا، بے حد قوت برداشت اور طرح طرح کے ذہنی دُکھ جھیلے۔ کمال تو یہ ہے کہ دو مہینے پہلے جو بیماری کا حملہ ہوا تھا، اس میں ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ مگر سنبھل گیا۔ ڈاکٹر حیران رہ گئے۔ اس کی وِل پاور زندگی سے لڑنے کی عجیب وغریب طاقت۔ بے شک یہ تیری قدرت کا کرشمہ تھا کہ وہ اچھا ہونے لگا۔ لاسٹ پیج اور فلم بنانے کا حوصلہ وعزم پیدا ہوگیا۔ سب پُر امید ہوگئے کہ پہلی جون کو رات ساڑھے تین بجے خاموشی سے دنیائے فانی سے تیرے حضور پہنچ گیا۔ میرا باچھو، میرا بھائی، میرا ہم سبق، میرا ہمجولی۔ قومی یکجہتی، حق پرستی اور حق گوئی، ہم خیال بھی تو تھے۔ میں اس کی ہر کتاب پڑھتی تھی۔ ہر مضمون، لاسٹ پیج، اس کی فلمیں دیکھتی تھی جب کسی کو بتاتی تھی کہ عباس میرا چھوٹا بھائی ہے تو مجھے کتنی خوشی، کتنا فخر ہوتا تھا۔ شاعر نے کہا تھا ؎

قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص۔ مگر میرے گھرانے میں تین نسلوں سے پیدا

ہوتی رہیں اور اپنے اپنے حلقے میں نام پاتی رہیں۔ اے خدا! تو نے ہی تو یہ صلاحیتیں ان کو دی تھیں۔

الطاف حسین حالیؔ بے مثال فنکار، بے مثال شخصیت باچھو کے پرنانا۔

خواجہ سجاد حسین۔ جہاں رہے اپنی اعلیٰ خوبیوں سے نمایاں رہے۔ پکے مسلمان، سچے انسان، باچھو کے نانا۔

خواجہ غلام الحسنین عالم دین، مرد مومن فنافی العلم باچھو کے تائے۔

خواجہ غلام الثقلین۔ بے حد ذہین تصنیف، تالیف، اصلاحِ قوم، صحافت میں اپنی چھاپ چھوڑ گئے، باچھو کے چچا۔ پھر خواجہ غلام السیدین جو باچھو کے بڑے چچازاد بھائی جو اس کے آئیڈیل تھے۔

اور خواجہ غلام السبطین باچھو کے والد۔ ان میں وہ صفات تھیں جو کسی بھی انسان کے لیے قابل فخر ہو سکتی ہیں اور یہ صفات باچھو کو بھی ورثے میں ملی تھیں۔ جفاکشی، اصول پرستی، دیش بھکتی، فیاضی اور خدمتِ خلق۔ باچھو، جو سب کچھ رکھتے ہوئے کچھ نہ رکھتا تھا۔ اسے عزّت ملی، ایوارڈ ملے، خطاب ملے، اس کی کتابوں اور فلموں کی شہرت ہوئی اور نہایت سادہ زندگی گزار کر دنیا سے چلا گیا۔

اس کو بمبئی بہت پسند تھی اور آج بمبئی نے اس کو اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ جیسے سیپ میں موتی۔

اے خدا! مجھے صبر دے اور اب اور آزمائشوں میں نہ ڈال۔

۵/جون

میرے غم گسار، اور دکھ کے بٹانے والے۔ میری جان سے عزیز!!

آپ کیا میرا درد محسوس کر رہے ہیں۔ میں نے جانے دس برس پہلے آپ سے کہا تھا یا لکھا

تھا کہ آپ کے بعد اب اور کوئی داغ اور غم سہارنے کی قوت نہیں۔ ڈاکٹری اور سرجری کچھ کہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گوشت کے اس لوتھڑے کے علاوہ تو نے اس غم نصیب کو ایک اور دل بھی دیا ہے جس میں بڑی وسعت اور گہرائی ہے۔ اور جس میں داغوں اور زخموں کا چمنستان کھلا رہا ہے۔ اور اب بھی نئے نئے زخموں کے گلاب کھلتے رہے ہیں۔ جانے آپ جانتے ہیں؟ یا آپ کو وہاں خبر ملتی ہے یا ہماری دنیا کے لوگوں کی طرح آپ اب بھی 'وہاں کے' حالات اور یہاں کے واقعات سے لاعلم ہیں۔

باچھو۔ آپ بہت چاہتے تھے نا اس کو۔ بھائی سمجھتے تھے۔ نہیں دوستی تھی آپ سے اس سے۔ وہ مجھ سے زیادہ آپ سے باتیں کرتا۔ مجھ سے زیادہ آپ کو چاہتا اور شاید اپنا ہم سر سمجھتا تھا۔ محبت تو بہن سے بھی تھی۔ اور بڑے ہونے کے بعد اس کا تجربہ چھوٹے کے انتقال پر ہوا جب وہ میرے لیے بے قرار تھا۔ امن کی جدائی پر ہوا جب اُسے یہ احساس تھا کہ میں امن کو کتنا چاہتی ہوں اور بھائی جان کے سدھارنے پر ہوا۔ اس کی باتیں بنانے کی عادت نہ تھی۔ رسمی تعزیت یا اظہارِ غم کرنے کا حوصلہ ہی نہ ہوتا۔ مگر کتنی ہی جلدی میں ہو، کتنی ہی تکلیف میں ہو ہر دو چار مہینے بعد وہ مجھ سے ملنے اوکھلے آجاتا۔ اس احساس کے ساتھ اب اس کے سوا میرا کوئی بھائی نہیں۔ اور اب تو آپ بھی نہیں۔

کیا بتاؤں اس کو دیکھ کر، اس سے مل کر میری کیا حالت ہوتی۔ آنکھیں سمندر بن جاتیں وہ سمندر جو اوپر سے خشک ہو۔ دل بسمل کی طرح تڑپتا اور اس کی شکل، آواز، خیال اور غصہ میں بھائی جان جھانکتے، چھوٹے جیسے گلے سے لپٹا لیتے۔ آپ کا عزم اور پختگی اور قوت عمل اور انسانیت کی سیوا کی پرچھائیاں اس کے چہرے میں جھانکتی ملتیں۔ ذرا دیر کو جیسے میں آپ چاروں بیک وقت مل لیتی تھی۔ لیکن اب تو دو مہینے پہلے بھی میں اُسے جا کر نہ دیکھ سکی اور جب وہ ہمیشہ کو جدا ہوا تب بھی نہ جا سکی کہ نہ وقت تھا کہ آخری دیدار ہی کر لوں نہ جانے کا وسیلہ۔ اب تو ہوائی جہاز میں سیٹیں مہینوں میں ملتی ہیں جبکہ دس سال پہلے آپ کو بیمار چھوڑ کر امن کے آخری

دیدار اور نرجس کی تسلی کے لیے میں باچھو کے ساتھ ہی (کہ وہ بھی تو دلی میں تھا) رات کو بمبئی پہنچ گئی تھی اور ہم دونوں نے اپنی پیاری بہن اور بھاوج کو الوداعی رخصتی کی تھی۔ بھائی کی عاشق میری چاہنے والی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے چلی گئی اور باچھو ضبط کا مجسمہ اور میں بے قراری کا نمونہ دیکھتے رہ گئے۔ ہائے اس وقت بھی نرجس ہی تنہا وہاں تھی کہ سب عزیز مطمئن ہوکر اور اب بھی نرجس ہی اکیلی تھی۔ اگر چہ سارا بمبئی ماتم دار تھا، غم گسار تھا۔ اس کا بھائی، اس کا بیٹا، اس کی بیٹیاں اس کے عزیز تھے یہ سب جس کو اس کا سب کچھ ہوتا تھا۔

مگر میں نہ جاسکی۔ دلی میں آنسو پیتی رہی۔ کس کے سامنے آنسو بہاؤں اب۔ بھائی جان نہیں جو گلے لگا کر خاموش آنسوؤں کی دھارا بنائیں۔ چھوٹے نہیں جو میرے ساتھ تڑپ تڑپ کر روئیں۔ آپ نہیں جو خود مجسم غم ہوں اور مجھے رونے پر منع کریں، ڈانٹیں۔ ڈانٹ جس میں کتنی محبت اور دلداری ہوتی تھی اور خدا کی رضا پر راضی رہنے اور صبر کرنے کی تعلیم یاد دلائیں کہ آپ تو بڑی مذہبی ہیں آپ کیوں روتی ہیں۔

کوئی بھی تو نہیں، نہ باجی، نہ امن، نہ بھابی جان۔ ویسے بمبئی کا تو ذکر کیا وہاں تو اس کو رخصت کرنے اور آخری منزل پہنچانے واقعی ہزاروں لوگ آئے تھے۔ جس نے دولھا بن کر سہرا نہ باندھا تھا، اس کے پلنگ پر ہزاروں پھولوں کے ہار لوگ دیکھ رہے تھے۔ اس شان سے وہ منزل کی طرف جارہا تھا۔ ایسی شان تو صرف لیڈروں اور بڑے آدمیوں کی ہوتی ہے۔ مگر وہ نہ لیڈر، نہ بڑا آدمی، نہ VIP۔ وہ تو قوم اور انسانیت کا ایک خادم تھا، ایک دوست تھا، ایک عزیز تھا۔ یہ سارا مقام اس کے ان دوستوں عزیزوں اور چاہنے والوں نے دیا ہوگا جو اس کے بغیر یتیم ہو گئے۔

ہاں سر۔ ہمارا باچھو بہت پیارا تھا۔ سب کو جو پیار دیتا ہے اُسے پیار ملتا بھی تو کم نہیں۔ اور ابھی تو پانچ ہی دن ہوئے ہیں اور سیکڑوں اخبار اور لوگ عقیدت و محبت کے نذرانے پیش کررہے ہیں اور ابھی کئی برس اور کریں گے۔

مگر یہ دنیا جلد ہی بھلا دیتی ہے جانے والوں کو۔ کس کس کو نہیں بھلا دیا۔ خود غرض دنیا،

خود پرست دنیا۔ آج کی خودنما اور خود پرست دنیا۔ مگر وہ اور آپ سب، نہ زندگی میں جھوٹی اور سستی شہرت کے تمنائی یا خواہش مند تھے، نہ آج اس کے محتاج ہیں!

میرا دل کہتا ہے آپ کی اور سیدین کی طرح وہ بھی ہمیشہ زندہ رہے گا جب تک آپ تینوں کے کارنامے، علم، تعلیم، ادب، فلسفہ اور انسانیت کی سیوا اور ملک وقوم کی خدمت اور قوم کی فلاح وبہبودی کے لیے کام اور ان کی عظمت دنیا پہچانتی رہے گی۔ میرے بھائی، میرا شوہر، میرا باپ زندہ رہے گا اور کون جانے وہ نکتہ نواز۔ میرے بزرگوں اور پیاروں کی کوئی جھلک مجھ میں بھی دیکھ کر مجھے بھی زندہ رکھے۔ مگر اب تو بس دلی تمنا یہ ہے کہ بہت جلد میں ان آزمائشوں سے گزر جاؤں اور اپنے آقا اور مولا کے کرم سے اس کے دامنِ رحمت میں جگہ پاؤں۔

دنیا کی بہت دیکھ لیں اس جگ میں بہاریں
اب دامنِ رحمت میں جگہ پاؤں خدایا

آپ سے کل باتیں ہوں گی۔ اپنی باتیں آپ کی باتیں۔ پرانی یادوں کو تازہ کروں گی۔ آئندہ کی باتیں خدا سے آپ کے ذریعے پوچھوں گی اور دل کے بوجھ کو ہلکا اور زخم کی تپش کو کم کرنے کی کوشش! ابھی تو دل کا یہ زخم اندر ہی اندر لہو دے رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کوئی اس کی باتیں کرے۔ کوئی اس کی باتیں پوچھے۔ کوئی اس کی بچپن کی یادیں سنے۔ کوئی اس غم کو سمجھے جو اس دل میں نہاں ہے۔ مگر قدرت نے اب اتنا صبر دے دیا ہے کہ آپ کے اور بھائی جان کے بعد ہی سے ظاہر سنبھلا رہتا ہے اور باطن بھی سنبھلا ہی رہتا ہوگا ورنہ اب تک اس دل کو پھٹ جانا چاہیے تھا۔ کاش تین ماہ پہلے جو دل کا سخت حملہ ہوا تھا میں اس میں ختم ہوجاتی۔ میری جگہ باچھو میرا غم کرتا۔ میں اپنے سدھارنے والوں کی صف میں کھڑی مسکراتی۔

مگر شکر اور صبر کے سوا اور چارہ کیا ہے۔ سوا اس کے کہ جو کچھ اس کی طرف سے ملتا ہے نیک ہی ہوتا ہے۔ ٹھیک ہی ہوتا ہے۔

آپ کی غم نصیب: مصداق

۶؍جون

میرے رفیق۔ جو آج بھی رفیق ہیں۔

یہاں تبدیلی کے لیے آئے تھے۔صغرا، عزیز اور سیدہ کی یہ خواہش تھی کہ مجھے ذرا سکون مل جائے، چین مل جائے۔ اسی لیے عزیز نے بہترین ریسٹ ہاؤس میں جگہ میرے لیے انتظام کرایا۔صغرا پیکنگ کرنے میں اکثر سوچے بغیر، بھائیوں کی محبت میں جو یہ پلان بنا بیٹھیں کہ رعنا، صفیہ، حسن عابد، انیس اور نگو بھی جائیں، لکھنؤ سے اقبال، شمع اور اس کی بیٹیاں آئیں اور سب لوگ مسوری میں رہیں۔ آتے جاتے یہاں بھی ایک دو دن کو ٹک جائیں یا بیچ میں آجائیں اور وہ آرام کریں۔ ممانی جان سکون سے رہیں۔ صغرا ناول لکھیں اور میں دل و دماغ کو جو حالیہ حادثہ سے اور زیادہ متاثر ہے، اپنے قابو میں کروں۔ عبادت کروں۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے زیادہ دخل نہیں دیا کہ میرا تجربہ ہے کہ جب کوئی بڑی پارٹی جاتی ہے خواہ وہ کتنے ہی قریبی عزیز ہوں پیارے ہوں، گڑبڑ ضرور ہوتی ہے۔

مسوری میں کوئی جگہ نہیں ملی، مگر سب کہتے ہیں انتظام ہو جائے گا۔ حال یہ ہے کہ رضا آرام کرنا چاہتا ہے، نہیں کر سکتا۔ صفیہ بھی آرام اور بچے کی دیکھ بھال کرنا چاہتی ہے مگر سیر کا شوق نہیں۔ انیس بچاری تو خاموش اور ہر پروگرام پر راضی برضا ہیں۔ اقبال کی دونوں خاص کر چھوٹی آفت کی پڑیا ہے۔ دم بھر کو یہ خود سکون لیتی ہے نہ دوسروں کو ہی لینے دیتی ہے۔ بے حد پیاری ہے۔ ذہین ہے مگر معصوم بچی ہے اور بچوں کو کہنے ماننے کی عادت خدا کے فضل سے ڈالی نہیں گئی۔ اقبال کسی وقت چین نہیں لیتا۔ ہنگامہ، بچوں کا شور، بڑوں کا سونے کا وقت نہ کام کرنے کا۔ یہ سچ ہے کہ صغرا نے بہت شوق سے بہت محبت سے بلایا ہے۔ (میں کیا اور میری محبت کیا اور فیصلہ کیا۔ نہ کسی کو منع کر سکتی ہوں نہ مجبور) بہر حال سارا پروگرام پہلے ہی گڑبڑ ہو گیا۔ تجویز ہوتی ہے کہ مسوری چلو۔ تو ہر ایک کی رائے الگ۔ صغرا جانا چاہتی ہے جو یہاں

سے چالیس پچاس میل بہت پُر فضا پہاڑ ہے۔ مگر اقبال ساتھ جائیں تو پوری فیملی ایک دن اور رات کو ننھی کو لے کر سخت سردی میں ضرور جائیں گے کہ بیوی ایک دن کو بھی اس کی بچی کو سنبھال نہیں سکتیں۔ اس پر کسی طرح راضی نہیں اور پھر بچوں کے سارے مسائل۔ میں تو خاموش۔ آپ دیکھیں تو حیرت کریں کہ میں نے کس طرح خاموش رہنا اور صبر کر کے اپنے ہی بچوں کے (اب تک تو یہی سمجھتی تھی نا) معاملوں میں دخل دینا چھوڑ دیا یا کم کر دیا ہے۔ مشورہ تو دیتی ہی نہیں۔ صغرا کو صرف دے دیتی ہوگی اگر چہ اس کا نتیجہ کبھی کبھی خراب بھی نکلتا ہے۔

رہنے کا ارادہ کم تھا مگر اب میرے ٹکٹ تو ۱۶ کے ملے ہیں۔ اقبال کے ۱۵ کے اور رضا وغیرہ کے ۱۰ کے۔ اسی کے مطابق پروگرام بناتے مگر اب ایک اور گمبھیر مسئلہ سامنے آ کھڑا ہوا۔ کل شام رضا کا بچہ گر پڑا۔ ٹانگ میں فریکچر (ڈھائی برس کا کمزور بچہ اور سب کی آنکھوں کا تارا) ہو گیا۔ خیر رات گئے تک بھاگ دوڑ ہوئی۔ ایکسرے ہوئے۔ پلاسٹر چڑھا۔ پوری رات سب کی جاگتے گزری۔ صغرا کا چکر آنا۔ پروگرام آج کا تو ملتوی ہو گیا۔ اب کل دیکھیں کیا ہو؟ رضا صفیہ تو بچے کی وجہ سے اب کہیں جانا ہی نہیں چاہتے کیا سوچ بھی نہیں سکتے۔ البتہ دس تک یہاں رہیں گے۔ اب بھی وہی ہنگامہ۔ مجھے تو شرمندگی بھی ہے کہ دو آدمیوں کا کہہ کر ماشاء اللہ گیارہ آدمی ہیں۔ اگر چہ خرچ سب اپنا کر رہے ہیں۔ ریسٹ ہاؤس بے مثل، وسیع، سامنے میلوں سر سبز درخت۔ فارسٹ ریسٹ ہاؤس ہے نا اور وہ بھی وی آئی پی کا۔ نوکر سب اچھے ہیں (کھانا مہنگا ہے مگر گھر پر کون سنتا ہے) مگر جو منصوبہ بنایا تھا وہ بالکل الٹ گیا۔ اب یہ دعا مانگ رہی ہوں کہ بقیہ دس دن سکون کے گزر جائیں۔ میرے اللہ صغرا کو کام کرنے اور آرام کرنے یا سیر کرنے کا موقع مل جائے اور بس بچے شمع، صفیہ اور اقبال خوش خرم واپس جائیں۔ سب کچھ جھیلو، انتظام کرو اور پھر بھی لوگ خوش نہ ہوں۔ شکایت رہے تو پھر کیا حاصل اس سب سے۔ دراصل میں تو کسی طرح آنا نہیں چاہتی تھی کہ جو بھی ہوگا گھر پر بھگت لوں گی۔ آخر برسوں سے بھگت رہی ہوں مگر صغرا کی خوشی! میرے آرام کی خواہش، خود اس کو آرام کی سخت ضرورت اور

سخت خواہش کہ ان جھنجھٹوں سے ذرا نکلوں۔ اس نے مجھے مجبور کر دیا اور پھر (میری ہی طرح مگر اس وقت فیصلہ آپ کا ہوتا تھا نا) خاندان بھر کو انوائٹ کر کے سب کو خوشی اور مسرت دینے کی جدو جہد۔ نتیجہ کام یہاں بھی ہے، جھگڑے قصے یہاں بھی ہیں۔ سکون و آرام یہاں بھی نہیں۔ اور اب بچّے کی چوٹ نے تو سب کو سخت بے چین کر دیا ہے۔ اگر چہ بچارے رضا صفیہ بہت ضبط و ہمت سے کام لے رہے ہیں۔ انیس تو سدا کے صابر اور بے زبان ہیں۔ مگر میں اس کے دل کی حالت سمجھتی ہوں۔ نگو تو بچی ہے مگر اس کی جان بھتیجے میں اٹکی ہوئی ہے۔ اقبال شمع بھی بہت خیال کر رہے ہیں اور بچیاں بھی بھائی پر نثار ہوئی جا رہی ہیں۔ یہ محبت اور خیال دیکھ کر دل بہت مسرور ہوتا ہے۔ خدا ان سب کی محبت اور دوستی ہمیشہ بنائے رکھے۔

مگر ۷۳۔۷۴ برس کی عمر کی اس منزل میں مجھ میں، مجھ سے زیادہ میرے ذہن اور دماغ میں اس سے زیادہ دل میں، جذبات میں اب طاقت نہیں رہی۔ خود جھیلتی ہوں تو جسم جھیل جاتا ہے۔ جسم جھیل جاتا ہے تو دل و دماغ بھی برداشت کرتا ہے، جبکہ اکثر اپنی مرضی کے خلاف کام کرنا پڑتا ہے۔

خدا حسن عابد کو جلد ٹھیک کر دے اور یہ لوگ مسوری سیر کر کے اطمینان سے صحت مند واپس آجائیں اور میں تندرست اپنے گھر پہنچ جاؤں۔ اب تو بس دعائیں ہی رہ گئی ہیں۔

میری جان! ڈانٹ آپ بھی دیتے تھے۔ پریشانی کو محسوس کر کے پھر دلداری کرتے تھے۔ اصل تکلیف کو محسوس کرتے تھے۔ جانتے تھے گھبرا جاتی ہوں مگر کرتی سب خود ہوں۔ اس وقت تو سب خرچ ہی ہمیں ہی اٹھانا پڑتا تھا۔ اب تو اقبال، رضا اپنی اور اس فیملی کا خرچ خود اٹھاتے ہیں اور میں اور صغرا مل کر اپنا اور کچھ دوسروں کا۔ مگر آپ چاہتے ہیں۔ ہاں اس وقت سب ہماری حیثیت اور ہماری مرضی سے ہوتا تھا۔ اب ان لوگوں کی حیثیت اور خواہش کے مطابق ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔

سوچا تھا، کہا بھی تھا کہ آپ کے بعد اب میں ہر ذمہ داری سے معافی چاہتی ہوں اور ہر

جھنجھٹ سے آزاد رہنا چاہتی ہوں۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہ ہوا۔ خاندان کو یہ منظور نہ ہوا بلکہ یقین ہی نہ آیا۔ پھر صغرا۔ میری جگہ سرپرست اور سردھری اور خرچ اور کاموں کا، مہمان داریوں اور خاطر داریوں کا اور ساری خدمتوں کا بار اٹھانے پر تیار۔

بچے سب مجھے بھی عزیز ہیں کہ یہ سب بھائی بہن اور بھانجیوں بھانجوں اور ان کے بچے ہیں مگر جب گرہ میں مال (طاقت) نہیں جسم میں قوت نہیں تو سب بوجھ بن جاتا ہے نا اور پھر روز کی بیماریاں۔ دکھ اور مصیبت میں صغرا اور انیس اور اس کے بچے ہی تو ساتھ دیتے ہیں۔

آج موسم گرم ہے۔ رات بجلی غائب رہی۔ جاگتے گزری۔ بے وقت سونے کی عادت نہیں۔ کچھ طبیعت بھی خراب ہے۔ اس وقت برآمدے میں جہاں بے حد تپش ہے، بیٹھی ہوں۔ بہت دن سے دل کی باتیں نہ کی تھیں اس وقت دماغ الجھا ہوا تھا۔ سوچا بھڑاس نکال لو اور پھر آپ جانتے ہیں کہ میرا دل خدا کا شکر و احسان ہے، آئینہ کی طرح شفاف ہے۔ غصہ، شکایت اور کینہ (آپ کی طرح یہ تو نہیں کہوں گی کہ اس سینہ صافی میں تھا ہی نہیں) تک نہیں رہتا۔ چند گھنٹے زیادہ سے زیادہ چند دن اور پھر سب کو معاف کر کے دل کو جو سکون ملتا ہے، جو راحت ملتی ہے وہ میرے اس دکھ کا مداوا اور خدا کی رحمت کا سکون ہوتا ہے۔ لہٰذا پھر دل اس کی یاد۔ آپ کی یاد میں مگن ہو جاتا ہے!

جی چاہا تھا کہ ان سارے سفروں کی آج یاد تازہ کروں تو پہاڑوں کے خصوصاً مسوری، دہرہ دون کے ہم دونوں نے مل کر کیے تھے۔ مگر یہ سب رہ گیا۔ دل میں لاوا ابل رہے تھے اور جو پریشانی ذہن میں جاگزیں تھی۔ اس کا قصہ سنانے بیٹھ گئی۔

زندہ رہی۔ سکون ملا تو کل پھر باتیں کریں گے۔ اگرچہ اب باتیں کرنے کو بھی دل نہیں اٹھتا۔ یہ جی چاہتا ہے ہردم کہ جہاں آپ اور سب میرے پیارے ہیں، خدا مجھے وہیں پہنچا دے۔ اپنے دامنِ رحمت میں لے لے۔

عزت و محبت کی بہت دیکھیں بہاریں اس دنیا میں ہم نے اب آرزو یہ ہے کہ خالق کے

دامنِ رحمت میں جگہ پائے یہ عاصی۔ ۶ / جون ۸۷

۷/ جون

(دہرہ دون)

میرے بچھڑے دوست!

جب سے یہاں آئی ہوں اور ذرا سی فرصت ملی ہے وہ سارے سفر یا ان میں سے بہت سے یاد آرہے ہیں جو ہم دونوں نے پہاڑوں کے، پرفضا مقاموں کے، ہند کے، پاکستان کے، مغرب کے مقامات مقدسہ کے مل کر کیے تھے۔

میں نے کہیں لکھا ہے کہ مجھے بچپن سے سیر و سفر کا شوق تھا۔ چھوٹی سی عمر اماں کے ساتھ آتی جاتی اور سمجھتی بڑا سفر کرڈالا۔ باجی اور بھائی صاحب میرٹھ لے جاتے اور میں خوش ہوتی کہ ایک اور جگہ دیکھ لی۔ حالانکہ ان دونوں جگہ صرف ٹرین میں بیٹھنے تک سفر کا تصور تھا، سیر کا نہ تھا۔ البتہ ایک بار بھائی حامد وغیرہ نے راشٹر پتی بھون اور سیکریٹریٹ کی بنتی ہوئی عمارتیں دکھائی تھیں اور بہت کچھ گویا دیکھ لیا تھا۔ پھر اماں کی بیماری اور صحت کی کوشش کے سلسلے میں اماں اور بہت سے بھائی بہنوں کے ساتھ (ہائے ان میں چھوٹے تھے، امن تھی، باچھو تھا، اور کئی اور بہن بھائی تھے) شملہ گئے تھے۔ بھائی حامد اور ماموں منظور کے ہاں ٹھہرے تھے اور سارے دن ہم سب بہن بھائی شملہ کے مشہور بازاروں، مال روڈ اور جانے کہاں کہاں کی سیر کرتے، شرارتیں کرتے، اپنے...... پیسوں سے چنے، مونگ پھلی، خوبانی یا اخروٹ لے کر کھاتے۔ لکڑی کی چیزیں اور گڑیوں کا فرنیچر کتنا سستا اور حسین ہوتا، وہ خریدتے۔ ہاں یہ سفر یادگار تھا، یادگار رہے گا۔ اماں ساتھ تھیں۔ ماموؤں کی خاطر داری تھی۔ وہ کھڈ، وہ پہاڑیاں وسبزہ، وہ...... کا میدان اور وہ اماں کے سینے سے لپٹ کر سو جانا۔ آج ۶۲-۶۳ برس بعد بھی وہ سب یاد ہے۔

اور پھر وہ طول طویل مقدس سفر جب اماں، بہنوں، چھوٹے اور خاندان کے بہت سے

اور لوگوں کے ساتھ کیا تھا۔ تکلیف تھی کٹھنائیاں تھیں، پیسہ کم تھا، اماں کی صحت کمزور تھی۔ مگر کیا راحت تھی، کیا سکون تھا۔ کیا روحانی خوشی تھی اور پھر اتنے بڑے خاندان کے ساتھ، اتنے پیارے ساتھیوں کے ساتھ جن میں بھائی محبوب اور سعید تھے۔ خلیقہ تھی، چھوٹی سی حسین ترین شریف ترین بچی!

جہاز کے سفر، وہاں سے بغداد تک ''مرکب حیدری' کا بے حد تکلیف دہ سفر، (جو اس وقت ذرا بھی تکلیف دہ نہ لگتا تھا) مقامات مقدسہ کی زیارتیں۔ کاظمین شریف، سامرہ، کربلائے معلیٰ، نجف اشرف اور وہاں مدفون سارے شہدائے کربلا اور مولائے کائنات علی مرتضٰی کے مزار ہائے مقدسہ کی زیارتیں۔ اماں اور پھوپی اماں اور بہنوں کے ساتھ میں بھی۔ ہاں تو جس کی مصداق بھی عقیدت کے پھول اور آنسو دامن میں رکھتی تھی۔ دعائیں مانگتی کس کی۔ اماں کی زندگی اور صحت کی اور بھائی جان کی سلامتی کی جو اس وقت تعلیم پا رہے تھے اور خدا جانے کس بات کی جو یاد بھی نہیں اور پھر وہاں سے واپس آکر بھائی جان کے اصرار پر چچا ابا کے حکم پر ہم سب کمارہٹی گئے جو سولن کے قریب ہے جہاں قریب ہی ٹی ٹی کا سینی ٹوریم تھا۔ گھر کے برابر بہتا بے حد حسین چشمہ، سامنے سرسبز اونچی پہاڑیاں اور دور دور پھولوں کی جھاڑیاں۔ شاید نواب پٹیالہ کی کوٹھی تھی۔ چشمہ میں نہانا اور پیر لٹکا کر بیٹھ کر میرا اور امن کا باتیں کرنا۔ کہانیوں کا ابھرنا۔ تخیل میں افسانوں کا ڈھلنا جس کی ہیروئن شاید میں خود ہوتی اور ہیرو میرے بھائی جان اور پھر بھائی جان کا اور آپ کا کمارہٹی میں آنا۔ ہم لوگوں کی جوش و خروش سے تیاریاں۔ وہیں تو میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا تھا۔ بھائی جان کے ایک بہت عزیز اور محترم دوست کی صورت میں۔

اور پھر ہم واپس آگئے۔

اور گھوڑا کھال کا وہ سفر۔ جب اماں کی طبیعت بہت خراب تھی۔ جب صحت کی بحالی کے لیے وہ نواب رام پور کے ایک معمولی سے محل میں (زیدی صاحب کی معرفت حاصل کیا ہوا)

ٹھہری تھیں۔ اماں تھیں، چھوٹی باجی تھیں، پھوپی اماں تھی، خلیقہ تھی۔ علاج، دن رات دعائیں پڑھنا، پرہیزی کھانا پکوانا اور اماں کو کھلانا، چھوٹی پھوپی اماں کے سپرد تھا۔ یہاں سیر و تفریح برائے نام تھی۔ دل اندر سے بیٹھا جاتا تھا۔ چھوٹی باجی کے ساتھ اکثر رات کو میں بھی جاگتی۔ کبھی وہ سوجاتیں تو میں اور خلیقہ دعائیں پڑھتے۔ بڑی بڑی دعائیں اور پھر وہیں کرسی پر لڑھک جاتے۔ کبھی سیر کو نکل جاتے تو کچے پکے پھل اور ہری ہری گھاس اور خوبصورت پہاڑیاں مرکزِ نظر ہوتیں۔ بچپن تھا نا۔ صورتِ حال کا کوئی احساس نہ تھا نا! پھر بھائی جان وہاں آگئے۔ شاید چچا ابا بھی آگئے۔ اماں کو اور ہم سب کو دلی لے آئے۔ وہاں ان کا علاج شروع ہوا اور دو تین مہینے میں خبر، سب آرزو میں آگ لگ گئی! اماں سدھار گئیں۔ اپنے یتیم بچوں کو اپنی لازوال اور بے پایاں محبت سے محروم کر گئیں۔ کیسے وہ زمانہ گزرا، یہ بتانے اور سنانے والی کیفیت نہ تھی۔ مگر چند مہینے کے اندر اندر میں اور چھوٹی باجی مہینوں بیمار پڑ گئے۔ چچا ابا دہلی لائے۔ علاج کرایا۔ وہ بظاہر درست ہوگئی۔ چھوٹی باجی کی صحت بگڑ گئی۔ وہاں سے بھائی جان علی گڑھ لائے اور مجھے، چھوٹے، صابرہ پھر ان کے ساتھ ہمیں ماموں منظور اور بھائی حامد کے گھر بھیج دیا، صحت کی بحالی کے لیے۔ ہائے کتنے ناواقف ہیں ہم صحت و بیماری، موت، زیست اور خدا کی مصلحت کے درمیان جو رشتہ ہے اس سے۔

اور پہلی محرم اور جون کی کسی تاریخ کو جب ہم سب بھائی جان کا انتظار کر رہے تھے۔ اچانک ان کی طبیعت بگڑی اور رات بھر میں میری پیاری دلکش حسین فرشتہ سیرت، محبت کا مجسمہ، مجھ سے سات برس بڑی مگر ماں کا بدل، میری گود میں، میرے سامنے خدا کو پیاری ہوگئیں اور ہم ان کو لے کر پانی پت آئے جہاں آپ بھائی جان کو لے کر آگئے تھے اور باجی اور بھائی صاحب اور سارا خاندان اور سارے دوست۔ پورا شہر، پورا محلہ، پورا گھر، پوری بستی۔ میں نہیں جانتی کہ کہاں کہاں کون کون ان کے غم میں ڈوبا تھا۔ پورا خاندان بے قرار تھا اور سب سے زیادہ میرے بھائی جان اور چھوٹے اور میں۔ میں خود کہاں تھی، کس حال میں تھی، کس کیفیت میں

تھی؟ یہ خدا ہی جانتا ہوگا۔

بھائی جان کو آپ اور چچا ابا اور زیدی صاحب جو دونوں بے پناہ غم میں ڈوبے تھے، سفر پر لے گئے۔ ایک کی بیٹی سے زیادہ لاڈلی بھتیجی، دوسرے کی محبوب منسوبہ[1] بچھڑی تھی۔ بچپن کڑیل جوانی میں مگر بھائی جان ان کو ان سے بھی زیادہ پیارے تھے۔ بہت سے سفروں کے ساتھ زندگی کے سفر کا یہ حصہ ختم ہوگیا۔ لڑکپن، بچپن، غم کی آگ بھی جل کر بھسم ہوگیا اور سوگوار نوجوانی، زخمی پختگی، جوں جوں شعور نے جنم لیا۔

بھائی جان کی سال اندر شادی۔ بھائی جان کی سسرال نینی تال دو تین بار بھائی جان کے ساتھ جانا۔ زبردستی کی خوشی اپنے اندر طاری کرنا۔ اور یہ شاید میرا آپ کے ساتھ پہلا پہاڑ کا سفر تھا اور پھر یہاں سے تا حال ایک ساتھ سیر و سفر کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ دلکش، حسین، دل خوش کن، دلفریب محبت کے جھولے میں جھولتا ہوا خواب جو حقیقت تھا!

جو بھائی جان کی اور آپ کی محبت اور صحبت اور بھابی کی شفقت میں گزرا۔ سات سال۔ ہاں سات بار ہم مہینوں کے لیے بھائی جان کے ساتھ کشمیر جاتے اور رہتے اور کہاں کہاں کی سیر نہ کی ان محبوب ہستیوں اور آپ کے ساتھ۔ کشمیر کے کیسے کیسے حسین مقامات، گل مرگ، کھلن مرگ، ٹنگ مرگ۔ اننت ناگ، مٹن وہ پانچ چشموں والا شہر جہاں کا پانی آب حیات تھا جہاں ہم زہرا کو لے کر آٹھ دن رہے تھے اور آپ کی اور اس کی صحت اتنی اچھی ہوگئی تھی۔ کیوں مجھے اس وقت اس کا نام یاد نہیں آ رہا ہے؟ اور پھر ہائے حسین ترین پہل گام، اس کے آگے اونچی پہاڑیاں اور جانے کہاں اور کہاں؟ اور سری نگر کے بارہ مولہ اور چشموں اور ڈل کی سیر کا تو ذکر ہی کیا! سیکڑوں بار اس کا لطف اٹھایا اور شنکر اچاریہ کی اونچی سیڑھی اور مقدس مندر کی سیڑھی، چڑھائی پر ہانپتے ہوئے چڑھتے اور دوڑتے ہوئے اترتے۔

کشمیر۔ اے میرے کشمیر! پیارے! تیرے تو کونے کونے سے میری زندگی کی سب سے

---

[1] سیدین صاحب کی بہن سیدہ کی منگنی بشیر حسین زیدی سے ہوئی تھی

خوشگوار اور حسین یادیں وابستہ ہیں۔ جب آپ میری زندگی، میرے ساتھ ہوتے جب میرے بھائی جان میری جان مجھے ساتھ لے کر سیر کراتے، جب اکثر میرا سب سے پیارا بھائی چھوٹے بھی ہمارے ساتھ ہوتا اور کبھی کبھی باچھو بھی۔

مگر بھائی جان کے ہاں سے آجانے کے بعد کشمیر ہم سے دور ہو گیا۔ پھر بھی ان کے بعد ایک بار ان کی کتابوں کو ایڈٹ کرنے ہم اور آپ وہاں گئے تھے۔ ہاں اس سے پہلے ان کے لکچر یادگاری میں بھی گئے تھے۔ مگر سیریں نہ کی تھیں، دعوتیں نہ کھائی تھیں۔ کشمیر کا چارم اور حسن کو میرے لیے بھائی جان کے ساتھ ختم ہو گیا تھا نا!

کشمیر جنت نظیر! میں نے نو بار تیری وادی کی سیر کی، تیرے پہاڑوں، چشموں، دریاؤں، مچھلیوں، سبزہ زاروں پہاڑوں کی کشش میں تیرے پاس گئی اور ہر بار ایک نئی امنگ اور جان لے کر آئی کہ وہاں دو نعمتیں تھیں، تیرا نظارہ اور بھائی جان اور عابد کا ساتھ!

اب وہ کشش۔ جانے کہاں گئی! اور صحت نے بھی جواب دے دیا۔ جہاں جانے کے تصور سے بھی بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔

بھائی جان کشمیر سے آگئے تو رام پور، بمبئی میں رہے اور ہم ہر سال ان کے پاس جاتے رہے۔ اس دوران ہم کتنی بار شملہ گئے۔ ایک بار اس وقت جب آپ نے پائیریا کی وجہ سے اور وہم کی وجہ سے جو آپ کو بیماریوں سے تھے۔ اپنے سارے دانت نکلوا دیئے تھے۔ ہم اور آپ اور بھائی جان اور ان کی بیوی اور بچے سنجیولی کی ایک کوٹھی میں رہے تھے۔ کتنی خوبصورت، کتنی پر سکون، کتنی آرام دہ کوٹھی اور ماحول تھا۔ بھائی جان کی پیاری پیاری بچیاں جو پہلے ہمارے ساتھ رہیں اور پھر ماں باپ بھی آگئے۔ لمبی لمبی چہل قدمیاں، دور دور تک جانا۔

اور پھر وہیں راس مسعود صاحب کے انتقال کی خبر ملی۔ سب ہی کو بہت صدمہ ہوا۔ بھائی جان اور وہ کس قدر عزیز دوست تھے۔ ان کو بھائی جان سے محبت تھی اور بھائی جان کو ان سے عقیدت۔ مگر ہم سب نے مل کر ان کو سنبھال لیا۔ وہ تو صبر کا مجسمہ تھے۔ پھر بھابی جان جو ان کو

بے حد چاہتی تھیں اس کی دلداری کرتیں۔

شملے ہم اس کے بعد اور پہلے بھی گئے تھے۔ ایک بار باجی صفیہ اور بھائی حامد اور ماموں منظور کے ہاں ٹھیرے تھے۔ ایک بار شملہ کے اونچی تعلیم کے انسٹی ٹیوٹ میں چند دن رہے تھے جو راج بھون میں تھا جس کی پہاڑی، جس کے باغ، جس کی عمارتیں، جس کے پھول اور لان ہر چیز اپنی جگہ لاجواب تھی۔ اس بار آپ کو وہاں ریسرچ کرنے کا موقع بھی مل رہا تھا۔ اتنی خوبصورت اور پرسکون جگہ، اتنی بڑی فیلوشپ اور اتنے اچھے ساتھی۔ مگر آپ کا جی چاہتا تھا۔ بھائی جان کا اصرار تھا۔ میں بہت چاہتی تھی مگر اب بھی دمہ کے حملے چین نہ لینے دیتے تھے۔ وہاں کی سردی کیسے برداشت ہوگی۔ آپ کا کہنا تھا، آپ آتے جاتے رہیں گے، تم یہاں رہنا، گرمی میں آجایا کرنا۔ اور پھر ایک دن میں نے کہا تھا، سر! اس عمر میں دونوں کا ایک دوسرے سے جدا رہنا، نہیں سر! مجھے روپیہ نہیں چاہیے۔ آرام و آسائش کا کیا کرنا ہے۔ آپ کے بغیر رہنا میرے بس کی بات نہیں۔ آپ نے کام کا ذکر کیا۔ میں نے کہا آپ جہاں رہیں گے اور جو کام کریں گے، وہ اعلیٰ پایہ کا آپ کے مذاق کا ہوگا، کیوں نہ ہم دونوں اسی زندگی پر قناعت کریں۔ ہائے کتنا آپ کو میرا خیال تھا اور میری جدائی خود بھی گوارا نہ تھی۔ آپ نے اس خیال کو چھوڑ دیا۔

اور پھر ایک بار جب آپ کے جرمنی سے آنے کے بعد جامعہ سے رٹائرڈ ہوجانے کے بعد ذاکر صاحب کی تجویز اور زیدی صاحب کے اصرار پر تین سال کے لیے آپ نے علی گڑھ جاکر جنرل ایجوکیشن کا کام سنبھالنے کا وعدہ کرلیا تو میں بھی پہلی بار اپنا گھر ' دلی، جامعہ چھوڑنے پر تیار ہوگئی۔ صغرا نے کہا میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ تین سال ہم تینوں نے وہاں بسر کیے۔ شاید اتنی خوشی اور مسرت، آرام، (عیش نہیں، پیسہ نہیں کہ وہاں بھی آپ کا ایثار چلتا تھا) ہم نے اور کہیں نہ اٹھایا تھا۔ نوکر اچھے تھے۔ گھر اچھا خاصا بڑا تھا۔ دوست بظاہر مخلص تھے۔ میرے قدردان بہت۔ گرلز کالج اور مسلم یونیورسٹی دونوں کے لوگ تھے۔ اور آپ نے اپنے نزدیک

بہترین ٹیم اپنے کام کے لیے چنی۔ سالم، مونس، خورشید، مبین اور چپراسی وغیرہ۔ اور کتنا شاندار، کتنی مفید، کتنی اعلا پایہ کا کام کیا اور کرایا۔ کتنی کتابیں لکھیں اور لکھوائیں اور ان تینوں ساتھیوں کو پڑھانے، ان کی علمی اور ادبی قابلیت کو جلا دینے اور ان کے لیے آگے کے راستے ہموار کرنے کی کیسی کیسی کوشش کی۔ یہ کون جانتا ہے کہ جنرل ایجوکیشن کی لاکھوں کی بلڈنگ کے لیے آپ ہی نے اور بھائی جان نے مالی مدد لی اور پھر وائس چانسلر زیدی صاحب اور ذاکر صاحب کی سفارش۔ تیس لاکھ کی یہ بلڈنگ آج بھی اپنے خاموش، نام ونمود سے بے گانہ بانی کی یادگار، جاننے والوں کو آپ کی یاد دلا دیتی ہوگی۔

ہم علی گڑھ سے رانی کھیت گرمیوں میں گئے آپ کی پوری پارٹی کے ساتھ۔ سرور صاحب اور ان کی بیگم غزالہ اور انور انصاری اور کئی اور ساتھی بھی تھے۔ چھ سات ہفتے ہم نے وہاں گزارے۔ کس قدر رونق تھی، کیسی صاف ستھری، خاموش جگہ گہرے کھڈ، عمدہ سڑکیں، پھولوں کی روش۔ سامنے ہمالیہ کی بہت حسین چوٹیاں جن کے نام غالباً نندا دیوی اور جانے کیا تھے۔ صبح ناشتہ کے بعد دیودار کے دو درختوں کے نیچے چٹان، سامنے وہ برف پوش پہاڑیاں اور پھلوں کے آس پاس درخت تھے۔ فرش یا لباس ڈالے ادب وعلم کے رسیا اور خادم اپنی زندگی کی سب سے بڑی مسرت، لکھنے میں یا پڑھنے میں مصروف رہتے۔ تین گھنٹے، چار گھنٹے دل جمعی سے کام کرتے۔ بیچ میں چائے یا کافی اور لنچ کے وقت سب اکٹھے ہو جاتے۔ ہمارا باورچی ٹیکسی چلا رہا تھا۔ شام کو لمبی لمبی سیریں، تفریح اور رات کو کبھی بے چین اور کبھی پرسکون نیند۔ میں حسب دستور کچھ نہ کچھ بیمار تھی۔ مگر اس وقت بیماری سے ہار نہ مانتی تھی نا۔ اور پھر جب آپ ساتھ ہوں تو فکر میری کیوں، سب آپ کو ہی ہوتی تھی! زیدی صاحب نے کس جدوجہد اور ارمان سے علی گڑھ والوں کے ٹھہرنے کے لیے یہ فلیٹ خریدا تھا۔ مگر افسوس جس طرح آپ کے آنے کے بعد حاسدوں اور نااہلوں نے آپ کے کام کو ختم کر دیا۔ تین سال کے ایسے کام کو جس کو آپ کے سوا نہ کوئی کر سکتا تھا نہ کر سکا۔ نہ شاید اب کر سکے۔ اس طرح زیدی صاحب کی وہ ساری کوشش بھی

بے کار ہی گئی۔

رانی کھیت میں اب بھی وہ کوٹھی وہ کوارٹر مسلم یونیورسٹی کے ہیں اور کبھی کبھی لوگ چلے بھی جاتے ہیں۔ مگر شاید کھنڈر کی صورت میں پڑی ہوئی ہے۔

علی گڑھ سے آ کر پھر ہم مختلف جگہ جاتے رہے۔ مسوری کتنی بار گئے۔ ۵۴ء میں جب بلقیس کی شادی ہوئی ہم وہیں سے شرکت کو آئے تھے۔ اس سے پہلے بھی گئے تھے۔ اس کے بعد بھی دو تین بار گئے۔ ایک بار، پہلی بار شریفہ بہن اور حامد علی صاحب کے ساتھ دو ہفتے ٹھہر کر الگ گھر لے کر رہے تھے۔ دوسری بار مسز مجیب اور ان کے خاندان والوں کے ساتھ ہم آپ، اقبال اور صغرا ایک ہی کوٹھی میں رہتے اور شام کو لمبی لمبی واک، کبھی فلم، کبھی گھوڑے کی سواری۔ دوستوں سے جو وہاں آئے ہوئے تھے ملاتے۔ اور پھر ایک بار ہائے، آخری بار ان کے ساتھ بھائی جان اور بھابی کے ساتھ تھے۔ ہ گورنمنٹ رسٹ ہاؤس میں بہت دور ٹھہرے تھے۔ ہم ہاکنس کاٹج جو چار کمروں پر مشتمل تھی، مین روڈ پر ہاکنس ہوٹل کے برابر۔ پھر وہی کام کرنا، شام کو وہی سیریں۔ اکثر بھائی جان کے پاس جانا، اکثر ان کا آنا۔ محبت میں دوری نہیں ہوتی کتنی بھی فاصلے کی جگہ ہو۔ وہ جگہ جگہ ایجوکیشن انسٹی ٹیوٹ وغیرہ میں اوروں کے ساتھ ہماری دعوتیں۔ ایک سے ایک خوبصورت جگہ جانا۔ گھوڑے کی سواری آپ، نہیں آپ تو کشمیر کی سخت سے سخت چڑھائی پر بھی پیدل ہی چلتے تھے۔ بھائی جان چلے گئے تو سیدہ کو ہمارے پاس چھوڑ گئے۔ وہ سیدہ صغرا اور اقبال کی شرارتیں، چہلیں، شیطانیاں اور ہم جن کو جان کر بھی انجان بن جاتے۔ یہ ہماری بہن اور بھائی کے۔ کیا اپنے بچے اس سے زیادہ ہوتے ہیں۔ نہیں جانتی!

وہیں تو ہماری صغرا کا میٹرک کا رزلٹ آیا تھا۔ اس کی علمی قابلیت کا دروازہ وہیں کھلا تھا۔ وہیں سے اس نے ادبی دنیا میں تھوڑا تھوڑا مقام بنانا شروع کیا تھا۔ سر! آج آپ کی صغرا اردو کی مانی ہوئی ادیبہ ہے۔ بہت اچھی استاد ہے۔ اب تو ریڈر ہوگئی ہے۔ آپ کا اقبال اس نے اپنے میدان میں ترقی کی ہے۔ یہ سب تو آپ کے سامنے ہی ہوا تھا۔ سیدہ نے بھی علمی دنیا میں

بہت کام کیا۔ انگلش میں پی۔ ایچ۔ ڈی اور اب انگریزی ادیبہ ہے اور ترجمہ پر توجہ دے رہی ہے۔ کیا یہ سوچ کر مجھے خوشی اور فخر نہ ہو کہ اس میں اس سب میں آپ کا بھی ہاتھ ہے بلکہ بہت بڑا حصہ اور تھوڑا سا میرا بھی۔ اپنے بچوں کی علمی ادبی کامیابی سے زیادہ فخر اور خوشی کس سے ہو سکتی ہے۔

آپ کے ساتھ کتنی بار مسوری آئی، اب یاد نہیں۔ دو بار دہرہ دون بھی آئی۔ مگر نہیں۔ نہیں۔ ابھی تو اس کا ذکر پھر آئے گا۔ ابھی تو طاقت نہیں۔

....

۵۳ء میں وہ دونوں جرمنی گئے۔ اس سے پہلے چار ماہ کے لیے آپ کسی سمینار یا ورک شاپ میں میسور گئے تھے۔ ہم نے مدراس، میسور، بنگلور کی سیریں کی تھیں۔ کتنا حسین موسم تھا، کتنی خوبصورت فضا تھی، کتنے عمدہ سین تھے، کیسے حسین باغ تھے۔ اور وہیں ہم نے شہید ملت و وطن عظیم انسان ٹیپو سلطان اور حیدر علی کے مزاروں کی زیارت کی تھی۔ فاتحہ پڑھ کر اور دعا کر کے ان کو خراج عقیدت ادا کیا تھا۔ ٹیپو سلطان جسے آج ہندستان بھلا بیٹھا ہے، آزادی اور حق کی لڑائی کا شہید، جس نے سب سے پہلے اس خطرے کو محسوس کیا اور وطن کے لیے لڑا اور جان دے دی۔ ہم کس کس کو نہیں بھول بیٹھے۔ نام کو برسی یا پیدائش پر دو چار کے لیے فنکشن ہو جاتا ہے جس کا مقصد ہوتا ہے موجودہ اقتدار کا پروپیگنڈا۔ ان کی آزواز دوسروں کو ہی نہیں خود اپنے ہی کو سنانا۔ بھائی جان کہا کرتے تھے فلاں کو اپنی آواز بہت پسند ہے یعنی بہت بولتا ہے۔ اب آواز اور صورت دونوں کی پسندیدگی ٹی۔ وی کی بدولت حاصل ہوگئی ہے۔

اور پھر وہاں سے ہم اپنے سب سے بڑے اور سب سے خوشگوار بدیسی سفر پر روانہ ہوئے۔ بمبئی میں حارث صاحب اور چھوٹے کے مہمان رہے اور پھر سمندر کے جہاز اٹلی سے وکٹوریا جہاز میں روانہ ہوئے۔ بارہ دن سمندر کے سفر کا لطف اٹھایا۔ آپ کو کچھ جرمن دوست مل گئے۔ کچھ ہندستانی ساتھی جن میں اختر حسین سفیر پاکستانی بھی تھے اور مشہور آرٹسٹ فدا حسین

بھی اور اڈ گا سکر جرمن لیڈی بھی۔ ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوکر آرام کرسیوں پر بیٹھ کر آپ اور میں دونوں اپنا تحریری کام کرتے۔ آپ ''قومی تہذیب کے مسئلے'' کو نئے سرے سے اور انگریزی میں لکھنے کی تیاری اور میں سفر نامہ اور ناول لکھتی اور لوگ حیرت سے ان دو عجیب میاں بیوی کو دیکھا کرتے۔ کیا رونق ہوتی تھی ڈک پر۔ سامنے بلکہ چاروں طرف نیلا سمندر لہریں مارتا ہوا اور بیچ میں ننھے سے جزیرے کی طرح ہمارا جہاز جس کے وسط میں چھوٹا سا خوبصورت حوض جس میں ننھے بچوں کے ساتھ لمبے تڑنگے سکھ اور نازک اندام جرمن عورتیں بھی غوطے لگاتی تھیں اور راتوں کو کبھی فنکشن کبھی فلم کبھی کچھ کبھی کچھ۔ ہم تو کم ہی شریک ہوتے تھے۔

اور پھر ہم ایک دن اٹلی کی سیر کرنے۔ ٹرین میں سوار ہوئے جو سوئز آئی لینڈ اور جرمنی تینوں ملکوں کو پار کرتی تھی اور مسافروں کو ذرا پریشانی نہ ہوتی۔ پریشانی تو میرے سامان کی زیادتی کی وجہ سے مجھے، آپ کو اور بچارے اسٹیشن ماسٹروں کو ہوتی تھی۔

اور پھر ہوب کا اسٹیشن جس پر (اور کہانی نہیں) جنگ کے نشانات اور اثرات عیاں نظر آرہے تھے اور وہاں سے دوسری ٹرین اور جرمن کے یونیورسٹی ٹاؤن ٹیوبنگن میں جانا۔ جہاں آپ کے محبوب بزرگ اشپرانگر کا قیام تھا اور جو اپنی نسبتاً جوان بیوی کے یاتھ جو رفیق بھی تھیں، محبوبہ بھی اور سیکریٹری بھی (آپ کی بیوی بھی اس کی ناقص سی تصویر تھی نا) وہ ہمیں لینے اسٹیشن آئیں اور وہاں کے سستے، آرام دہ ہوسٹل یا ہوٹل پرنس کارل کے ایک بڑے کمرے میں ہمارے ٹھہرنے کا انتظام کیا۔ اس سفر کی وہ کہانی تو میں نے چار پانچ سو صفحوں میں لکھی تھی مگر چھپنا اس کی قسمت میں نہ تھا۔ پرنس کیرل کے وسیع تیسری منزل کے کمرے میں (صبح تو تین بجے ہوجاتی تھی، جون کا مہینہ تھا نا اور گرجا گھر میں سات بجے سائرن کے گھنٹے بجا کرتے تھے) مگر ہم خوش تھے بہت خوش۔ آپ نے کہا تھا میں آپ کو بیس برس بعد اپنے مادر علمی میں ہنی مون' منانے لایا ہوں یعنی سیر کرانے کا آپ کا پرانا وعدہ تھا نا۔ جب ہم زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی سے دوچار ہوئے تھے تو آپ نے دلدہی کے طور پر کہا تھا مصداق! اب ہم سیر کو

چلیں گے، یورپ کی سیر کو، جرمنی جائیں گے آپ کی دیرینہ آرزو پوری ہوگی۔ بیمار و نحیف مصداق نے بیکسی سے آپ کو دیکھا تھا۔ آنکھوں آنکھوں میں سوال کیا تھا اور بچی کا کیا ہوگا؟ جانے آپ سمجھے تھے یا نہیں اور میں تو گھپ اندھیرے میں یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ پانی پت میں پل رہی ہے۔

خیر، تو ہم نے پانچ مہینے اکٹھے یورپ میں گزارے۔ اگر چہ وہاں بھی میری پرانی رفیق بیماریوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ دمہ کا سخت حملہ، کھانسی اور دوسری تکلیفیں۔ ٹیوبنگن کے ڈاکٹروں، اسپتال کی نرسوں اور وہاں کے دوستوں کی محبت اور خدمت کس کس چیز کو یاد کروں آج بھی وہ بے لاگ خدمت اور محبت نہیں بھولی ہوں، نہ بھولوں گی۔ میرے ساتھ آپ کی خاطر اور دلداری بھی کم نہ تھی۔

ہاں پھر ہم نے الگ گھر لے لیا۔ کھانا پکانا شروع کر دیا تھا۔ لینڈ لیڈی بہت محبت کرتی تھی۔ مگر جرمن عورتیں کنجوس زیادہ ہوتی ہے اور یہ بیوہ مراڈ اسمتھ تو کچھ زیادہ ہی تھی۔ ہمارے غسل خانے کے چارجز بھی الگ کرتی تھی۔ بجلی میں کفایت، برتن دھونے کے سنک تک میں کنجوسی۔ مگر ویسے بچاری بڑی ہمدرد تھی اور دوسرے دوستوں کا ذکر بھی کیا۔ فراڈ اشیر انگر پروفیسر صاحب خود پرنس کارل ہوٹل کا پورا عملہ، عزیز الرحمٰن علی گڑھ کے طالب علم سبھی کی محبت اور خلوص کا نقش دل پر ہے اور ہائے جان ہار کریم۔ کتنی جلدی وہ جوانی میں چل بسا اور ہم سب کی اس سے کتنی دوستی ہوگئی تھی۔

اس دوران ہم نے پیرس اور آس پاس کی سیر کی۔ پیرس میں بارہ دن رہے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں۔ بھائی جان پیارے کے ساتھ۔ دن میں آپ دونوں یوسلو جاتے۔ اکثر میں بھی چلی جاتی اور پھر آپ کی اور بھائی جان کی دوستوں، مرد اور عورت سبھی سے ملاقات ہوتی۔ دونوں کی دلکش حسین شخصیت اور ظریفانہ گفتگو سے متاثر ہوتے اور آپ کی علمی متانت اور غیر معمولی قابلیت سے مرعوب اور مسز حسین کی صلاحیتوں اور (بقول ان کے) پرکشش سیرت و

صورت میرے خیال میں صرف لباس سے۔

دوپہر کا کھانا ہم یونسکو کے میس میں کھاتے اور شام کا کھانا صبح کا ناشتہ میں اپنے ننھے سے فلیٹ میں بناتی۔

سر! آپ مجھے پیرس کے ننگے کلب کا شو دکھانے لے گئے تھے تو بھائی جان بھی ساتھ تھے۔ میں شرم سے مر مرگئی اور جانے کیسے وہ وقت کاٹا۔ پیرس تو پیرس اور یورپ کے لوگ ہی نہیں خود ہمارے بیک ورڈ ملک کو بے شرمی، بے حیائی، ننگے پن اور بے حسی پر برائیوں کا احساس نہیں رہا۔ ان ملکوں کی بات کر رہے ہیں اور خیر چھوڑیے۔ بڑی تکلیف دہ اور شرمناک باتیں یہ تو!

پیرس کی ہم نے بہت سیر کی۔ ہر قابلِ دید جگہ دیکھی۔ وارسویا کے محلات اور باغات، نوٹر دام کا مشہور عالم گرجا، ایفیل ٹاور اور وہ حسین دروازہ جہاں ''ان نوں بہادروں کی یادگار قائم ہے اور جانے کیا اور کیا۔ اس وقت صحت بھی اچھی تھی اور دنیا کی دو عزیز ترین ہستیاں صرف میری تھیں۔۔ عابد اور سیدین۔

لندن میں آٹھ دن رہے۔ ہندستانی دوست اور عزیز کچھ انگریز دوست بھی۔ وہاں کی جی بھر کر سیر کی۔ مشیر[۱] ناظم اور عتیق[۲] میزبان تھے۔ موسم نامعقول تھا۔ کھانسی اس سے زیادہ ہوئی مگر ہم نے سیر خوب کر لی۔ پکاڈلی فلم ہاؤس میں شیکسپیئر کا ڈراما، پبلک آرٹ دیکھا جو سال بھر سے وہاں چل رہا تھا۔ میوزیم دیکھے۔ گھنٹہ گھر، پارلی منٹ ہاؤس، ملکہ کا محل اور جانے کیا اور کیا مگر یہ سب باہر سے دیکھا۔ لیکن اپنے ہاں کے محلات اور سرکاری عمارتیں کہیں زیادہ اچھی ہیں۔ اس سے یہ احساس ضرور ہوا۔ خاص کر اس لیے کہ ہر ایک چیز پر کائی جمی ہوئی سیاہ عمارتیں۔ سفید آدمی۔ کیا کنٹراس تھا۔

لندن سے ہم پھر جرمنی آئے۔ بیمار ہوئی۔ ڈاکٹروں نے بہت توجہ سے اگلی پچھلی بیماریوں

---

[۱] مشیر فاطمہ [۲] مشیر فاطمہ کے شوہر

کے علاج کیے۔ بچے کے لیے بڑی امید دلائی۔ مگر مجھے یقین نہ تھا اور پھر وہاں سے ہم دوسرے شہروں میں گئے۔ حسین ظہیر ایک باڈرمر کے قریب ٹھہرے تھے (نام یاد نہیں) وہاں انھوں نے ٹھہرنے کا انتظام کیا۔ مگر ہم نے وہاں کسی کا احسان نہیں اٹھایا۔ خرچ اپنا ہی کرتے تھے۔ اسٹیٹ گارڈ گئے اور کئی اور شہروں میں، مگر صحت برابر خراب۔ ڈاکٹروں کا اصرار کہ ان کو واپس بھیج دو۔ میرا اصرار نہ نہیں جاؤں گی۔ سال بھر پورا کروں گی۔ ڈاکٹر کہتے اس کا ایک ہی گردہ ہے۔ یہاں کی سردی برداشت نہ کرسکیں گی۔ آپ سوچتے۔ بچارے آپ کے اور بھائی جان کے دوست رگھوویر صاحب کی بیوی بھی تو اسی سردی کی نذر ہوئی تھیں۔ کہیں آپ کو بھی یہی پیش نہ آئے۔ آخر ایک رات میں نے دل کا فیصلہ ٹھکرادیا اور دماغ کا کہنا مان لیا۔ نہیں، عابد صاحب کام نہیں کرسکیں گے۔ میں ان کے ساتھ مدد دینے کو آئی تھی۔ کام میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے نہیں اور جب میں نے آپ کو اپنا فیصلہ سنایا تو آپ مطمئن ہوگئے۔ اگرچہ آپ بھی جانتے تھے کہ میرے دل پر کیا گزر رہی ہے اور میں بھی کہ آپ مجبوراً مجھے بھیج رہے ہیں۔ اس کا ثبوت آپ کے وہ کئی سو خط ہیں (جو آپ سب کے اصرار پر میں نے ایڈٹ کیے ہیں اور ۲ برس سے زیادہ سے مکتبہ جامعہ کے رحم و کرم پر مکتبہ میں پڑے ہیں) اور پھر آپ نے کہا مصداق اب جانے کب آنا ہو کہ نہ ہو۔ چلیے آپ کو سوئٹزرلینڈ کی بھی تھوڑی سیر کرادیں۔ چنانچہ چار دن ہم نے اس ارضی جنت کی سیر کی۔ دو شہروں اور بہت سے باغوں کی۔ کشمیر کی یاد آتی مگر اس کی وسعت یہاں کہاں۔ یہاں کی پکنک اور صفائی دیکھی۔ ایسی کشمیر میں کہاں ہوتی ہے۔ چار دن وہاں رہ کر سیر کر کے فراد اور ان کی بہن کے خلوص و محبت کا لطف اٹھا کر ہم پھر واپس پٹوبنگن آگئے تھے اور پھر چار مہینے پندرہ سترہ دن بعد میں اکیلی ہوائی جہاز سے پہلے پاکستان اور پھر وہاں سے تیس دن بعد ہندستان روانہ ہوگئی۔ جرمن لوگوں کی محبت اور مجھ سے حد سے زیادہ خصوصیت کا ذکر کرنا دشوار ہے۔ پاکستان میں پہلی بار گئی تھی۔ وہاں عزیزوں اور دوستوں کی بے قرار الفت اور خاطر تو قدرتی چیز تھی اور دلی میں جب اپنے یاروں سے ملی تو معلوم ہوا کہ وہ بھی

میرے لیے کم بے قرار نہ تھے۔ اگرچہ باقی کئی مہینے یہاں بھی کمبخت دمہ کی حالت میں گزرے۔ شبو، صغرا، بھابی اور بھائی جان آپا شیری کس کس کی الفت اور خدمت کا ذکر کروں۔

۵۴ء میں آپ خیر سے واپس آئے۔ کام پورا نہ ہوا تھا۔ ہم بمبئی سے آپ کو لے کر دلی آئے۔ گرمی سخت تھی۔ آپ نے مسوری کا پروگرام بنایا۔ یہ ہمارا مسوری کا پہلا ٹرپ تھا۔ وہاں کی سیریں، وہاں کی دلچسپیاں، ہم دونوں کا خاطر خواہ کھلی فضا میں کام کرنا، شام کو میلوں کی چہل قدمی، خوبصورت مقامات اور پھر کئی بار مسوری کی سیر اتنے برسوں میں کی۔ مہینے دو مہینے ٹھہرتے۔ کام کرتے آرام کرتے۔ سیر کرتے۔ تنگی سے نہ سہی بہت کفایت سے خرچ کرتے۔ کبھی بچوں کو بھی ساتھ لاتے۔ صغرا، اقبال، شبو، ایک بار تو میری عزیز[۱] دوست پھر مع اپنے بال بچوں کے کچھ دن کے لیے آگئی کہ وہ دلی آئی تھی۔ پتہ چلا کہ مسوری میں ہوں تو وہ سب کو لے کر وہاں اچانک پہنچ گئی۔

مسوری میں مسز شریفہ حامد علی نے جو خود بڑی آرٹسٹ اور خوش مزاج تھیں بہت سے آرٹسٹوں سے ملاقات کرائی۔ نمائشیں دکھوائیں اور جانے کیا اور کیا۔ اب تو بس یہ نقش ہے کہ آپ ساتھ ہوتے تھے اور میں اپنے کو دنیا کی خوش نصیب ترین عورت محسوس کرتی تھی۔

....

تارا دیوی۔ شملے کے قریب بے حد حسن اونچی پہاڑی۔ پھولوں سے ڈھکی جس کے قریب ہی مشہور مندر تھا۔ ساتھ میں ایک باغ بھی۔ بھائی جان، بھابی، بچیاں، آپ اور میں ایک بڑے عالی شان کوٹھی میں گئے۔ سامنے کے پھولوں اور سنہرے دھلے لان کے اندر پتھر کے بنچوں پر بیٹھے آپ اور بھائی جان لکھتے پڑھتے رہے۔ بچیاں اپنے دلچسپ مشاغل میں......اور بھابی جان گیارہ بجے سب کو کافی وغیرہ پلاتیں۔ کپور صاحب بھائی جان کے کبھی ساتھی رہے تھے۔

پھر حج کا سفر اور اس زمانے میں دو حادثے۔ اس وقت آپ نہ ہوتے تو ہم کیسے یہ سب سہارتے۔ میں نہیں جانتی نروس بریک ڈاؤن کیا ہوتا ہے مگر اس وقت کی حالت کا اب تصور

---

[۱] ظہیر علی رضا

کرتی ہوں تو پتا چلتا ہے کہ وہ نروس بریک ڈاؤن ہی تھا۔ اچھا ہے کہ میں اس سے اس کے اثرات اور کیفیات سے واقف نہ تھی ورنہ شاید یہ ''بیماری'' اور بڑھ جاتی۔ مگر مجھے تو دو خاندانوں کو سنبھالنا تھا۔ آپ کی مدد سے اور خود کو سنبھالنا تھا۔ خدا کی مدد سے! بار بار میں سوچتی شاید مجھ سے کوئی بھول ہوئی۔ شاید خدا نے میرا حج قبول نہیں کیا (خدا نہ کرے خدا نہ کرے) لیکن آپ نے سمجھایا۔ مصیبتیں خدا کے حکم سے آتی ہیں۔ ایسی بات سوچنا بھی گناہ ہے۔ آپ میرے رونے کو انگیز نہ کرتے تھے۔ آپ کو رونے سے چڑ نہ تھی مگر آپ کا سا صبر کوئی کہاں سے لائے۔ پھر بھی اثر تو پڑتا تھا!

اور یہ احساس اتنے سال سے میرے دل کو ڈھارس دے رہا ہے کہ اگر اس سال ہم حج کو نہ جاتے تو پھر کبھی نہ جاسکتے۔ خاص کر اس لیے کہ پھر آپ کی صحت کتنی خراب ہوگئی اور کتنے بڑے کام آپ نے اپنے ذمہ لے لیے۔ میری یہ آرزو حسرت میں بدل جاتی۔ خدایا! خدایا! تیرے کتنے عظیم احسان ہیں اس ناچیز پر۔ کتنی آرزوئیں تمنائیں پوری ہوئی ہیں اور رنج وغم تو تیری طرف سے آزمائشیں ہیں۔ خدا کرے آزمائش ہی ہوں یا گناہوں کا کفارہ۔ جانے اور انجانے گناہوں کا۔ مومنوں کا ان سے درجہ اور اونچا ہوتا ہے مگر ہم گنہ گاروں کے گناہ جھڑ جائیں اور تیرے دربار میں پاک صاف حاضر ہوں۔ تیری خوشنودی اور مغفرت حاصل ہو۔ اب تو یہی دعا ہے۔ ہاں میرے دوست ہمارا یہ سفر سب سے اہم، سب سے مشکل، سب سے پرمسرت اور سب سے اہم تھا۔ آپ کے بعد کئی اور سفر کیے جس کی کوئی امید نہ تھی۔ عذرا نے امریکہ بلا کر رکھا۔ حامدہ پاس لندن گئی۔ دو بار پاکستان گئی، مگر آپ کے بغیر۔ آپ جانتے ہیں کہ آپ کے بغیر یہ دنیا کیا، شاید وہ دنیا بھی اچھی نہ لگے۔

....

اس وقت میں دہرہ دون کے سب سے حسین علاقے میں سات دن سے ٹھیری ہوئی ہوں۔ عزیز نے فارسٹ رسٹ ہاؤس کے VIP کے سیکشن میں میرے لیے انتظام کردیا ہے۔

آئی تو دس دن کو تھی مگر واپسی کی سیٹ ۱۶ کی ملی ہے۔ بے حد خوبصورت، عالی شان سرسبز علاقہ ہے۔ میلوں میں پھیلا ہوا۔ مگر آپ کی مصداق کے لیے یہ سب بس اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ دلی سے سخت موسم کے کچھ دن کو جو بچی ہوئی ہے اور سامنے سے اس وسیع اور خوبصورت علاقے کو بیٹھ کر دیکھ لیتی ہے۔ نہ جسم میں طاقت، نہ دل میں، نہ بلڈ پریشر پر کنٹرول اور آپ کے بغیر کسی چیز میں وہ زندگی اور جان۔ بھائی جان کہا کرتے تھے تجھے کسی چیز کے لیے اکسانے کی ضرورت نہیں۔

آیئے بھائی جان! اب دیکھیے اپنی بہن کی حالت۔ سب کچھ ہے۔ ہر حال میں اچھی ہوں۔ آیئے عابد صاحب! اپنے مصداق پر فقرے کسیے۔ بس آپ کو تو سیر تفریح۔ یہ دیکھنا، وہاں جانا، یہاں آنا۔ مجھے تو صاحب کام کرنا ہے۔ آپ تو ذرا دیر میں اتنا لکھ لیتی ہے اور میں تو اتنا ''سست'' لکھنے والا ہوں!

آیئے! اب نہ سیر و تفریح کا دم ہے نہ شوق۔ آپ کی دوری اور جدائی نے دل کی وہ امنگ چھین لی ہے۔ آپ کے زمانے سے زیادہ فارغ البالی ہے۔ صغرا جیسی خیال کرنے والی بیٹی ہے اور عزیز ہیں۔ مگر دل جس کو ڈھونڈتا ہے اُسے پاؤں گی کہاں۔

....

یاد ہے جب ہم آپ ۱۵ برس پہلے یوپی اردو بورڈ کی، دلی سے ساتھ آئے تھے۔ جس ہوٹل میں انتظام تھا اس کے کمرے چھوٹے تھے اور اگلے دن ہم نے اور آپ نے مل کر دہرہ دون کا علاقہ چھان مارا اور آخر ہم دونوں کے رہنے کو پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس مل گیا۔ ایک وسیع گھر جس میں ہم نے ایک کمرے، ایک باتھ روم اور سامنے برآمدہ کرایے کا لے لیا تھا جو ۴۵ روپے اور آپ کو الاؤنس کا ملتا تھا اس کا یہی کرایہ تھا اور کھانے کا ہم خود انتظام کرتے۔ صبح صبح آپ اپنے سمینار میں چلے جاتے۔ میں برآمدے میں بیٹھ کر اپنا ناول لکھتی۔ سامنے لیچی اور آم کے بے حد خوبصورت لدے ہوئے پیڑ اور خوبصورت پھول دیکھتی رہتی۔ کبھی پانی یا ٹھنڈا منگا کر پی لیتی۔ ڈیڑھ دو بجے آپ پیدل واپس آتے۔ جاتے بھی تو پیدل ہی تھے۔ سب اور لوگ انسٹی

ٹیوٹ کی یا پرائیویٹ سواری لے لیتے تھے۔ تھوڑا کچھ بنا کر کھا لیتے اور زیادہ تر پھلوں پر گزارہ کرتے۔ شام کو اکثر دور دور ٹہلنے جاتے۔ نہر کے کنارے جس پر کچھ دور پر مرحوم یلدرم اور بھابی صالحہ کے ناموں کی کوٹھیاں تھیں۔ شام گئے کوالٹی ریستوراں میں جا کر اپنے ساتھیوں سے ملے۔ مجیب صاحب، فیض صاحب، رئیس اور شکتی اور کون اور کون جو سب وہاں ٹھیرے تھے یا کہیں اور سے آجاتے تھے اور سب اس کے خوبصورت ہال میں بیٹھ کر اپنی اپنی پسند کا کھانا (اپنے اپنے پیسے سے) کھاتے۔ کبھی ایک دو دوست ساتھ مل جاتے۔ کبھی رات کو تھک کر آپ تو بے خبر سو جاتے۔ میں اکثر جا گا کرتی۔ یہ جاگنا تو میرے مقدر میں تب بھی تھا اور اب بھی ہے۔

وہ پندرہ دن، جب بھی میں سیر کو نہ جا سکتی تھی، مسوری تک نہ جا سکتی تھی کہ بلڈ پریشر اور انجائنا کا ڈر رہتا تھا اور کشمیر اور سولن میں اس کا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ مگر دن بھر کی جدائی اور محنت کے بعد جب آپ آجاتے، جب آپ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہوتا، ہم باغوں کی سیر کرتے، سڑکوں پر گھومتے اور ریستورانوں میں کھانا کھاتے۔

....

آج پھر دہرہ دون میں ہوں۔ آپ کی جدائی کے دو سال بعد صغرا اور رضا پھر مجھے دہرہ دون لائے تھے آٹھ دس دن کے لیے۔ مگر نہ جب دل کو خوشی ہوئی تھی نہ اب ہے۔ اور اب تو اور وجہ سے آئی ہوں۔ صغرا میرے بغیر کہیں جانے کو تیار نہ تھی اور پھر عزیز نے اتنا اچھا انتظام کرا دیا۔ ان لوگوں کا دل توڑنا اور صغرا کو چھٹیوں میں بھی آرام نہ ملے یہ میں کسی طرح گوارا نہ کر سکی۔ اور پھر صغرا نے اپنے دونوں بھائیوں اور خاندان والوں کو بھی انوائٹ کر لیا۔

یہاں میں بہت آرام سے ہوں۔ اب تک (جسمانی طور پر) پکا پکایا کھانے کو بھی ہے۔ گھر کے جھگڑے بکھیڑے نہیں ہیں۔ عام طور پر گھریلو فضا خوشگوار ہی رہی۔ اگر رضا کے بچے کے چوٹ لگنے سے پریشانی ہوئی۔ دل کے دورے اور باچھو کے صدمے کے بعد یہ سکون اور آرام میرے لیے ضروری تھا جو مل رہا ہے۔ مگر ان سات دنوں میں ایک دن بھی وہ مسرت نہ حاصل

ہوئی جو آپ کے ساتھ آ کر ہوئی تھی۔ اسی مسوری میں جب اس سے آدھا آرام بھی نہ تھا۔ بیمار تب بھی تھی مگر طاقت تھی، حوصلہ تھا، امنگ تھی۔ آپ کے ساتھ کیا کیا نہ چلا گیا۔ کاش میں بھی چلی جاتی تو اس دور سے جو گزر رہی ہوں نہ گزرتی۔ آپ کے تو جانے کا وقت آ گیا تھا۔ سب کچھ دنیا میں کر چکے تھے۔ برسوں سے بہت تکلیفیں سہہ رہے تھے۔ مگر وہاں جانے کا تو کوئی وقت مقرر نہیں ہے اور اب تو میری عمر بھی بہت ہوگئی ہے۔ بار بار دل کے حملے، ارتھرائٹس کے حملے اور دمہ اور کھانسی کے حملے۔ کام بھی جتنا کر چکی، کر چکی۔ آخر پچاس کتابیں چھپ چکی ہیں۔ پانچ چھپ رہی ہیں۔ سیکڑوں مضمون تحریریں اور کہانیاں بے انتہا چھپی پڑی ہیں اور اب تو ہاتھ میں کچھ ہو گیا ہے۔ کتنا بدخط لکھنے لگی ہوں۔ آنکھیں روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔ دل اور پیٹ ذرا دیر میں گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ جو فرائض تھے جو کرنا چاہتی تھی تقریباً سب کچھ کر چکی۔ ہر وقت خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وہ چلتے ہاتھ پاؤں اپنے دامنِ رحمت میں چھپا لے۔ نہ میں کسی پر زیادہ بار ہوں نہ دوسروں کا طرزِ عمل مجھے دکھ دے۔ مگر اس کے ہاں دعاؤں کے مستجاب ہونے کی گارنٹی تو نہیں۔ تو کہتا ہے کہ جو مناسب دعا ہو، سن لیتا ہوں۔ مگر ساتھ ہی دعا کرنے کا حکم دیتا ہے کہ یہ مومن مسلمان کے لیے سعادت ہے کہ اپنے خالقِ حقیقی سے جو مانگنا چاہے مانگے۔

مگر میں انسان ہوں۔ ناقص دل و دماغ والی انسان۔ میں سمجھ نہیں پا رہی کہ اب خدا مجھے کیوں زندہ رکھے ہوئے ہے؟ میں کس کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟ مگر اس کی مرضی پر سر جھکانا میری عبودیت کا فرض ہے اور دعا کرنا میرا حق!

....

ابھی تو یہاں سات ہی دن گزرے ہیں اور سات دن باقی ہیں۔ خدا وہ بھی گزار دے۔ چاہتی ہوں فکر نہ کروں، غم نہ کروں۔ مگر جذبات پر اب تک قابو نہیں پا سکی ہوں۔ ہاں خاموش رہنے کی کوشش کرتی ہوں۔ آپ جیسا پشت پناہ موجود نہیں۔ خاموشی ہی میں عافیت ہے۔ رخصت ہوتی ہوں۔ دیکھیے پچاسی برس کے سفروں کی داستان سنا ڈالی ان چند صفحوں میں۔

صرف سنا دی دل کو سنبھالنے کے لیے اور خود کو مصروف رکھنے کے لیے۔ ۹؍جون ۸۷

....

۱۰؍جون

مولا! تو نے زندگی میں اتنی نعمتیں دیں۔ایسے عزیز پیارے، ایسا خاندان، ایسا شوہر، ایسے ان کے ناتے رشتے دار۔ پھر ایسی ایسی بیماریاں اور پھر ان سے نجات، تنگی میں فراغت، حضر میں سفر، دنیا کی سیر، اپنے ملک کی سیر وسفر کا موقع۔علم کی دولت،فن کا احساس اور ادراک اور اس سے کام لینے کی صلاحیت۔ بہت سے 'اپنوں' سے زیادہ 'غیروں' سے انجان لوگوں سے، عورتوں اور بچوں سے، دیش میں، بدیس میں اس فن کی قدر دانی اور فن کار کی قدر، عزت، عقیدت اور تعریف جنھوں نے نا اہلوں یا حاسدوں یا خود میں گم اپنے حسن کے خود رسیا، اپنی ذات کے خود عاشق لوگوں کی با اعتنائی اور بے پروائی، نظر اندازی کا دکھ دور کر دیا۔اور پھر تو نے اور عابد نے دل میں یہ احساس دیا کہ میرا کام فن کی، انسانیت کی، خواتین کی اور جو میری راہ میں آئے اس کی خدمت کرنا، اس سے ہوئی ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھانا۔ ہاں کچھ شعوری زیادہ تر غیر شعوری طور پر یہی چیز تھی جس نے عمر بھر ہر حالت پر بیماری، پریشانی، دکھ اور غم، ہر خوشی، ہر سفر میں میرے فن کو میرا ساتھی بنایا۔ رہبر بنایا۔ زخم کو مرہم بنایا۔ دوسروں کے احساس اور دکھ کو سمجھنے کے قابل بنایا۔

آج جب میرا دکھ بٹانے والا میرے ساتھ نہیں تب یہی فن ہے، یہی قلم ہے جو میرے وجود کو متوازن کرتا ہے۔ یہی فن ہے جو ہر حال میں ساتھ دے رہا ہے، یہی قلم ہے جو دل سے رِستے لہو کا مرہم بن جاتا ہے۔

مگر مولا! انسان، اور عورت خاص کر صرف فن پر قلم کے بل پر ہی تو زندہ نہیں رہ سکتی۔ پھر میری جیسی عورت جو ہمیشہ سے اپنی عزیز ترین ہستیوں کی پیاری رہی ہے اور جو اس کو دل سے چاہتے تھے اور جن پر وہ خود نثار تھی جو اس کے مشیر تھے، صلاح کار تھے، ہدایت کار تھے، ناصح تھے مگر

مشفق دوست تھے جو دوست کا ہاتھ بٹانا اور اس کا درد محسوس کرنا اور دور کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ مگر اب تقریباً دس برس سے اپنے آخری اور سب سے قریبی سب سے پیارے، سب سے عاشق زار دوست اور پیارے سے جدا ہوں اور میری رہنمائی کرنے والا، میری دلداری، سچی دلداری جس میں غرض نہ ہوتی تھی، غصہ اور نفرت نہ ہوتی تھی، جس میں احساسات کا پاس ہوتا تھا، جذبات کی پذیرائی ہوتی تھی، جو بیماریوں میں تیمار دار اور معالج، جو غموں اور دکھوں میں خاموش دردمند دوست اور جو غلطی اور کمزوری میں تنبیہ کرنے والا تھا۔ ایسی تنبیہ جو تھوڑی دیر کے بعد معذرت اور محبت میں بدل جاتی تھی۔ ایسی رہنمائی اور مشورے جو زندگی کو آسان بناتے ہیں اور سخت سے سخت دکھ اور غم اور لوگوں کی بدتمیزیوں اور بدگمانیوں اور زیادتیوں کو سہارنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔

مگر مولا! تو نے انھیں مجھ سے اتنے پہلے بلا لیا۔ اگر سال کے اند ہی جس کا مجھے بہت یقین، بہت آشا، بہت بھروسا تھا بلا لیا ہوتا تو میں کتنے دکھوں سے بچ جاتی۔ جسمانی دکھ ہی نہیں کہ وہ جو گناہوں کی پاداش یا تیری آزمائشیں۔ دکھ اور بیماری ہوتی ہے اور پھر شفا ہو جاتی ہے۔ اور میں تیرے شکر و احسان کے بوجھ سے اور دب جاتی ہوں! مگر اپنے دوست اور ساتھی کے بعد میں اکیلی رہ گئی مولا۔ تو جانتا ہے کہ میں نے کیا کچھ سہا ہے۔ میں ان لوگوں کی بے اعتنائیاں، شک اور بدگمانیاں اور طنز و طعن سہے ہیں جن کو میں اپنی اولاد سے زیادہ سمجھتی تھی۔ ان کی بدزبانیاں اور بدتمیزیاں برداشت کی ہیں جن کو میں تیرے بعد سب سے زیادہ چاہتی ہوں۔ ان کی محبت اور خدمت اور دلداری کی پذیرائی کی ہے اور اپنے زخم ڈھک لیے ہیں۔ شکر ہے کہ تو نے میرے دل میں کچھ نہیں رکھا۔ میں چند گھنٹے یا دو ایک دن سے زیادہ کسی کی زیادتی اور بدزبانی اور دکھ کو دل میں نہیں رکھ سکتی۔ تو جانتا ہے۔ صرف تو، اور تو ہی یقین کر سکتا ہے کہ میں نے ہمیشہ ان لوگوں کو پہلے بھی اور اب بھی معاف کر دیا ہے جو میرے خیال میں میرے حسن سلوک اور اتھاہ محبت کا بدلے مجھے دیتے رہے ہیں۔ اور اب جو باقی ہیں جو چاہنے والے، خیال کرنے والے، خدمت کرنے والے، ان کی ممنونِ احسان ہوں۔ جانتی ہوں ان پر میرا حق

نہیں۔صرف خداواسطے یا میری مجبوری کی خاطر یا شاید پچھلی محبتوں اور خدمتوں کے بدلے میں بیماری میں میری خدمت کرتے ہیں اور کوئی غم پڑے تو غمگساری۔

مگر کتنے دن؟ جب زیادہ وقت گزر جائے تو ہر ایک اپنے اپنے مسائل میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ ہو جانا چاہیے مگر میں، میں تو تنہا اپنی صلیب گھسیٹنے کے لیے رہ جاتی ہوں۔

میں کس کا نام لوں! کس کا فکر کروں! وہ بھی کس کا تجھ سے۔ کہ تو انتریامی ہے۔ میرے اپنے خاندان کے لوگ خون کے رشتے دار، میری جان بھائی بہنوں کی اولاد اور دوسرے عزیز کیا اس طرح بھی کوئی اپنے اتنے قریبی عزیز سے، جس نے عمر بھر ان پر جان چھڑکی ہو بیگانہ ہو سکتا ہے؟ جواب بھی ان کا دکھ اور غم نہیں دیکھ سکے ان کے دکھ پر تڑپ اٹھے۔ لوگوں کو یہ احساس نہ ہونے دیں کہ ہمارے دوست، ہمارے بچے، ہمارا خاندان اور پیسہ ہی سب کچھ ہے۔ یہ بوڑھے بیمار رشتے سب اس قابل نہیں کہ سال چھ مہینے میں رسمی مزاج پرسی کر لی جائے یا بعض اس کی ضرورت بھی نہ سمجھیں۔

کیا میں نے پچاس برس اپنے دوسرے پیاروں کو جو میرے شوہر کے عزیز تھے مگر ان سے زیادہ میرے پیارے تھے جن کے لیے جب تک مجھ سے ہو سکا میں نے ہر وہ کام کیا جو میرے بس میں تھا۔ پرورش، شادی بیاہ، تعلیم، سیر و تفریح، نوکریوں، دلداریوں، تیمارداریوں، غم گساریوں میں اپنے خیال میں، اپنی حد بھر کوئی کمی نہ کی۔ دل کا حال تو صرف تو جانتا ہے کہ آج بھی ان سب کو میں خود سے زیادہ چاہتی ہوں اور چاہتی رہوں گی۔ ان کی احسان مند ہوں اور رہوں گی کہ میرے مولا آقا علی مرتضیٰؑ کا قول ہے کہ جس کے ساتھ سلوک کرو وہ اکثر بدلہ برائی میں دیتا ہے۔ نہیں میرے ساتھ کسی نے برائی نہیں کی۔ کی تو بھلائی ہی کی۔ مگر مزاجوں کا اختلاف، شاید 'جنریشن گیپ' کی لعنت، شاید خود پرستی کی وبا۔ ان کو میرے جذبات اور احساسات کو سمجھنے نہیں دیتی۔ وہ پیسے سے میری مدد کر سکتے ہیں (جس کی تیرے رحم و احسان کی بدولت مجھے ضرورت نہیں) وہ سخت بیماری میں دوڑ دھوپ کر سکتے ہیں، وہ میرے ساتھ سفر پر جا کر میرے دل بہلانے کی کوشش کر سکتے ہیں مگر میرے مزاج اور احساسات کو نہیں سمجھ سکتے۔

میری ظرافت، جس کی ایک زمانہ میں دنیا قائل تھی، کو طنز سمجھتے ہیں۔ میری نصیحت کو بے جا، اپنے کو ان پر مسلط کرنے اور خود کو ان سے عقلمند سمجھنے کی غلطی کا شکار ہیں۔ وہ مجھ سے محبت بھی کرتے ہیں مگر اس کا کیا جواب ہے۔ ایک کی ناخوشی میرے درد کو سمجھتی بھی ہوں تو اس کو بتا بھی نہیں سکتی۔ دوسری کی خیال خاطر، میرے انٹرٹین منٹ کی کوشش مجھے خوش رکھنے (خوشی !!!) کی جدوجہد، جس کا مجھے بہت احساس ہے۔ بہت ممنون ہوں کہ ایک تو ہے جو مجھے آرام دینا چاہتی ہے۔ کسی حد تک میرے احساسات کو سمجھتی ہے۔ مگر طبیعت اور مزاجوں کا اختلاف اور پھر وہی جنریشن گیپ۔ اپنی خوشیوں اور انٹرٹینمنٹ، اپنی دوستیاں اور صلاحیتوں کا استعمال، دنیا بھر کی مشہور اور مصلح بننے کا جذبہ اس کی فطرت ہے۔ کبھی میری فطرت بھی تھی مگر انداز جدا تھا، خیالات جدا تھے۔ مگر یہ دوستوں کا سوچنے کا انداز ہے جو ایک ہوتے ہوئے بھی الگ الگ ہے۔ اگرچہ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے مگر میں آج یہ نہیں سمجھا سکتی کہ دنیا میں ہر ایک کو اپنے اپنے انداز میں رہنے کا، اپنے اپنے انداز میں زندگی بسر کرنے کا حق ہے۔ خاص کر اس دور میں جب خودغرضی اور خود پرستی بے جا بھی سیرت کا جزو بن جاتی ہے جب ہر ذہین اور تیز ہستی اپنے سے بڑی عمر کے لوگوں کو جاہل نہیں تو بہت کچھ معصوم (جاہل ہی کے معنی میں) سمجھتی ہے۔ ادب کرتی ہے مگر اس کے اصولوں کو، اخلاق کو، مشوروں کو ماننا نہیں چاہتی۔

اور میری جیسی بوڑھی ہستیاں، اگر ان میں میری عقل (اگرچہ یہ میں خود لکھ رہی ہوں) میری جیسی خودداری اور اپنے سے چھوٹوں سے اپنی بے عزتی کرانا اپنی توہین سمجھنے والے ہستیاں ہوں تو وہ اپنے کو ان کے رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مگر میں باجی اور امن اور دوسری ہستیوں کی طرح نہیں جوان شخصیت اور سیرت کو دوسروں کے صحیح یا غلط اصولوں میں ڈبو دیں۔ میں اس عمر میں بھی اپنی عزت کرتی ہوں اور کرانا چاہتی ہوں۔ کراتی بھی ہوں مگر مولا! کبھی کبھی یہ بھروسہ ٹوٹ جاتا ہے۔ کوئی کسی طرح کوئی کسی طرح اس جذبہ کو زخمی کر دیتا ہے اور پھر میں اور ٹوٹ جاتی ہوں اور تجھ سے دعا کرتی ہوں کہ اب میری زنجیریں کاٹ دے اور اپنے پاس بلا لے۔

عابد صاحب کے بعد سیر وسفر کا شوق اور ارادہ بدل گیا تھا۔ خیال بھی نہ تھا کہ اب کہیں جاؤں گی۔ مگر لاہور اور اسلام آباد ان کے کچھ بعد ہی گئی۔ کراچی گئی اور عذرا کے بے پناہ اصرار پر امریکہ گئی، لندن گئی۔ امریکہ میں واشنگٹن گئی اور کبھی جگہ۔ بھوپال گئی، دہرہ دون گئی، لکھنؤ اور علی گڑھ گئی۔

اور کسی نہ کسی صورت میں، کسی نہ کسی فیملی سے سخت تکلیف بعض جگہ پہنچی اور بعض جگہ ایسی کہ جس کو جھیل گئی اور ہر بار ارادہ کیا اب کہیں نہ جاؤں گی۔ یہ گھر ہے اور اسی گھر میں مجھے مرنا ہے اور جینا ہے۔ اس کا دکھ میرے لیے راحت ہے اس کی بے آرامی آرام ہے۔ مگر پھر سب کے اصرار، سب سے زیادہ جس کے اصرار اور کوشش نے عہد تڑوا دیا۔ نہیں عہد اس لیے ٹوٹا کہ میں اس کا آرام، اس کی تبدیلی آب و ہوا، اس کی صحت کی بحالی، اس کا چھٹیوں میں آرام اور کام کا موقع دینا چاہتی ہوں۔ اور وہ مجھے تنہا چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتی کہ اس کا غالباً یہ خیال ہے کہ اگر میں اس کے پیچھے مرگئی (اللہ ایسی میری حیثیت کر کہ اب جلد میں تیرے دربار میں حاضر ہو جاؤں) تو وہ کیا کرے گی۔ اور اس کی محبت میں، میں پھر کہیں چلی جاتی ہوں اس کے ساتھ۔ مگر اکثر اس پر کسی نہ کسی مرحلے پر دکھ، غم غصے اور چھوٹی سی مدت برداشت نہ کرنے کا یا ارادہ پورا نہ ہونے کا یا اصلی یا فرضی انسلٹ کا دورہ سا پڑتا ہے جس سے اُسے تو حد سے زیادہ دکھ ہوتا ہی ہے مگر مجھے اس سے زیادہ کرب ہوتا ہے۔ میری وجہ سے اور اپنے سے زیادہ اس کی وجہ سے میرے بعد وہ کیا کرے گی۔ میرا سا عشق تو اس سے کسی کو نہیں ہوسکتا۔ اب کوشش کر کے میں نے بعض مسائل پر چپی سادھ لی ہے۔ جو وہ چاہتی ہے اکثر میں کرتی ہوں۔ اس کو یہ امپریشن دے کر کہ میری بھی یہی خوشی یہی رائے ہے۔ مگر کامیاب نہیں ہوئی۔

مولا! کیا ایک دوسرے کو یوں ٹوٹ کر چاہنے والے ایک دوسرے کا دل دکھا سکتے ہیں۔ نہیں جانتی قصور میرا ہے یا دوسروں کا۔ نہیں جانتی اس نے میں نے کس کا دل دکھایا ہے۔ انجانے میں کس کی حق تلفی کی ہے، انجانے میں ایک کی حمایت میں دوسرے کے احساسات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ یہ تو دلوں کا حال جاننے والے تو ہی جانتا ہے کہ جو میرے پیارے ہوں

چاہے ان میں ننھے بچے ہوں یا بڈھے۔ خودرائے، اپنے پیروں پر کھڑے ہونے والے جوان اور نوجوان ہوں یا تنگی اور پریشانی میں مبتلا وہ لوگ ہوں جن کو میں نے چاہا تیری رحمت سے مدد کی اور آج بھی ان کی ساری کمزوریوں کے باوجود ان کو چاہتی ہوں۔

یا وہ میری پیاری ہستیاں جن کو آج بھی میں اپنی جان سے زیادہ چاہتی ہوں۔

....

صرف تیری ایک ذات ہے جو دنیا کے ہر فرد، ہر رنجش، ہر خوشی، ہر غم سے زیادہ پیاری ہے۔ صرف تجھ پر بھروسا ہے۔ صرف تجھ سے دعا ہے کہ اب جلد اپنے دامنِ عفو و رحمت میں مجھے اٹھا لے اور نہ زیادہ آزمایش میں ڈال اور نہ اور لمبی عمر کر۔ مجھے محتاجی سے بچا کہ میں اور زیادہ حساس اور زیادہ دلگیر نہ ہوں۔ بدگمان نہ ہوں۔ سب کی محبت میرے دل میں سب کی خیرخواہی کا جذبہ میرا ایمان ہو اور جب اس دنیا سے جاؤں تو وہ بھی مجھے محبت اور عزت سے یاد کریں۔ اور تو بھی میرے ان ناچیز جذبوں کی بدولت اپنی مغفرت اور لقاء کی خوشی سے سرفراز کرے۔

مولا! دل میں جب درد زیادہ ہوتا ہے تو تجھ سے باتیں کرتی ہوں۔ جب ماضی کی یادیں ستاتی ہیں یا مستقبل یا حال دلگیر کرتے ہیں تو اپنے محبوب سے دل کی باتیں کرتی ہوں۔ مگر سکون اور روحانی مسرت تو تجھ سے باتیں کر کے ہوتی ہے اور دل میں جو رنج و کدورت ہو وہ مٹ جاتی ہے۔ خودرحمی کا جذبہ غائب ہو جاتا ہے اور تو نے جو بے بہا، بے پایاں کروڑوں نعمتیں بخشی ہیں ان کا رواں رواں شکرگزار ہوتا ہے۔

کل سے طوفان آیا ہوا ہے۔ رات جاگتے گزری۔ صبح اس سے آغاز ہوئی مگر اب طوفان تھم گیا ہے۔ بوندا باندی ہو رہی ہے!

تیری ناچیز ادنیٰ بندی

ص

۱۰ر جون ۸۷ء

۱۲/ جون

آج اقبال صغرا کا شہر جانے کا پروگرام تھا۔ سنگھ صاحب کا وعدہ تھا کہ ۹ تاریخ کے بعد وہ کار دے سکتے ہیں۔ اس لیے ان سے کار مانگی۔ ساڑھے دس بجے گئے۔ ایک بجے آگئے۔ کسی سے ملنے یا سیر کو جانے کا موقع بھی نہ تھا اور سخت دھوپ تھی مگر چیزیں اتنی اچھی نہیں جتنی ان لوگوں نے مسوری میں دیکھی تھیں۔ مہنگی بھی زیادہ تھیں۔ میں عزیز کے لیے کسی بہت اچھی چیز کی تلاش میں تھی جس کی قیمت میرے بس کی، جس کا سائز سامان کے بس کا اور جوان کی پسند کی ہو۔ مگر نہیں ملی۔ ایک آدھ دیکھی تو قیمت بہت تھی۔ دراصل جن لوگوں کے پاس خدا کے فضل سے سب کچھ ہو ان کے لیے تحفہ خریدنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اپنے لیے دواؤں کی ایک صندوقچی لی۔ سارا نے آئس کریم کھلائی۔ بچاری کے پچیس روپے خرچ ہوگئے۔ پھر ساڑھے بارہ بجے ایک ریستوراں میں کھانا کھایا۔ جو کھانا چاہتے تھے وہ ان کے ہاں تھا ہی نہیں اور جو تھا وہ مجھے پسند نہ تھا۔ ''چینی کھانا ایک نئی 'بیماری' یعنی ڈش چلی ہے اور آخر میں مرغی کا سالن اور تنوری روٹی۔ سالن مجھے بالکل پسند نہ تھا اور پھر بل -/80 روپے!! ! معاذ اللہ۔ مجھے اقبال نے بل نہیں دینے دیا، خود ہی ادا کیا اور جلتی دھوپ میں ایک بجے واپس آئے۔ یہ بھی کوئی سیر ہوئی! اور کام کی چیز ملی بھی نہیں۔ پرسوں رات رضا، صغرا، صفیہ اور انیس واپس دلی چلی گئیں۔ صغرا کو کافی تکلیف ہے...... پریشان ہے اپنی بے بسی سے۔ رضا اور صفیہ بھی دلگیر تھے۔ رات کو فون بھی آگیا خیریت سے پہنچ گئے۔ نذیر بھی خیریت سے ہیں۔ مگر اندیشے کے مطابق ببلو غائب ہیں۔ اب خدا ہی ہے جو اس کی نوکری باقی رہے۔ کیا بدقسمتی ہے خود اس کی اور گوہر۔ کسی حصہ عمر میں چین ملنے کی امید نہیں۔ یہ ذرا سا سہارا ملا تھا، وہ بھی ایسا غلط قسم کا کام کرتا ہے۔ خدا سمجھے اس کے دوستوں اور عزیزوں سے جو لڑکے کو بہکاتے یا اکساتے رہتے ہیں۔ اور وہ تو ہے ہی کمزور دماغ کا اور امرد ہے سے عشق بھی ہے۔ ماں باپ سے تعلقات زیادہ اچھے نہیں۔ کیا کروں؟ لاکھ چاہوں کہ یہ خیال دل سے دور

کردوں۔ جو ہوگا ہو جائے گا۔ ہمارے بس میں جو تھا وہ کرلیا مگر دل نہیں مانتا۔

نگو کو روک لیا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ جائے گی۔ اقبال شمع وغیرہ ۱۵ کو اور لوگ ۱۶ کو جائیں گے۔ اگرچہ سب آرام ہے مگر دل نہیں لگ رہا اور پھر کل سے پیٹ گڑبڑ۔ لوزموشن اور بلاوجہ ہر قسم کی احتیاط کے باوجود۔ دراصل اب آنتیں ساتھ نہیں دے رہی ہیں۔ ہر ہفتے دس دن میں حملہ ہوتا ہے۔ ایمرجنسی کی دوائیں ساتھ تھیں۔ عاصمہ کی دوا اور ڈاکٹر قاسم کی دوا کھا کر کنٹرول کیا۔ قبض کے بعد یہ کیفیت ضرور ہوتی ہے اور قبض کی ایک وجہ انگلش شیٹ ہے۔ شام سب لڑکیاں بچے ٹہلنے چلے گئے۔ اقبال میرے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ اس کا خیال ہے کہ جن جن کے خلاف سب سے جو باتیں کرتی ہے وہ نہیں کرنی چاہئیں کہ وہ بے وقوف اور سیدھی ہے۔ سب پر یقین کرلیتی ہے (شاید دہرا بھی دے) اور یہ کہ آپ ان کو سمجھا دیجیے۔ میں نے بعض باتوں سے اتفاق کیا۔ صحیح صورت حال سمجھائی مگر سمجھانے بجھانے سے صاف انکار کردیا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس عمر میں سب لوگوں کو خود اپنا اور دوسروں کا تجزیہ کرنا چاہیے اور اس کے مطابق عمل۔ اور میرے تو دل میں ویسے ہی اتنی طاقت اب نہیں رہی، نہ دماغ میں بوتا اور برداشت کہ بحث مباحثہ کروں۔ ایک کی طرفداری اور دوسرے کو نصیحت یا غلط ثابت کرنا۔ نتیجہ جھگڑا اور بدمزگی بڑھتی ہے۔ میں نے زندگی بھر کے تجربے سے یہ سیکھا اور دریافت کیا کہ آپ کتنی ہی محبت اور خلوص سے اختلاف رائے کریں اس سے آپ اور دوسرے کے تعلقات تو خراب ہوجاتے ہیں، ان فریقین کے تعلقات بھی اچھے نہیں ہوتے۔ اور یہ تو پچاس برس سے دیکھ رہی ہوں کہ انصاف اور حق کے تقاضے سے کسی کی بات کی صفائی پیش کروں یا ایک کو یہ احساس ہوجائے کہ دوسرے سے اسے محبت ہے تو ان کا جو ہو سو ہو میری محبت اور خلوص مشکوک ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ ''سیف سائڈ'' یہ ہے کہ خاموش رہا جائے۔ اگرچہ خاموش رہنا بہت مشکل کام ہے جبکہ آپ کو یہ یقین ہو کہ آپ کا اس وقت یہ فرض ہے کہ بات کریں یا یہ یقین ہو کہ خود آپ حق پر ہیں۔ مگر عافیت اسی میں ہے کہ چپ رہوں۔ پھر بھی کیا ہمیشہ اس کوشش میں کامیابی ہوسکتی ہے۔ نہیں جانتی۔ بہرحال

میں نے اقبال سے کہہ دیا کہ جو چاہو تم بات کرو۔ میں نہ اِدھر سے کچھ کہوں گی نہ اُدھر سے۔

دراصل انسانی کمزوری (یہ بہت بڑی ٹریجڈی ہے) کہ اس کو اپنی خامیاں نظر نہیں آتیں اور دوسرے کی بڑی ہو کر دکھائی دیتی ہیں۔ پھر ہم یہ چاہتے ہیں کہ دوسرا ہمارے معیار پر پورا اترے یا کم سے کم ہمیں اپنے سے سُپر نہ سمجھے اور جو ہماری خواہش یا پسند ہے اس کے مطابق کرے۔ مگر اس میں کوئی بھی ہو، میں یا دوسرے شاذ و نادر پورے اترتے ہیں۔ ٹھیک بھی ہے۔ ہر ایک اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ اپنا گھر اور خاندان الگ سیٹل کرنا چاہتا ہے۔ اب اگر وہ میں ہی کیوں نہ ہوں۔ میرا الگ حلقہ نہیں یا اب میرا خاندان ان معنوں میں نہیں جو پہلے تھا۔ میرا چاہنے والا، میرے حکم یا خواہشوں کا احترام کرنے واالا تو یہ میرا قصور ہے اور مجھے اس پر قانع ہونا چاہیے یا ہم نے اپنی زندگی ایسی بنائی کہ ہمارا الگ خاندان (بہت محدود معنی میں) نہیں بن سکا تو ہمیں اس پر قانع ہونا چاہیے۔

صغرا اتنا سب کے لیے کرتی ہے۔ محبت، خلوص، دین لین، خیال خاطر۔ اس کا مزاج ہی ایسا ہے اور چاہتی ہے کہ اور لوگ بھی اسی طرح اس کے ساتھ سلوک کریں اور اس کے معیار یا مرضی کے مطابق بیٹھیں۔ اس کو یہ خبر نہیں کہ آج کل ماں اور بیٹی، باپ اور بیٹا ایک معیار اور اخلاق اور ایک دوسرے کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتے تو کسی اور کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

اچھا یہ ہے کہ یہ کیفیت جلدی گزر جاتی ہے اور وہ پھر نارمل ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ مجھے تو بس یہ فکر ہے کہ وہ سب سے بہت اچھے تعلقات رکھے۔ سب اس سے محبت کریں (اب بھی کرتے ہیں میری طرح نہیں نا) اور پھر میرے بعد وہ تنہا رہ جائے گی۔ وہ تنہائی پسند نہیں ہے۔ تنہائی اس پر بہت ٹنشن اور دکھ کی کیفیت ہوگی۔ پھر کیا ہوگا؟ کاش جو میں چاہتی تھی کہ وہ سیٹل ہو جاتی۔ اپنا گھر ہوتا، اپنا ساتھی ہوتا، اپنی ذاتی ذمے داریاں ہوتیں۔ وہ خوش رہتی یا پریشان، مگر ذمے داریاں انسان کو زندہ رہنا سکھاتی ہیں۔ اب زبردستی کی ذمے داریاں ہیں۔ بہرحال خدا مالک ہے۔ جو وہ چاہے گا وہ ہوگا۔ میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ جو اب تک جھیل چکی

ہوں، وہ خدا کافی سمجھے اور جتنی جلد اپنے دامنِ رحمت میں چھپالے۔ جتنی جلد ہو ان آزمائشوں سے بچالے۔ اتنا ہی اس کا احسان ہے۔ اب دل، دماغ، صحت، برداشت، آنکھیں، آنتیں، غرض سارے اعضا مضمحل ہو گئے ہیں اور ہر چیز کا جسم اور روح بہت زیادہ اثر قبول کرتی ہے۔

باچھو کو سدھارے بارہ دن ہو گئے مگر دل کے اندر وہی منظر نظر آتا ہے اور عمر بھر کی یادیں دل میں ایک فلمی ریل کی طرح چلتی رہتی ہیں۔ یہ وقت اور احساس بھی گزر جائے گا۔ اور کیسے کیسے پیاروں پر صبر کیا۔ وہ تو پھر بھی اور تھا۔ مگر خون کا رشتہ بچپن کی محبت اور دوستی۔ جدائی اور قربت کا پاس نہیں کرتی اور مجھ جیسی حساس دل و دماغ والی کے لیے! بس اب خدا کوئی اور غم نہ دکھائے۔ نہ دکھانا خدایا!

....

یہ دہرہ دون کا حسین ترین علاقہ فارسٹ ڈیپارٹمنٹ ہے، یہ آرام ترین رسٹ ہاؤس ہے جس میں وی آئی پی کا کمرا مجھے ملا ہے اور دوسرا اقبال وغیرہ کو۔ سامنے نہایت گھنے اور حسین متعدد قسم کے درختوں کی قطاریں ہیں، جھنڈ ہیں۔ فارسٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے اس خوبصورتی اور خوش مذاقی سے میلوں میں اسے بسایا ہے، پھولوں سے سجایا ہے، کھلی ہوا، کھلی فضا، موسم بھی اچھا کبھی غنیمت۔ مگر آج دس دن ہو گئے اور ابھی پانچ دن باقی ہیں اور دل اس شدید گرمی سے تپتے دلّی کے گھر میں ہے۔ اس غیر آرام دہ کمرے میں، جس میں آرائش اور آرام کی (جسے دنیا آرام و آسائش سمجھتی ہے) کوئی چیز نہیں۔ مگر اس میں جان سے پیارے کی تصویریں، آپ کی قربت کا احساس ہے۔ وہ پلنگ ہے، وہ جگہ ہے، وہ گھر ہے جہاں آپ اور میں مل جل کر رہتے تھے (اور ذہن میں اب بھی دونوں ساتھ ہی رہتے ہیں)۔ آپ کی جامعہ ہے، جہاں سب پرانے دوست ختم ہو چکے ہیں۔ پھر بھی نئے جوان دوست جو آپ کے عقیدت مند ہیں اور بہر حال مجھ سے بھی کچھ عقیدت اور خلوص رکھتے ہیں، موجود ہیں۔ چلتے پھرتے آتے جاتے ملاقات ہو جاتی ہے۔ کچھ نئے ہم سایے ہیں جو پرانے ہمدردوں کی جگہ ہو گئے ہیں، جہاں

سامنے بھائی جان کا گھر ہے۔

اور میرے لیے تو اور ہزاروں یادیں بھی اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ یہ میرا پرانا...... گھر مجھے باغِ جنت اور بہشت کے عرصے سے اس وقت تو پیارا ہے۔

۱۶/ جون

دو دن سخت تکلیف میں گزرے تھے۔ کولائی ٹس کا حملہ تھا جو بالکل گزشتہ دل کے حملے کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے دوائیں دیں۔ اس بیچ میں یہ پریشانی کہ اگر یہاں دل کا حملہ ہوگیا تو جانے کیا سہارنا پڑے۔ مجھ سے زیادہ بچوں کو۔ اور اگر میرا خاتمہ ہوگیا تو اقبال بھی ساتھ نہ ہوگا۔ وہ ۱۵ کو لکھنؤ جا رہا ہے۔ اکیلی صغرا اور نگو کیا کریں گی۔ پوسٹ مارٹم اور جانے کیا کیا ہو۔ بہت چاہا سیٹیں بدل جائیں مگر کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ بہت چاہا انسٹی ٹیوٹ کی گاڑی مل جائے۔ چاہے ہزار روپے خرچ ہو جائیں مگر کسی طرح گھر پہنچ جاؤں۔ مگر کسی طرح کچھ نہ ہوا۔ ہوا تو یہ کہ یا تو دن میں بیٹھ کر چلو۔ مگر جو آدمی دو گھنٹے نہیں بیٹھ سکتا وہ بارہ چودہ گھنٹے کیسے بیٹھ سکتا ہے؟ یا پھر ۱۴ کی دو سیٹیں۔ یعنی تیسرا آدمی بھی نہ ہو ساتھ میں۔ اگلے دن پھر وہی کیفیت رہی۔ سوچا...... مگر ہوگا تو وہی جو اس کی مرضی اور مقدر ہوگا۔ رضا بقضایہ پر انسان ہے تو پھر فکر کا ہے کی۔ مگر...... غصہ، رنج اور فکر کس خاموشی سے برداشت کی وہ صرف خدا ہی جانتا ہے۔

آج جا رہے ہیں۔ خدا ساتھ خیریت کے آرام سے پہنچا دے اور وہاں بھی سب خیریت ہو۔ ویسے دلّی میں جھگڑے، ہنگامے ہو رہے ہیں۔ اچھا ہوا پرسوں نہیں گئے۔ اب خدا مالک ہے۔

۲۰/ جون

میرے ساتھی و رفیق!

اس سفر میں آپ نہ ساتھ تھے نہ رفیق۔ مگر آپ کی یاد اور آپ کا خیال ساتھی بھی تھا اور

رفیق بھی۔ مگر جسمانی درد، ذہنی ٹنشن، بدمزگی کا بدتمیزی کا صدمہ، سفر کی وحشت، صبر کی کوشش۔ اتنے دن کے سکون اور بہر حال کسی حد تک راحت کا بدلہ۔ جو ملا شاید ہمت یہ نہیں کہ میں زیادہ دن سکون سے رہ سکوں۔

سفر تو شکر ہے اچھا گزر گیا۔ دلی میں گرمی بہت تھی اور ہے۔ یہاں آ کر پتا چلا بجلی غائب، کولر خراب، بوا بیمار، ببلو غائب، نذیر بھیا کمزور اور سارا گھر الٹا پڑا ہوا۔ بہر حال کسی طرح اس سب کو سنبھالا۔ خاموشی اور برداشت کی جدوجہد میں لگی رہی۔ ۲۰۔۲۵ خط تعزیت کے آئے پڑے تھے۔ تین دن میں ان میں سے بارہ تیرہ کے جواب لکھے۔ مگر اور بھی آ رہے ہیں۔ جواب کیا ہوتا ہے اکثر مرثیہ ہو جاتا ہے۔

۲۲ / جون

تم............!

تم اپنے بل پر جینا سیکھو۔

سیکھا تو تھا۔ مگر بھول گئی۔

غلط۔ تم بھولی نہیں۔ تم ہارٹ بروکن ہو۔ تمھاری عادتیں عابد نے خراب کی تھیں۔ وہ تم پر تم ان پر کتنا ڈپنڈ کرنے لگے تھے کہ............

کہ......کیا؟

اب نو برس سے تم تنہا ہو۔

ہاں تنہا ذہنی طور پر، دل تنہا، روح تنہا، احساس تنہا۔

کوئی تنہا نہیں ہوتا۔ ہر ایک کے دل میں دل میں۔

دل میں کہ دماغ میں؟

ہاں دماغ میں سہی، یادوں کا ایک سمندر ہوتا ہے۔ اچھی پیاری اور دلکش، پُر محبت یادیں۔

ہاں مگر......

دلدوز، غم ناک، روح فرسا یادیں بھی تو!

بے شک۔ مگر انھیں یادوں کے سہارے تو انسان۔ اور جب تنہا رہ جائے کسی بھی وجہ سے، تو وہ زندگی بسر کرتا ہے۔

تو میں اور کیا کر رہی ہوں؟ یہی یادیں تو ہیں جو اس مریض، بوڑھی، ۷۴ سالوں کو دل کے سمندر میں سمیٹے۔ گھسیٹ رہی ہے۔ رو کر یا ہنس کر۔ عمر لمبی ایک رات نہیں ہے میرے ناصح مگر جتنی بھی ہو اُسے ہنس کر اور رو کر کاٹنا ہی پڑتا ہے۔ دنیا کے سامنے ہنس کر اور اپنے خاص حقیقی، محبوب حقیقی، مالک کے سامنے رو کر بھی، دعا کر کے بھی کبھی شکر کر کے بھی مگر کٹتی تو نہیں ہے نا۔

کیوں نہیں کٹتی جب تم ہمت کرلو۔ جب تم پختہ ارادہ کرلو تو کٹ ہی جاتی ہے۔

ہاں کٹ جاتی ہے مگر کس طرح؟

اسی طرح۔ میری ہم زاد! اسی طرح جیسے اب کٹ رہی ہے!

سر! اب کٹ رہی ہے؟ اس طرح تو اس سے بہتر تھا کہ خدا کے پاس جانے کی اجازت اس نے دی ہوتی۔ ایک دن کھڑے ایک دن پڑے۔ ایک دن روتے ایک دن ہنستے، کبھی دماغ کو سمجھاتے۔ کبھی دل کو، کبھی دکھ دینے والوں کی شکایت خدا سے کر کے، رو رو کر اور کبھی ان ہی کے لیے دعا اور عافیت کی آرزو کر کے۔ کبھی اس کا غم کر کے کہ کسی کو پروا نہیں اور کبھی یہ سوچ کر کہ دنیا میں ہم سے کہیں زیادہ تنہا، بیمار اور غم زدہ لوگ ہیں!

ہاں۔ تو پھر۔ یہ بات تو تو خود جانتی ہے۔ پھر یہ دل کو جلانا اور کڑھانا کیا؟

جانتی تو ہوں۔ مگر بعض وقت دل بے قابو ہو جاتا ہے۔ زبان کو بہت قابو میں کرلیا ہے مگر پھر بھی جس زبان کو ستر برس سے بکنے کا مرض ہو اور جس کو ۶۰۔۶۵ برس سے اپنا کہنا منوانے، ہر ایک سے عزت اور محبت پانے کی عادت ہو وہ تکلیف دہ باتیں، تکلیف دہ حالات، اپنی ذلت کیسے......

ذلت اور تمھاری؟؟

ہاں میری۔ مجھ سے تو کوئی بدزبانی اور بدتمیزی کرے، سوال جواب، طنز وطعن کرے۔ وہ ذلت ہی لگتی ہے!

نہیں، یہ غلط ہے۔ اگر تم اپنے کیے سے مطمئن ہو، تم کسی کی ذلت نہیں کرتی ہو بلکہ دوسروں کی عزت کرتی ہو تو تمھاری ذلت ہو ہی نہیں سکتی!

مگر تم خود بھی تو آپے سے باہر ہو جاتی ہو!

میں کب......؟

جی کل رات بھر تمھیں کھانسی آئی، سردی لگی۔ تمھیں کوئی پانی دینے والا نہ تھا۔ صبح تمھیں ہارلکس دیر تک نہ ملا۔ تم نے آوازیں دیں۔ گھنٹی بجائی۔ کسی نے نہ سنی۔ خود اٹھیں ہارلکس بنائی اور چلائیں کہ میں کھانستے کھانستے، پکارتے پکارتے مری جا رہی ہوں اور کوئی نہیں سنتا۔ سنتا کون؟ ایک بوڑھا آدمی، ایک خاتون، کوئی ادھر کوئی اُدھر۔ اور وہ تو قلعہ ہے۔ وہاں جوانوں کی، تندرستوں کی آواز نہیں پہنچتی، تمھاری کیوں پہنچے گی۔

مگر کیا مجھے اتنا بھی اختیار نہیں کہ رات بھر تڑپ کر صبح کو کسی سے ہلکی سی شکایت کر دوں۔ چلو وہ ان کو ہلکی نہ لگی مگر مجھ پر جو گزری وہ تو مجھے اس سے بہت بھاری پڑی تھی۔

پھر؟ نتیجہ!

وہی جو ہوتا ہے۔ الٹا الزام۔ صفائیاں جن میں قصور میرا۔

کون نہیں ہے، سب ہیں۔ چاہنے والے، خدمت کرنے والے! اور کیا چاہتی ہو؟

کیا چاہتی ہوں۔ کچھ نہیں چاہتی۔

نہیں کوئی کانٹا تو کھٹک رہا ہے نہ دل میں!

ہاں چاہتی ہوں کہ کوئی میری ماں ہوتی (اس عمر میں) جو مجھے کلیجے سے لگا کر اس حال میں تسلی دیتی۔ علاج، مشورے، نصیحت، فضیحت کرتی مگر اپنا احسان نہ جتاتی! کوئی میری اولاد

ہوتی (سعادت منداور بامحبت) تو اپنا فرض سمجھتی کہ جب ماں پر مصیبت پڑے غم کی یا بیماری کی یا معذوری کی تو یہ اس کا فرض ہے۔ خدا کا حکم ہے کہ وہ خدمت کرے محبت کرے (کتنے کرتے ہیں بھلا)۔ میرا شوہر ہوتا جس نے پینتالیس برس میری خدمت اور محبت کی انتہا کردی (میں نے بھی تو کی) مگر وہ بھی تو چھوڑ گیا۔ اوراب یہ جدائی کے زخم کے ساتھ ساتھ تنہائی اور بے اعتنائی کا کرب بھی جھیل رہی ہوں۔

مگراب اس عمر میں نہ تو تمھاری ماں زندہ ہوکر آسکتی ہیں، نہ شوہر۔ اولاد نہ ہونے کی محرومی کوتو تم صدیوں سے قبول کر چکی ہومگر کبھی تمھیں تسلی نہیں ہوئی۔ کیا گارنٹی ہے کہ اولاد ہوتی اور وہ تمھارے پاس ہوتی، خدمت کرتی اور یہی سب نہ ہوتا جس پرتم جلتی اور کڑھتی ہو۔

جانتی ہوں، سمجھتی ہوں، اپنے کو سمجھاتی ہوں۔ خدا سے توبہ کرتی ہوں۔ دعا کرتی ہوں۔ مگر جب کوئی نیا دورہ کسی کو پڑتا تو پھر نئے سرے سے اس کرب میں مبتلا ہوجاتی ہوں۔

اچھا چھوڑو۔ جب تم اپنا غصہ تھوک دیتی ہوتو پھر......

پھر کیا......

تم نے نہیں دیکھا۔ اکیلی ڈاکٹر کے گئی۔ حال بتایا۔ دوالی اور اکیلی نذیر بھیا کو لے کر ٹیکسی میں گھر آئی اور معمولات میں مبتلا ہوگئی۔ نہانا دھونا، دوسرے کام شدید آندھی کے نتائج اور پھی اس کے کام......

کھانسی۔ دمہ کا پیش خیمہ۔ اس کی بدل۔ خدا قاسم کی دوا سے فائدہ کرے۔

صبح سے دوپہر تک لڑکیاں رہیں۔ دوپہر کو آرام کر کے جلسے میں چلی گئیں۔ اب اس پر کڑھوں نہیں کہ صبح سے دس بیس منٹ بھی مجھے نہ ملے۔

کیوں کیوں ملیں؟ اول تو تم خود ڈرنے لگی ہو۔ بات کرتے گھبراتی ہو۔ وہ لوگ بھی گھبراتے ہوں گے۔ ہے نا یہی بات؟

ہاں بات تو یہی ہے۔ پھر کروں کیا۔ دن بھر کام کرتی ہوں۔ شام کو باہر بیٹھ کر دماغ کو

سکون دیتی ہوں۔ پھر عبادت کرتی ہوں، تسبیح پڑھتی ہوں۔ بس میں اکثر ٹی۔وی کی آواز میں خلل ڈالتی ہیں۔اس سے جلوں نا؟

نہ جلو۔خدارا تمھاری مجبوری کو دیکھا ہے معاف کرو۔شاید۔

....

اچھا۔پھر، پھر آج تم نے یہ ہمت کیسے کرلی۔ یہی سب سوچ کر تو تم نماز کے وقت اٹھیں۔ضروریات سے فارغ ہوکر تم نے تلاوت کی باہر بیٹھ کر، دعا پڑھی، ہارلکس بنالیا۔ایک ہزار قدم ٹہلیں باغ میں۔ کمرے میں آکر کام کیے۔نجو کے لیے کتابیں بندھوائیں۔ پونے آٹھ تک تم نے دس کام کرلیے تھے۔ورزش بھی۔ہاں یہ سب کیا اور خوش تھی کہ کیا مگر نتیجہ!

بھوک لگی تھی۔ چائے کو کہہ دیا۔مگر معلوم ہوا قبل از وقت کہا تھا۔

ابھی تو گیارہ بجے ہیں۔ پہاڑ سا دن سامنے ہے۔

بس اس پہاڑ سے دن کو کشمیر یا سوئٹزرلینڈ بنانا تمھارا کام ہے۔

میرا! اس بنجر صحرا کوان کانٹوں پر رہ کر جہاں پاؤں چھلنی ہو چکے ہیں۔

ہاں تمھارا۔تمھاری زندگی میں کوئی گل نہیں گلزار نہیں۔

ہاں نہیں!

....

اور یہ جو کل بزم دانش وراں چھپ کر آ گیا ہے کون سی کتاب ہے؟ کتنی اچھی چھپی ہے۔ اس سے خوشی نہیں ہوئی۔

یہ جو ہر طرف سے خط آرہے ہیں مضامین کے لیے یہ طمانیت نہیں۔

کتاب خیر۔وہ تو میری زندگی اس کے سہارے ہیں مگر پیارے بھائی مرحوم پر مضمون لکھنا۔ہائے۔اے میرے ہم زاد تو اُسے خوشی کہتا ہے!

خوشی نہیں شغل تو ہے۔جب بھی کوئی اچھا مضمون لکھو تو کیا خوشی نہیں ہوتی؟

ضرور ہوگی۔اب دماغ کو ان چھوٹی الجھوں سے دور کردے۔

....

آوازیں بند ہوگئیں۔ بھابی جان اب بہت لکھ چکیں۔ختم کیجیے، تھک جائیں گی۔اچھا میری بہن[1]۔ تیرا حکم سر آنکھوں پر۔

۲۴/جون

دوپہر جیسے تیسے گزری۔نماز عصر کے بعد سخت گرمی تھی۔مگر وقت کاٹنا تھا۔روکر نہیں۔بیٹھ کر باچھو پر مضمون لکھنا شروع کیا اور ڈیڑھ گھنٹے بے مقصد لکھتی رہی۔ہاں سب وہی چیزیں ہیں جن میں خود کو کھپا دینا چاہتی ہوں اور کہانی ہو تو خوشی دیتی ہے۔ایک سے ذہنی دوسری سے روحانی!

اور شام جیسے تیسے کٹ گئی۔بچوں کے ساتھ بچوں کی ماؤں کے ساتھ۔

گوہر کی فکر میں۔ببلو کی چنتا میں، تدبیریں سوچنے میں۔رات بھی کٹ ہی جائے گی۔

۲۷/جون

رعنا تو چلی گئیں۔حسن عابد صفیہ آگئے۔گھر میں رونق ہوگئی۔

رات جالب پہنچ گئے۔آئے تو بچارے تعزیت کو ہیں مگر میں نے کہلوایا تھا کہ گوہر کو یا تو لے جائیں ورنہ میں بھیج دوں۔مگر ان کے بچے نہ مانے اور وہ غالباً اُسے لینے آہی گئے۔شاید کل جائیں۔

معلوم ہوا پرویز[1] بہتر ہے۔خدا کا شکر واحسان ہے۔خدا اس کی ماں پر، بیگم قیصر پر اور خود شمع اور پرویز پر رحم کرے۔آمین

---

[1] انیس بانو

۲۸/جون

آج طبیعت خراب رہی۔ رات بھر کھانسی نے بے چین رکھا۔ صبح نہ ادا نماز ہوئی نہ ٹہلنا نہ تلاوت! یہ بیماریاں اور بے خوابیاں ساری کوششوں پر پانی پھیر دیتی ہیں۔ البتہ آج رات کھانسی کے دورے اٹھے۔ بہت پڑے مگر پھر کچھ سدھر گئی۔ اور نماز کے وقت پانچ بجے جاگ گئی اور خدا کے فضل سے ادا نماز، شکر کی نماز اور پھر تلاوت۔ اس کے بعد پندرہ منٹ چہل قدمی۔ کچھ دوائیں لیں اور پھر لیٹ گئی۔ نیند تو تین چار گھنٹے وہ بھی قسطوں میں آتی ہے۔ بہر حال لیٹی رہی اگرچہ سو نہ سکی۔

جالب آم لائے تھے۔ ڈر کے مارے نہ کھائے۔ اقبال نے ناصر مہدی کے ساتھ آم بھیجے ہیں۔ مجھے تو قسمت نے سب نعمتوں سے کم سے کم بہت سی نعمتوں سے محروم ہی کر دیا ہے۔ دس منٹ زبان کے مزے کے لیے بیماری کا فوری حملہ۔ کون یہ قیمت چکائے۔ کھانا بھی بس برائے نام جیسا بھی مل جائے! کبھی غنیمت ہے مل جاتا ہے۔ صغرا لاکھ کوشش کرے مگر اول تو چیزیں گنتی کی، پھر نمک مرچ مسالہ نہ ہو اور تیل برائے نام۔ بہر حال اس کا شکر کیا کم ہے کہ مل جاتا ہے کھانا۔

رات عینک ٹوٹ گئی۔ آج صفیہ بنوانے لے گئی ہے۔ اب جو بھی ہو میں تو نہیں جا سکتی۔

بزم اکبر کا نیا ایڈیشن۔ سو برس بعد۔ اردو اکیڈمی دلی نے شائع کیا۔ اچھا شائع کیا ہے۔ بمشکل رات ختم کیا۔ بچوں وغیرہ کے ہنگاموں کی وجہ سے پڑھ نہیں سکی۔ پرسوں رعنا کے شدید اصرار پر وی۔سی۔آر فلم کا کیسٹ آیا ''اچھی اماں'' کے لیے۔ اول تو کیسٹ پرانا، کہانی جہاں آرا اور پھر گیارہ بجے سے جو میری طبیعت خراب ہوئی تو رات تک خراب رہی۔ ہر وقت تو ہارٹ کا درد رہتا ہے۔ اسپتال کا خوف رہتا ہے۔ بہر حال میں نے صبر اور خاموشی سے برداشت کر لیا۔ شام کو عاصمہ نے آ کر اطمینان دلایا۔ شکر کیا۔

---

[1] ڈاکٹر پرویز احمد

۵/ جولائی

نغمہ غالباً چلی گئی لکھنؤ۔ میاں نہیں گیا۔ فون کرنے سے پتا چلا کہ خدانخواستہ شبو کی خطرناک حالت نہیں ہے۔ اب خدا جانے۔

آج باچھو کی چالیسویں کی مجلس ہے بمبئی میں۔ پرسوں فارمل کارڈ آیا تھا۔ ویسا ہی فارمل جواب دے دیا۔

۹/ جولائی

شبو خدا کے فضل سے بچ گئی۔ اگرچہ ابھی اسپتال میں ہے۔ اقبال نے جان لڑا دی۔ اس کے بچے نغمہ اور شاہد اور خود میاں بھی گئے ہیں۔ نغمہ ابھی وہیں ہے اور لوگ شاید آگئے۔ یہ تین چار دن سولی میں کٹے۔ خدا نے اس کی جان اور اقبال کی محبت اور عزت بچالی۔ ورنہ سب یہ کہتے کہ وہاں بلا کر بیمار ڈال دیا۔ اب بھی شاید کہیں گے۔

کسی کام میں دل نہیں۔ بس نماز کی ٹکریں اور تھوڑی تلاوت اور دعائیں پڑھ لیتی ہوں۔

کل کسی طرح دل پر جبر کر کے مہدی نظمی صاحب پر ایک مختصر سا مضمون لکھا ہے۔ سخت فرمائش تھی۔ دیکھیں ان لوگوں کو پسند آتا ہے یا نہیں۔

بارش کا مہینہ ہے۔ چند بوندیں پڑ کر اُمس اور بڑھ گئی۔ رات جیسے بھی کٹتی ہے۔ دن جیسے بھی گزرتا ہے۔ بس اکیلا چلا چل اکیلا چلا چل۔

مگر نہیں ہم اکیلے کہاں ہوتے ہیں۔ خدا ہمارا ساتھی ہوتا ہے! مسلمان کبھی اکیلا نہیں ہوتا۔

ملک کی حالت خراب ہے۔ فساد دروازے پر آپہنچے۔ دور دور تو تھے میرٹھ کو تو کتنا تباہ کردیا۔ اب دلی اور جامع مسجد میں تھا ہی۔ کالکا جی تک فوج اور ہنگامے ہیں۔ اُدھر ''آتنک

وادی‘‘ نئی اصطلاح ہے،ہم بھی معنی نہیں جانتے سوا اس کے کہ اس کا ترجمہ خونخوار وحشی درندہ ہی ہوسکتا ہے۔ دو دن میں تین بسوں کے سیکڑوں بے گناہ بچوں، عورتوں، مردوں کو گولی سے اڑا دیا یا زخمی کر دیا۔

یو پی کی حکومت بے کار، پنجاب میں بے بس فوج ہیں، صدر کی حکومت بھی اور کرتا دھرتا بھی اب ہریانہ بھی لپیٹ میں آ گیا ہے۔

مگر............

مجھے تو اپنے خدا پر بھروسہ ہے۔ یہ نہیں کہ جی نہیں گھبراتا، دل نہیں تڑپتا معصوموں کے لیے۔ پریشانی نہیں ہوتی مگر خوف تو سوا خدا کے اور کسی کا مسلمان مومن کو ہونا ہی نہیں چاہیے۔

جو وہ چاہے گا، جو قسمت میں ہوگا وہی ہوگا۔

لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون ۔خدا اسی پر قائم رکھے۔اور اب اس ظالم دنیا سے جلد اپنے دامنِ رحمت میں بلا لے آمین۔

خدایا!

خدایا۔اب کون آئے گا۔خاتم النبیین رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم تو آخری نبی تھے مگر اس کے نام کے ماننے والے، اسلام کا دعوا کرنے والے بہت کچھ بھلا بیٹھے۔بس نام مسلمان رہے۔ مسجدیں بنتی چلی جائیں اور ہنگاموں، فسادوں، جھگڑوں فضول میں مرتے رہے۔ اخوت، مساوات، وحدتِ ادیان وہ بھلا بیٹھے تو دوسروں کو کیوں یاد آئے۔ وہ تو پہلے ہی سب بھول چکے تھے۔اب تو انھیں یاد یہ ہے کہ ان کروڑوں کو اس ملک سے نکالو اور ہزاروں برس پرانی تہذیب، پراچین کال، بت پرستی، اور سارے مظالم جو جہالت کے زمانے میں غریب انسانوں اور غلام فرقوں خاص کر عورتوں اور اچھوتوں، ملیچھوں پر توڑے جاتے رہے ہیں۔ وہ سب تازہ کریں اور ان کو اس ملک میں یا تو اچھوت بنا کر رکھیں یا ختم کر دیں۔کم سے کم باقی اور تہذیبی لحاظ سے۔مگر مولا! یہ تیرے سادہ دل بندے کہاں جائیں۔اب وہ زمانہ نہیں، ہجرت

کر نہیں سکتے۔ اتنا حوصلہ ہے نہ استقامت۔ نہ اتنا صبر اور برداشت اور جفاکشی پھر دنیا کا کوئی ملک دس کروڑ کو کیا دس ہزار کو بھی نہیں۔ پناہ نہیں دیتا۔ کہیں دودھ شہد کی نہیں۔ اس سے کہیں زیادہ قیمتی چیزیں سمندر میں غرق کردی جاتی ہیں۔ سونے اور چاندی کے کالے پہاڑ گھروں اور بنکوں میں دفن ہیں۔ میں دوسرے ملکوں کا ذکر نہیں کرسکتی، خود اپنے ملک میں ہزاروں لاکھوں گھروں میں عیش و آرام کی ہر چیز ہے۔ ایک ایک قسم کی دس دس چیزیں موجود ہیں۔ محلات ہیں کہ بن رہے ہیں۔ بدیسوں کے سفر اور سیر پر کروڑوں روپے خرچ ہو رہے ہیں۔ دوسری طرف کروڑوں انسان اس جاڑے گرمی برسات میں بغیر اپنی جھونپڑی کے فٹ پاتھوں پر پڑے ہیں۔ دعوا یہ ہے کہ غریبی دور کریں گے اور غریبی دور ہو رہی ہے۔ تقریبات پر عمارات پر، آسمان کی بلندیوں پر چڑھتے ہیں۔ جنگ کی تیاریوں پر اور اپنے عیش و آرام اور بے ایمانیوں پر۔

ہر طرف آتنک وادی (کیا اصطلاح ہوا) ہزاروں بے گناہوں کو مار رہے ہیں اور فوج پولس حکومت کچھ ان کا نہیں بگاڑ رہی۔ دوسری طرف پولس اور آزاد فوج ہندو مسلمان کے مختلف شہروں میں مسلمانوں کو ختم کر رہے ہیں۔ ان کے کاروبار کو تباہ، ان کے گھروں کو مسمار، ان کے بچوں کو شہید اور ان کی عورتوں کو ذلیل کر رہے ہیں۔

۲۰/ جولائی

سر۔ آپ سے باتیں کب سے نہیں کیں۔ بیماری، کام۔ پریشانیاں۔

تین دن طبیعت خراب رہی۔ عجیب و غریب قسم کی تکلیف، سینے میں گلے میں گلے کی نالی میں۔ دو راتیں بہت تکلیف میں گزری۔ کل ڈاکٹر ماتھر کو دکھایا۔ انھوں نے کچھ دوائیں اور دیں۔ کل رات تکلیف کم رہی۔ نیند بھی آئی۔ آج صبح دو گھنٹے کے لیے ہماری پرانی دوست تشریف لے آئیں۔ وقت ضائع۔ تکان اور کام جو کرنے تھے رہ گئے۔ بہر حال اس وقت کچھ کتابوں کا کام کیا۔ کتنا کچھ کرنا ہے مرنے سے پہلے۔ کتابوں کی ترتیب و تقسیم۔ روپے کی تقسیم

کی کوشش اور جن کو دینا ہے (مستحق) ان کے نام پر لفافوں پر لکھنا۔ تصویریں، کپڑے، کاغذات، مسودہ اور مدد کرنے والا کوئی نہیں۔

اُدھر عابد حسین میموریل ٹرسٹ کے ساتھ جو جو ہوا اور ہو رہا ہے، کیا بتاؤں؟ بہر حال مدد دینے والا کوئی نہیں۔ پرانے لوگوں نے طوطا چشم ہونے کا ثبوت دیا۔ زیدی صاحب بہت کمزور حقیقت اور بھولکڑ اور سب سے زیادہ یہ کہ سماعت سے تقریباً محروم۔ حکیم صاحب نے تو کبھی دلچسپی لی ہی نہیں تھی۔ میری حالت یہ ہے کہ بھول بڑھ گئی ہے، صحت بگڑ گئی ہے۔ پھر حساب کتاب اور اس قسم کے مسائل جو جانتی تھی وہ بھی بھول گئی۔ ایک صغرا ہے اور سو کام ہے۔ ہر ایک دوسرے پر اپنا کام ٹال دیتا ہے۔ اور آپ کا اور میرا کام تو کسی کے کرنے کا ہو گویا اس کا فرض ہے۔ نتیجہ یہ کہ اعصاب خراب۔ بعض وقت کھسیا کر رونے لگتی ہے۔ بعض وقت گھبرا کر کام سے یا کبھی ملنے باہر چلی جاتی ہے تو میری تنہائی۔ کیا کروں؟ اس کے بغیر چین بھی تو نہیں آتا اور اس کی باتوں پر بعض وقت غصہ بھی آتا ہے۔ کنٹرول وہ بھی کرنے کی کوشش کرتی ہے اور میں تو دن رات کرتی ہوں۔ دعا کرتی ہوں۔ خدا کا شکر کل شبو تندرست ہو کر لکھنؤ سے آ گئی۔ آج صغرا اس سے ملنے گئی ہے۔ میں نے دعائیں منت مانی، خدا نے پوری کی۔ شکر ہے اسی کا۔ کل اس کے بیٹے کے لیے چند جوڑے بھیجے۔ خدا کرے مل جائیں۔

نذیر بھیا اور انیس علی گڑھ گئے تھے۔ شکر ہے آج خیریت سے واپس آ گئے۔ میری طبیعت آج بہتر ہے۔ مگر کے دن؟ کے گھنٹے۔ اس وقت کاموں اور الجھنوں میں ہوں مگر چند صفحے لکھ نہ لوں تو چین نہیں پڑتا ہے۔

سب چیزوں سے سکون اٹھ گیا۔ مگر تین چیزیں اول خدا کی یاد اور کوئی چھوٹی عبادت، دوسرے آپ کی یاد اور محبت اور تیسرے لکھنے کا شوق!

اور باقی ساری دنیا کی محبت بھی۔ درد بھی۔

آدھا ملک تپ رہا ہے۔ دلی میں آگ برس رہی ہے۔ بس دعا کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔

۲۲/جولائی

دلی میں جھگڑے۔ میرٹھ میں فسادات جاری۔ سارے ہندستان میں ایک سلسلہ فسادوں اور جھگڑوں کا۔ حکومت میں انتشار اور ردوبدل؟ اچھی؟ بری؟ خدا جانے۔

سخت گرمی۔ ساون گزر رہا ہے۔ بارش کا نام نہیں۔ سوکھا خدانخواستہ ڈکلیر کر رہے ہیں۔ یہ کہ دلی اور اس کے آس پاس زیادہ خطرہ ہے۔ شاید۔ شاید کیوں؟ واقعتاً ہمارے اعمال تو ہیں خدا کے غضب کے مستحق مگر اس کے رحم و کرم سے مایوس کافر ہوتا ہے، منکر ہوتا ہے۔ اس کا سچا مسلمان ایمان دار بندہ نہیں ہوتا ہے۔ یا پھر شاکر ہوتا ہے، صابر ہوتا ہے۔ پُرامید بندہ ہوتا ہے۔ دعا کرتا ہے اور قبولیت اور نا قبولیت اس پر چھوڑ دیتا ہے۔

اس کی رحمت سے مایوس؟؟ خدانہ کرے، خدانہ کرے۔

اللہ رحم کر بچوں پر، مریضوں پر، بوڑھوں پر، بے گھروں پر، غریبوں پر، کسانوں پر، غریب مزدوروں پر اور ان سب کے طفیل ہم جیسے پر بارانِ رحمت بھیج دے۔ گرمی کم کر دے۔ تو اسمع السامعین بھی ہے اور ارحم الراحمین بھی۔

۲۳/اگست

الٰہی! تو کارساز و نگہبان ہے۔ آج صغرا کو ہولی فیملی میں داخل کر دیا۔ دعاؤں، نمازوں اور تیرے پر اعتماد اور بھروسہ پر کھڑی ہوں۔

گھر بھر اس کے لیے بے چین ہے۔ باری باری سب جا رہے ہیں۔ اب یہ رات ہے۔ صبح آپریشن ہے۔ ساتھ خیریت کے ہو اور نتیجہ اچھا نکلے۔

۲۴ر اگست

صبح بہت سویرے صغرا کے پاس گئی۔ (۹ بجے) ابھی آئی ہوں۔ نہایت خراب انتظام ہو گیا ہے ہولی فیملی کا۔ بدتمیز نرسیں، گندے بستر، انتہائی گندے باتھ روم، بہتا پانی۔ ساری رات صغرا کو جاگتے اور کوفت میں مبتلا گزری۔ یہ وہی ہولی فیملی ہے جو دل کا بہترین اسپتال سمجھا جاتا تھا۔ نرسوں سے ملی۔ جھگڑی، کس کس مشکل سے کمرہ بدلوانے کی درخواست کی۔ میرے سامنے ہی کملیش اور نرمل پہنچ گئیں۔ بہر حال کمرہ بدلنے کا آپریشن کے بعد وعدہ ہے۔ اس وقت تو مجھے آنا تھا کیونکہ ایک آدمی سے زیادہ کمبخت بیٹھنے نہیں دیتے۔ سواری کی مشکل۔ گھر کا کام۔ کھانا پکانے کا سارا انتظام جو تقریباً تین ہفتے سے میں نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ اب گھر آ گئی ہوں۔ دوپہر تک حال معلوم ہوگا۔

آپریشن بخیر و خوبی ہو گیا۔ متعدد لوگ جاتے رہے۔ نرمل شام تک رہی۔ ایسی دوست کہاں ملتی ہے۔ اب کل صبح آ جائے گی انشاءاللہ۔

۱۸ر ستمبر

کام اس کو سونپ دو حالیؔ
نہیں جس کا کوئی شریک و سہیم
ہے وہ مالک ڈبوئے یا ترائے
چارہ یاں کیا ہے بجز عجز و نیاز

مالک دل میں ایسی ہی طاقت، ایسا ہی بھروسہ، ایسی ہی اعتماد دے جیسے میرے بزرگ محترم نے فرمایا ہے۔ وہ ولی اللہ قسم کے آدمی تھے اور دل سے جو بات نکلتی تھی سچی اور حقیقی۔ توفیق دے کہ ان کی پرنواسی کا دل بھی ان جیسا کم سے کم ان سے ملتا جلتا ہو جائے۔

۲۰؍اکتوبر

کل شام غالب اکیڈمی میں ''شام صالحہ عابد حسین'' اردو اکیڈمی کی طرف سے ہوگیا۔ ذہن پر سے بہت بوجھ اترا۔ اول تو یہ فکر تھی کہ ٹھیک رہوں گی یا نہیں کہ پرسوں سے موسم بدل گیا اور گھٹنوں میں درد وغیرہ شروع ہوگیا۔ پھر یہ فکر کہ خدا جانے وہاں کون کون بولے گا اور کیا کہے گا۔ (ستم یہ کہ کل دوپہر حمیدہ سلطان مع اپنی دو بہنوں کے آگئیں۔ غالب اکیڈمی یعنی حکیم صاحب سے خفا ہیں) اور ساری دوپہر باتوں اور ہنسی مذاق میں کسی طرح ہم نے کاٹ دی۔

جلسہ بہت اچھا ہوا۔ غیر معمولی اچھا۔ میرے تو دور دور تک ذہن میں نہیں تھا کہ میری شخصیت اور سیرت اور اخلاق وغیرہ وغیرہ کے بارے میں جو کہا جائے گا یا کہا جا رہا ہے وہ سچ ہے۔ صحیح ہے۔ وہ ہی ہوں نا میں جس کو روز جینا اور مرنا پڑتا ہے۔ شاید قصور میرا ہی ہے کہ میں برداشت کی بہت سی طاقت کھو چکی ہوں۔ مزاج تو ہمیشہ سے ذرا تیز تھا مگر اپنے آپ پر بہت کچھ قابو تھا مگر جس کے لیے تھا وہ اب دنیا میں کہاں ہے اور اپنے سے چھوٹوں کی باتیں، نہیں خدایا۔ برداشت نہیں ہوتی ہیں۔ مگر اکثر کرتی ہوں۔ اگرچہ وہاں ہر مضمون کے بعد دعائیں ملیں کہ ''یہ ہمیشہ ادب اور قلم کی حکومت کرتی رہیں'' خدا نہ کرے۔ بس جتنی زندگی تیرے حکم سے باقی ہے اسی کو کارآمد بنائے، کسی کا محتاج نہ کرے اور میرے ہاتھ پاؤں قلم اور ذہن تندرست۔

جلسے میں بہت زیادہ لوگ نہ تھے۔ خاص کر یونیورسٹیوں کے قابل فاضل، عالم، خودستا، خودپرست لوگ ایک ناچیز سے ادیبہ جس نے شہرت، دولت، نام آوری اور خودنمائی کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس کو بقول لوگوں کے کیا خراج عقیدت پیش کرنا۔ خاندان کے تو سبھی لوگ تھے۔ صغرا سے لے کر نذیر بھیا اور چھادی تک۔ ساڑھے تین گھنٹے لوگ صبر و خوشدلی سے سنتے رہے۔ شریف کی مختصر مگر جامع تقریر۔ نارنگ کی عقیدت اور محبت سے بھرپور اور سب سے بڑی

تقریر، سمینار بھی تو اُن کا ہی تھا۔حق بھی تھا ان کا۔اس کے علاوہ صغرا میری شخصیت پر اچھا بُرا اس سے زیادہ کون سمجھتا۔مگر اس نے تو اچھا ہی اچھا کہا۔ذکیہ کی اپنے خاندان کے بارے میں بہت جذباتی اور محبت بھری تقریر۔ظفر پیامی کی تقریر اچھی خاصی تھی اور طویل بھی۔دوسرے صاحب نے تو بس ٹالا تھا۔زیدی صاحب کی مختصر اور محبت وخلوص سے بھرپور،عزیز کی بہت ہی محبت اور عقیدت اور تعریفوں سے پُر جن میں سے اکثر خوش فہمی تھی۔میرا اپنا مختصر سا تعارف جو سوا صغرا کے سب نے پسند کیا۔محلے والے بھی کافی آگئے تھے اور پانچ چھ جامعہ والے۔دو تین نہرو اور دلی یونیورسٹی والے۔باقی چاہنے والے اور قدر کرنے والے۔بچارے بیگ صاحب ہمیں جانتے تھے نہ ہماری کتابوں کو۔مگر اتنا سن لیا تھا کہ کچھ نہ کچھ۔وہ بھی اچھا ہی اچھا کہہ گئے اور آخر میں (سنی سنائی باتوں پر) جینیس کا خطاب دے گئے فاعتبروا یا اولی الابصار۔ کہاں میں کہاں جینیس۔ایک معمولی پڑھی لکھی،معمولی مذہبی انسان جس کو ادب سے،اردو سے اور قلم سے عشق تھا اور رہے گا۔باقی جو ذاتی چیزیں ہیں وہ تو وہی ہیں اور ان کا قدر کرنے والا میرا مالک ہے۔ساڑھے نو بجے گھر واپس آئی۔تھک کر چور۔عزیز بچارے کے پاؤں میں تکلیف اور زیدی صاحب بے حد تھک گئے اور شریف صاحب کے تو پاؤں میں ورم ہے ہی۔ رہے بیگ صاحب بوڑھے آدمی۔تکلیف تو ضرور ہوئی ہوگی مگر ظاہر نہیں کیا۔سب کو گلدستے ملے اور ناچیز کو ایک سفید قیمتی مگر بہت بڑی شال۔

خدا نہ کرے کہ میں کبھی لکھنے پڑھنے سے معذور ہوں یا ان خوبیوں سے جن کا لوگ بکھان کرر ہے تھے۔

خدایا! میں سوا تیرا شکر ادا کرنے کے اور کیا کرسکتی ہوں۔میرے غم گسار اور دوست میرے بارے میں جو رائے رکھتے ہیں وہ مرتے دم تک قائم رہیں اور تیرے دامنِ رحمت میں جگہ ملے۔

۲۱/اکتوبر

عابد صاحب کبھی کبھی کہا کرتے تھے دیکھیے گا، دیکھیے گا ایک دن آپ کی پوری قدر ہوگی۔ پوری ادھوری تو میں نہیں جانتی۔ مگر اتنا جانتی ہوں کہ اب لوگوں کو پتا چل گیا ہے احساس ہوگیا ہے کہ یہ بھی لکھتی ہے۔ اچھا لکھتی ہے اور عورتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ لکھتی ہے۔ سوچ ہے اس کے لکھنے میں۔ مگر یہ ڈائری۔ یہ تو رطب و یابس، رنج و غصہ، دکھ اور غم، دل کا درد اور کوفت۔ تیری اور تیرے چند پیارے بندوں کی محبت کا آئینہ ہے۔

۲۲/اکتوبر

آج صبح سویرے صغرا، سیدہ، عاشی کشمیر گئیں۔ صغرا کو لکچر دینے بلایا ہے اور سیدہ کو دو ہفتے کے لیے وہاں پڑھانے کے لیے۔ سردی وہاں سخت ہے۔ اس کی پریشانی ہے۔ خدا ان تینوں کو اچھا رکھے اور خیریت سے واپس لائے۔ صغرا کئی وقت کا کھانا پکا گئی۔ تھوڑی بگڑتی، تھکتی، کام کرتی ہلکا کر رکھ گئی ہے۔ وہ ہوتی ہے تو یہ حال اور چلی جاتی ہے تو دل سونا، گھر سونا، دنیا سونی ہو جاتی ہے۔ میری ہی نہیں سب کی بھی۔

کل اور پرسوں کئی لوگوں کے آنے کی خبر ہے۔ رعنا اور بچے، نجو اور بچے، چھادی اور بچی۔ اور شاید گوہر اس کے میاں اور ماں اچھے رہے تو چار چھے دن کے لیے وہ بھی آئے اور خدا کرے خوش خرم واپس جائے۔

۵/نومبر

معلوم ہوا عینی کو اقبال ایوارڈ مل گیا۔ خدا مبارک کرے اور اردو کا ہر ایوارڈ ان کو ملے اور وہ واقعی اس کی اہل ثابت ہوں۔

وہ بہت قابل ہے، ذہین ہے۔ باہر کے ملکوں میں بھی بہت پسند کی جاتی ہے۔ انگریزی کی فلم کی، ڈراما کی، سنتی ہوں بہت اکسپرٹ ہے۔ مگر اردو میں اس کا کام کتنا اور کیسا ہے یہ رائیں لوگوں کی مختلف ہیں۔

مجھے اس کی محبت ہے، قدر ہے۔ وہ مجھے پسند ہے۔ خدا اس کے درجے اور بلند کرے اور اسے آفات ارضی وسماوی سے محفوظ رکھے۔

۱۵۔۱۶/ دسمبر

پرسوں سے تاباں صاحب کی بیوی سخت بیمار ہیں۔ بے ہوشی، بدحواسی نہ جانے کیا مرض ہے۔ تشخیص نہیں ہو رہا۔ سارا خاندان پریشان مگر کوئی کیا کرسکتا ہے۔

ڈاکٹر اپنی سی کوششوں میں ہیں مگر محتاج و مجبور ہو کر زندہ رہیں تو بہت بڑی ٹریجڈی ہوگی۔

کل رفعت سروش کی بیوی اچانک ہارٹ اٹیک سے ختم ہوگئی۔ عمر بھی تو صرف ۵۲ برس کی تھی۔ مگر ہم زندہ ہیں۔ مولا! تیری مصلحت، تیرا حکم، راضی برضا رہنے کی ہدایت۔ ہم کر کیا سکتے ہیں۔ زندگی ہے تو بہر حال بسر بھی ہوگی۔ رات آئی ہے تو اس سب کی سحر بھی ہوگی۔

۳۰/ دسمبر

کتنے دن گزر گئے۔ سال کل ختم ہو جائے گا اور نیا سال شروع۔ یہ سال تو کیا کیا آزمائشیں، بیماریاں، دکھ اور پریشانیاں نہیں لایا۔ تین موتیں، کتنے حادثات، ہندستان پر، دنیا پر کیا کچھ نہ گزر گئی اور پھر سوکھا، قحط، حد سے زیادہ مہنگائی۔ نہ گھر میں سکون نہ باہر اطمینان۔ خدایا! اگلا سال دنیا کے لیے، ہندستان کے لیے، دلّی کے لیے، خود ہماری بستی کے لیے، ہمارے خاندان اور دوستوں کے لیے مبارک ہو۔ ان سب کو آفاتِ ارضی اور سماوی سے محفوظ رکھے۔ امن وچین رہے۔ جنگیں لڑائیاں بند ہوں۔ بیماریوں کی کثرت اور خوفناک بیماریوں

سے لوگوں کو محفوظ رکھنا۔

پچھلے ایک ہفتے سے لکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ گھر ماشاءاللہ خاندان والوں سے بھرا ہوا تھا۔ اقبال مع بیوی بچوں کے آیا ہوا تھا۔ وہ تو گیا، بچے بیوی ابھی ہیں۔ شبو وغیرہ اس سے ملنے آئے۔ رعنا اپنے بچوں سمیت۔ نجو اپنی بچی اور نند کے ساتھ اور پھر سب کے ملنے والے۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ ماشاءاللہ پندرہ آدمیوں کا چار وقت کھانا ناشتہ اور سب انتظامات۔ صغرا اور صفیہ کی تو چولیں ہل گئیں۔ میں زیادہ کچھ کرنے کے قابل کہاں۔ مگر اپنے کاموں میں (کاغذات اور خطوط کی تلاش، جو خدا جانے کہاں غائب ہوگئے) دو تین گھنٹے مصروف رہتی۔ نکّو نے مدد بھی کی مگر میرے عابد حسین کے اور چند میری دوستوں کے خطوط (جو کئی بنڈل تھے) خدا جانے کہاں کھو گئے کہ پورا گھر، ہر الماری، ہر بکس جس میں کاغذات تھے صندوقچے، دراز تک تلاش کر ڈالیں مگر نہ ملنا تھا نہ ملے۔ اور اس کے بعد دوسرے چھوٹے موٹے کام اسی میں دوپہر سے شام ہو جاتی اور تھوڑی بہت عبادت کے بعد شام سے طبیعت خراب ہو جاتی۔

زندگی میں خوشی کے لمحے بھی آتے ہیں۔ چاہنے والے بھی ہیں جو خدا واسطے چاہتے ہیں۔ ساڑھے دس بجے عذرا کا بفلو سے فون آیا۔ میرا خفگی نامہ اسے کراچی میں ملا اور بفلو پہنچتے ہی اس نے فون کیا۔ کوئی خفگی اور ناراضگی (خواہ وہ نقلی تھی یا وقتی) پر اتنا خوش ہو سکتا ہے؟ اس قدر محبت اتنا پیار، اتنی تعریف، اپنے میاں کی طرف سے (خدا جانے سچ یا جھوٹ) اس قدر تعریف اور شکریہ اور ہر سانس پر یہ کہ آپ گرمیوں میں یہاں ضرور آیئے۔ کون بیٹی ماں کے لیے اتنا تڑپتی ہوگی۔ جتنا وہ میرے لیے تڑپتی اور میرے لیے جو دور رہ کر کر سکتی ہے، کرتی ہے۔ اور ہر سانس پر یہ کہ میں ہندستان صرف آپ کے لیے آتی ہوں اور دوسروں کے ساتھ جو وقت گزرا اس سے مجھے ذرا خوشی نہیں ہوتی اور پھر یہ ''امی'' اور ''بھیا'' ہی مجھے اس طرح ڈانٹ سکتے ہیں جس طرح آپ نے ڈانٹا۔ اس سے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتی۔ وغیرہ وغیرہ۔ آدھ گھنٹے تک باتیں کرتی رہی۔ میاں کی طرف سے یہ پیام کہ کہو کہ میں زندگی بھر آپ کا غلام رہوں گا۔

''بھئی کیوں؟''

''آپ نے شادی جو کرائی۔''

''اوروں کی بھی تو شادیاں کرائی ہیں۔ وہ تو بجائے غلام کے آقا بن جاتے ہیں۔''

''مگر یہ تو زندگی بھر غلام رہیں گے۔'' اور شعر پڑھتی رہی۔

۳۱ر دسمبر

مطابق نو جمادی الاول چودہ سو آٹھ ہجری

یہ سال بھی ختم ہو گیا۔ گویا اب اس سال اگر خدانخواستہ زندہ رہی (اور خدا کرے کہ ہاتھ پاؤں، دل دماغ کی سلامتی کے ساتھ زندگی کے باقی دن گزرے) تو عیسوی حساب سے چوہتر سال کی ہو جاؤں گی۔ ستر سے بھی چار سال زیادہ۔

یا پروردگار! یہ تیرا کیسا کرشمہ ہے کہ جو بیس سال کی عمر میں اس قدر شدید بیمار ہوئی، جو پانچ سال موت اور زیست کی کشمکش میں دونوں سے لڑتی رہی وہ چون برس بعد تک زندہ ہے اور کتنی بیماریاں، ایک سے ایک شدید اور جان لیوا نہ ہوتی رہیں۔ اور پھر تندرست یا نیم تندرست۔ ہو جاتی اور پھر اگلی بیماری سے لڑنے کے لیے بچ جاتی۔ اب نہ سب بیماریوں کے نام یاد نہ موت یاد نہ وہ تکلیفیں اور کرب یاد جوان پچاس سال میں سہارے۔ اگر دس پانچ موٹی موٹی بیماریاں (یادیں) بھی ذہن میں رہ گئیں تو سننے والوں کے ایک طرف کرب، دوسری طرف عبرت، تیسری طرف مریض کے دل یا در، قوت مدافعت، زندہ رہنے اور چلتے ہاتھ پاؤں، زندہ رہنے کی شدید خواہش حیرت ناک بھی ہوگی اور عبرت ناک بھی۔ سبق آموز بھی اور خدا پر بے پناہ عقیدہ اور اس کی بے پناہ عنایتوں کا اعتراف بھی ہے۔

اب یادداشت بہت کمزور ہو گئی ہے۔ پھر بھی اتنا تو یاد ہے کہ دس پندرہ سے کم مضمون، مقالے، کہانیاں نہ لکھی ہوں گی۔ دو کتابیں مکمل ایڈٹ کیں۔ ایک چھپ گئی۔ ایک چھپ رہی ہے۔ دو چار کتابیں اصلاح کی یا نظر ثانی۔ اور سب سے بڑا کام یہ کہ اکیلے ہی جیسے تیسے۔ خدا

بخش لائبریری کے لیے خطوط، مسودے اور کتابیں تلاش کیں، جمع کیں۔ مگر اب بھی پریشان ہوں کہ بہت اہم خطوط یعنی خود میرے، عابد صاحب کے اور چند میرے دوستوں کے غائب ہیں۔ کہیں نہیں مل رہے۔ ان کی تلاش میں طبیعت خراب کرلی۔ تھکان حد سے زیادہ ہوجاتی تھی۔ مگر یہ کام میرے بعد کون کرے گا اور ابھی تو سیکڑوں تصویریں باقی ہیں۔

آنکھ کمزور ہوتی جارہی ہے اور مطالعہ کم۔ تلاوت وغیرہ کے علاوہ اخباروں کی سرخیاں یا خاص مضمون یا کبھی کوئی رسالہ یا دلچسپ ناول۔ حالانکہ جس کی عادت آدھی آدھی رات تک پڑھنے کی ہو۔ انگریزی کی تو اب پڑھ ہی نہیں سکتی اور اردو بھی اب اتنی باریک چھپنے لگی ہے۔ بس دعا یہ ہے کہ اتنی روشنی مرتے دم تک باقی رہے۔ باقی اس کی رضا۔

اس سال اور ہر سالوں سے زیادہ خیرات کی۔ کچھ خدا نے رزق میں وسعت دی۔ کچھ دل میں اور زیادہ۔ کچھ گاؤں کا معاوضہ ملا۔ کچھ ضرورت مند ملے۔ خواہش تو یہ تھی (بلکہ ہے) کہ مرنے سے پہلے جتنا بھی ہے سب دے جاؤں مگر اب خاندان میں تو ضرورت مند خدا کے فضل سے ہیں نہیں اور جو ہیں وہ دور ہیں اور ان کو احتیاط سے بھیجنا پڑتا ہے یا بھوپال والے ضرورت مند ان سے لوگ بے ایمانی کردیتے ہیں اور یوں تو دن رات اصل اور نقل مانگنے والے آتے ہی رہتے ہیں۔ خدا بس یہ توفیق دے کہ کسی ضرورت مند کو مایوس نہ کروں۔ اور زیادہ سے زیادہ مدد کرسکوں۔ اگرچہ لوگ تانے ہی دیتے ہیں کہ تم عادتیں بگاڑتی ہو۔

خدا جانے۔

افوہ جب سے لکھنے بیٹھی ہوں ہر ممکن رکاوٹ۔ قیصر، نرس، سیدہ، صغرا، انیس، حسن عابد، فون اور پرسان حال بی بیاں اور وقت! ہوگیا۔ دیکھیں آج مکمل ہوتا ہے یہ صفحہ آخر یا نہیں۔

(نوٹ: یہ صفحہ مکمل نہ ہوسکا اور ۸/ جنوری ۱۹۸۸ء کو انھوں نے آنکھیں موند لیں۔)

☆☆☆

ISBN 93-82997-06-7
9789382997061